اقبالیات

رموزِ بیخودی کی اشاعت کے سو سال پر خصوصی نمبر

شمارہ نمبر ۱،۳	جنوری- جولائی ۲۰۱۸ء	جلد نمبر ۵۹

اقبال اکادمی پاکستان

مقالات کے مندرجات کی ذمہ داری مقالہ نگار حضرات پر ہے۔ مقالہ نگار کی رائے اقبال اکادمی پاکستان کی رائے تصور نہ کی جائے۔

یہ رسالہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم و فنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انھیں دلچسپی تھی، مثلاً: اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، ادب، آثاریات وغیرہ۔

سالانہ: دوشمارے اقبالیات (جنوری، جولائی)　　دوشمارے *Iqbal Review* (اپریل، اکتوبر)
ISSN: 0021-0773

بدل اشتراک

پاکستان (مع محصول ڈاک)	فی شمارہ: -/۱۵۰ روپے	سالانہ: -/۶۰۰ روپے
بیرون پاکستان (مع محصول ڈاک)	فی شمارہ: ۱۶ امریکی ڈالر	سالانہ: ۲۰ امریکی ڈالر

☆☆☆

تمام مقالات اس پتے پر بھجوائیں

اقبال اکادمی پاکستان

(حکومتِ پاکستان)
چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: [+92-42] 3631-4510
[+92-42] 9920-3573
Fax: [+92-42] 3631-4496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

مندرجات

۞—۞—۞

دیباچہ رموزِ بیخودی

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعیینِ عمل و ذوق، حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشو ونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل واقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِنظر رکھ کر مَیں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہیّت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔

اُستاذی حضرت قبلہ مولانا مولوی سیّد میر حسن صاحب دام فیضہم پروفیسر مری کالج سیالکوٹ اور مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن خلداللہ ملکہ و اجلالہ میرے شکریے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں بزرگوں سے بعض اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق قابلِ قدر مشورہ ملا۔ علیٰ ہذا

القیاس اپنے احباب میر نیرنگ، میرزا اعجاز اور مولانا عمادی کا بھی سپاس گذار ہوں کہ بعض مطالب کی تحقیق میں ان سے بھی مدد ملی۔

❁ ❁ ❁

رموزِ بیخودی پر ایک انتقادی نظر

سید سلیمان ندوی

مدت سے ارادہ تھا کہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر ایک انتقادی نظر ڈالی جائے لیکن کثرت مشاغل اور قلت فرصت نے موقع نہ دیا۔ ابھی اُن کی ایک مثنوی رموزِ بیخودی موصول ہوئی ہے۔ اس تقریب سے اب خیالات کے عرض کا کسی قدر موقع مل گیا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا پبلک آغاز مخزن لاہور کے ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ رسالہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء کے قریب قریب نکلنا شروع ہوا تھا۔[۱] اس لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کی پبلک شاعری کی عمر تقریباً ۱۶ برس ہے اور اس عرصے میں اُن کی متعدد چھوٹی بڑی نظمیں شائع ہوئیں جن میں سے اکثر کی اہلِ معنی نے داد دی اور بعض پر اہلِ ظاہر نے گرفت کی۔

ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفرین واقع ہوئی ہے۔ کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے اُنھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں بھی نظمیں لکھیں، لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے بلکہ اُن کی حیثیت ایک عام اُردو شاعر کے خیالات موزوں کی رہ گئی۔[۲]

کائنات کے اسرار و حقائق کی تعلیم و تلقین کے لیے ہمیشہ سے چار راستے رہے ہیں: مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری۔ مذہب کی اصلی حیثیت ایک قانون اور فرمانِ شاہی کی ہے۔ اس کی پیروی اس لیے چاہیے کہ یہ خداوندِ عالم کا حکم اور فرمان ہے اور بندوں کو اس کی تسلیم سے چارہ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مصلحت اور حکمت پر بھی مبنی ہے۔ فلسفہ اپنی بنیاد دلائل اور براہین پر قائم کرتا ہے اور وہ انسان کی عقل اور دماغ کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تصوف انسان کے ذوقِ باطن اور لذّتِ وجدانی کو اپنا رہبر بناتا ہے اور شاعری مخاطب کے انسانی، قومی، اخلاقی اور مذہبی جذبات کے سہارے کھڑی ہوتی ہے۔

سچ بولنا انسانیت کا اصلی جوہر ہے لیکن یہ کہنا کہ سچ بولو کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ ہمیشہ سچ بولا کرو، یہ مذہب کی زبان ہے۔ سچ بولو، کیونکہ سچائی سے انسان کی عزت برقرار اور جماعت پر اس کا اعتماد قائم ہوتا ہے،

فلسفے کی بولی ہے۔ اور سچ بولو کہ سچائی سے دل میں ایک خاص قسم کی لذتِ نورانی حاصل ہوتی ہے، تصوف کی تعلیم ہے۔ اور سچ بولا کرو کہ تم اس قوم کے فرزند ہو جس نے صداقت اور راستی پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں، سچ بولو کہ فطرت ہمیشہ سچ بولتی ہے۔ پھول کی خوشبو کبھی ارادی غلطی سے اپنے کو بدو نہیں کہتی، روشنی اپنے آپ کو کبھی تاریکی نہیں کہہ سکتی، یہ دونوں شاعری کے محاورے ہیں۔[۳]

یہ مختلف راستے ہمیشہ سے الگ الگ تھے لیکن سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چند صدیوں کے بعد اسرائیلی پیغمبروں میں مذہب اور شاعری کی مخلوط راہیں نظر آتی ہیں۔ حضرتِ داودؑ کی مزامیر، حضرت سلیمانؑ کی غزلوں اور اخیر زمانے کے عبرانی پیغمبروں کے الہامی کلاموں میں، اور سب سے زیادہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مواعظ میں، مذہب اور شاعری دوش بدوش مصرفِ کارفرمائی ہیں۔

اسلام میں عربوں کا عنصر جب تک غالب رہا، یہ طریقے باہم مزج نہیں ہوئے۔ عجمیت کے اثر نے جو نتائج پیدا کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ تعلیم و تلقین کے یہ مختلف اُسلوب ایک صف میں آ کر انسان کو ہر راستے سے متاثر کرنے لگے۔ پہلے یہ تھا کہ انسان اپنے ذوق اور مناسبتِ طبع کی بنا پر اُن میں سے ایک راستے کو اپنے لیے انتخاب کر لیتا تھا لیکن عجم کے صوفیوں نے دیکھا کہ اس طریقے سے بہت کم تعداد ہماری گرفت میں آتی ہے۔ اُنھوں نے چاروں کو ملا کر ایک کر دیا تاکہ ہر مخاطب انسان ان میں سے کسی ایک پر ضرور ہے کہ سر ڈال دے گا۔

ہمارے خیال میں حکیم سنائیؒ پہلے شخص ہیں جو اس طریقۂ خاص کے موجد ہیں اور اس کے بعد مولانائے روم کے عہد میں یہ فن عروجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ مولوی رومی نے اپنے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یک جا کر دیے۔ اور چونکہ وقت کی چیز تھی اس لیے اہلِ معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی اور اب بھی وہ مقبول ہے اور ایک حد تک اُس نے ملک و قوم کو فائدہ پہنچایا ہے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ چوتھی صدی سے لے کر دسویں صدی تک شعرائے باطن نے ہم کو جو کچھ سمجھایا، قرآن پاک اور حدیثِ قدسی کی جو کچھ تفسیریں اُنھوں نے کیں، ہمارے حاکمانہ غیظ و غضب، فاتحانہ جوش و خروش اور مجاہدانہ زور و قوت کو اعتدال پر لانے کے لیے وہ ضروری تھا۔

لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہمارے مشتعل قویٰ سرد ہو گئے ہیں، ہمارے خون کی گرمی محکومانہ برودت سے بدل گئی ہے اور ہمارے قویٰ میں مفتوحانہ ضعف آ گیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اُسی پُرانے نسخے کا استعمال جاری رہا تو بُرد اطراف کے بعد شاید وہ بُرِ دِقلب کا باعث ہو جائے، اس لیے ضرورت تھی کہ ہمارے اہلِ دل شعرا مثنوی مولوی روم کا دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کر دیں۔

شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کے لیے چُن لیا۔ اُنھوں نے اس مقصد

کو پیشِ نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں: اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی۔ پہلی مثنوی میری نظر سے نہیں گزری، البتہ رداً اور اعتراضاً اس کے بعض بعض ٹکڑے اخبارات میں دیکھے۔ اس سفر میں مجھے محمد علی کی زبان سے اُس کے متعدد ابواب سننے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے اس ذوق اور وجد کے ساتھ اس کے اشعار سنائے کہ میں سراپا اثر ہو گیا۔ شاعر نے جو کچھ کہا تھا اُس کو ایک بہتر مفسّر کی زبان سے سن کر خود بخود اُس کے اسرار و حکم کے عقدے وا ہونے لگے۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی ہے۔ یہ مثنوی چھوٹی تقطیع کے ۱۳۹ صفحوں میں عمدہ کاغذ پر اہتمام کے ساتھ چھپی ہے۔ زبان فارسی اختیار کر گئی ہے اور یہ شاید اس لیے تا کہ فوائد ہندوستان کی دیواروں تک محدود نہ رہیں، بلکہ دُنیا کی وہ تمام آبادی، جس کی حیاتِ ملی کو اس میں خطاب کیا گیا ہے، اُس کو سمجھ سکے۔

زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو اُن شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس لغزشِ مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں۔ مصرعوں کے درو بست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اُترے۔ شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفے، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں اور اس لیے اختلافِ مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔

زیرِ تقریظ مثنوی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرارِ خودی سے بہتر ہے۔[۵] اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہرِ سیاست بیشتر اور اُس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزلِ مقصود ایک ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، حکمائے ملت ان میں مسلمانوں کے مزاجِ قومی کی تشخیص نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے وہ صرف تین شخص ہیں؛ مولانا شبلی نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلام نے مجلدات الہلال میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی ان دو مثنویوں میں۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں۔

رموزِ بیخودی ہے جس کا اصل مقصود ''ملتِ اسلامیہ کے اسرارِ حیات کی تشریح'' ہے، حسبِ ذیل عنوانوں پر منقسم ہے۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کی راہِ ترقی کے حسبِ ذیل منازل ہیں:

(۱) افراد اور قوم میں باہمی نسبت۔

(۲) قومیت کی پیدائش، افراد کی اجتماعی کیفیت سے ہوتی ہے اور اجتماعی کیفیت صرف نبوت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے اور یہی یقین منتشر افراد کو ایک سلسلے میں منسلک کر دیتا ہے۔

(۳) ملت اسلامی کے اساسی ارکان میں سے پہلا رکن توحید ہے اور توحید کے معنی ہیں ایک ذاتِ برتر کے آگے اپنے کو ہیچ اور بے مقدار جان کر تمام دُنیا سے بےخوف اور نڈر ہو جانا۔

(۴) جس طرح ایک فرد کے لیے آخری لمحہ حیات وہ ہے جب وہ اپنے وجود سے مایوس اور نا اُمید ہو جائے، اسی طرح قوموں کی زندگی کے خاتمے کا دن وہ ہے جب وہ اپنی قومی زندگی سے نا اُمید اور مایوس ہو جائیں۔ مسلمانوں کی قوم میں آج جو افسردہ دلی اور موت سے نظر آتی ہے وہ اسی طرح کے حزن و ملال اور یاس کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو یہ چیزیں اپنے دل سے صاف نکال دینی چاہیں اور اس میں کامیابی صرف تکمیل ایمان سے ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید کی آیتِ مبارکہ لا تقنطوا من رحمة الله[۶] اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی لیے لا تخف ولا تحزن[۷] اور مسلمانوں کی لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۵) ملت کا دوسرا رکنِ اساسی اقرارِ رسالت ہے اور بغیر اس کے، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے، قومیت کا شیرازہ نہیں بندھتا۔

اس کے بعد شاعر نے نہایت عمدہ پیرایہ قصص و حکایت میں حسبِ ذیل امور کی تشریح کی ہے:

۱- حکایتِ بوعبیدہ و جاپان در معنیٰ اخوتِ اسلامیہ۔

۲- حکایتِ سلطان مراد و معمار در معنیٰ مساواتِ اسلامیہ۔

۳- در معنیٰ حریتِ اسلامیہ و سرِ حادثۂ کربلا۔

۴- در معنیٰ اینکہ چوں ملتِ محمدیہ مؤسس بر توحید و رسالت است، پس نہایتِ مکانی ندارد (یعنی اس کی جغرافی تحدید نہیں ہوسکتی بلکہ تمام دُنیا اس میں شامل ہوسکتی ہے)۔

۵- در معنیٰ اینکہ ملتِ محمدیہ نہایتِ زمانی ہم ندارد کہ دوامِ ایں ملتِ شریفہ موعود است (اس کے یقین سے مسلمانوں کا حزن و یاس دور ہوگا)۔

۶- در معنیٰ اینکہ نظامِ ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملتِ محمدیہ قرآن است۔

۷- در معنیٰ اینکہ پختگیٔ سیرتِ ملیہ از اتباعِ آئینِ الٰہیہ است۔

۸- در معنیٰ اینکہ حسنِ سیرتِ ملیہ از تادب باداب محمدیہ است۔

۹- در معنیٰ اینکہ حیاتِ ملیہ مرکز محسوس می خواھد و مرکزِ محسوس ملتِ اسلامیہ بیت الحرام است۔

۱۰- در معنیٰ اینکہ جمعیتِ حقیقت از محکم گرفتنِ نصف العینِ ملیہ است، و نصب العینِ اُمتِ محمدیہ

حفظ ونشرِ توحید است۔

۱۱- در معنیٰ اینکہ توسیع حیاتِ ملیہ از تسخیر قوائے نظامِ عالم است۔

۱۲- در معنیٰ اینکہ کمالِ حیات ملیہ این است کہ ملت مثلِ فرد احساسِ خودی پیدا کند و تکمیلِ ایں احساس از ضبطِ روایاتِ ملیہ ممکن گردد۔

۱۳- در معنیٰ اینکہ بقائے نوع از اُمومت است وحفظ واحترامِ امومت اصلِ اسلام است۔

۱۴- در معنیٰ اینکہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ اسوۂ کاملہ است برائے نسائے اسلام۔

۱۵- خلاصہ مطالبِ مثنوی در تفسیر سورۂ اخلاص۔

شاعر نے ان مطالبِ پانزدہ گانہ میں سے ہر ایک کو واقعات، حکایات اور آیاتِ قرآن اور حدیث سے محکم کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیتیں نہایت خوبی سے اس انگشتری کا نگینہ بنتی چلی گئی ہیں۔ جہاں تک ہمارے مطالعے نے کام دیا ہے، احادیث میں دفعہ ۱۴ کے علاوہ اور تمام واقعات صحیح ماخذوں سے لیے گئے ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی ابیات، جن کا عنوان ''پیش کش بحضورِ ملتِ اسلامیہ'' ہے، یہ ہیں:

اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایتام کرد
اے مثالِ انبیاء پاکانِ تو
ہمگرِ دلہا، جگر چاکانِ تو
اے بعشقِ دیگراں دل باختہ
جلوہ ہائے خویش را نشناختہ
اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو
اے تماشا گاہِ عالم روے تو
ہمچو موج آتشِ تہ پا میروی
تو کجا بہرِ تماشا می روی
اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
رمزِ سوز آموز از پروانہ
در شرر تعمیر کن کاشانہ

یہ مثنوی بھی ڈاکٹر اقبال کی دوسری نظموں کی طرح تعقیدِ لفظی اور معنوی سے بری نہیں ہے۔[8] تاہم بعض مقامات پر مسلسل اشعار اس قدر روان اور سلیس البیانی کے ساتھ مؤثر ہیں کہ بار باران اشعار کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔خوف و یاس کی بُرائی میں لکھتے ہیں:

از دمش میرد قوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی
خفتہ باغم در تہِ یک چادر است
غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است
ایک در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیمِ لا تحزن بگیر
ایں سبق، صدیق را صدیق کرد
سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد
گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو
دشمنت ترساں اگر بیند ترا
از خیابانت چو گل[9] چیند ترا
ضربِ تیغِ او قوی تر می فتد
ہم نگاہش مثلِ خنجر می فتد
بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما
ہر شر پنہاں کہ اندر قلبِ تست
اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زور و ریا پیراہنش
فتنہ را آغوشِ مادر دامنش
ہر کہ رمزِ مصطفیٰ[10] فہمیدہ است

شرک او را در خوف مضمر دیدہ است

اتباعِ شریعت کے باب میں لکھا:

اے کہ باشی حکمتِ دیں را امین
با تو گویم نکتۂ شرعِ مبین
چوں کسے گردد مزاحم بے سبب
بسا مسلماں در ادائے مستحب
مستحب را فرض گردانیدہ اند
زندگی را عینِ قدرت دیدہ اند
روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر
از خیالِ صلح گردد بے خطر
گیرد آساں روزگارِ خویش را
بشکند حصن و حصارِ خویش را
سرِ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست
زیستن اندر خطرھا زندگی ست
شرع می خواھد کہ چوں آئی بجنگ
شعلہ گردی، واشگافی کامِ سنگ
آزماید قوتِ بازوئے تو
می نہد الوند پیشِ روئے تو
باز گوید سرمہ ساز الوند را
از تفِ خنجر گداز الوند را
نیست میشِ ناتوانے لاغرے
درخورِ سر پنجۂ شیرِ نرے
باز چوں با صعوہ خوگر می شود
از شکارِ خود زبوں تر می شود
خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثلِ کوھسارت می کند

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی، آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

اسی طرح تمام بیان مسلسل، بلند تر اور پُر اثر ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے عالمگیر اور اکبر کی نسبت اپنا جو خیال ضمناً ظاہر کیا ہے، اب اکثر اربابِ فکر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں:

شاہ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبارِ دودمانِ گورگاں
پایہ اسلامیاں برتر ازو
احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو
درمیانِ کار زار کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید
شمعِ دل در سینہ ھا روشن نبود
ملتِ ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ھند عالمگیر را
آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را
برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمعِ دیں در محفلِ ما بر فروخت
کور ذوقاں داستاں ھا ساختند
وسعتِ ادراکِ او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود

چوں براہیمؑ اندریں بتخانہ بود

اسی طرح مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق، فلسفیانہ تشریح کے ساتھ، صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں۔

ایک بالغ نظر شخص اس مثنوی میں الفاظ کے صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال کی صحت میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کر سکتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ یہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال نے جو اسرار و نکات اس میں حل کیے ہیں، اُن کی بنا پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فنِ قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے۔ توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب اور قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُر اثر اور تشفی بخش دلائل اس کے اندر موجود ہیں۔

(معارف، اپریل ۱۹۱۸ء)

❁...❁...❁

حوالہ جات وحواشی

۱- مخزن (لاہور) کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء کو شائع ہوا۔

۲- یہ رائے دورِ آغاز کے کلام کے بارے میں ہے۔

۳- سیّد صاحب کے ایک دوست قاضی عبدالوحید صاحب نے اُن کے خیال کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

کیا چیز ہے شعر؟ سن لو گفتار ہے وہ
(قول)

کیا اصل ہے فلسفے کی؟ پندار ہے وہ
(علم)

مذہب کسے کہتے ہیں؟ تصوف کیا ہے؟
کردار اگر ہے یہ ، تو رفتار ہے وہ
(فعل قلب) (فعل جوارح)

۴- غزنی کے مشہور شاعر (روم ۱۱۳۱ء)۔ متعدد مثنویاں اُن سے یادگار ہیں جن میں ''حدیقہ'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔

۵- رموزِ بیخودی کی زبان کے لیے مکاتیب ملاحظہ ہوں۔

۶- زمر: ۵۳ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)۔

۷- عنکبوت: ۳۳ (نہ خوف کھا اور نہ ملال کر)۔

۸- ملاحظہ ہو 'مکاتیب اقبال بنام سید صاحب'۔

۹- اس تشبیہ میں کم از کم مجھ کو کلام ہے (س)۔

۱۰- شاید یہ فارسی محاورہ ہو۔ (س)

❁……❁……❁

مثنوی رموزِ بیخودی — تنقیدی نظر[1]

سر عبدالقادر

مثنوی رموزِ بیخودی یعنی ''اسرارِ حیات ملیہ اسلامیہ'' حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کے اہتمام سے یونین سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوئی۔ ابتدا میں علامہ سر محمد اقبال کا دو صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے اور چھوٹے سائز کے ۱۳۹ صفحات پر مشتمل متن۔ یہ کتاب پہلی بار چودہ سو کی تعداد میں چھپی۔ اس کا پہلا ایڈیشن پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

مثنویاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی لیکن یہ امتیاز شاید کسی کو حاصل ہو کہ ملک و قوم تک کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لیے مثنوی کو ذریعہ اظہار خیال بنایا جائے۔ خدا جزائے خیر دے شیخ محمد اقبال کو جنھوں نے اس زمانہ انحطاط میں ملت اسلامیہ کو مثنوی اسرارِ خودی کے ذریعے سے پیغام عمل دیا ہے اور ''رمزِ بےخودی'' میں مژدۂ حیات سنایا ہے۔

دنیا میں سب سے بڑی مثنوی غالباً مولانا روم (علیہ الرحمۃ) کی ہے جس کو اسلامی ممالک میں اکثر لوگ قرآن مجید کے بعد اعلیٰ درجے کی مذہبی کتاب سمجھتے ہیں اور ''قرآن در زبان پہلوی'' کا خطاب دیتے ہیں۔ اس کی زبان ایسی سلیس اور انداز بیان ایسا دل نشین ہے کہ خاص و عام میں مقبول ہے۔ یہ عالی شان مثنوی ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ اس کی کئی ضخیم جلدیں ہیں جن میں کلامِ الٰہی کے ضروری مسئلے جا بجا عام فہم پیرایے میں اور مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے لوگوں کو سمجھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد مذہب اسلام کی خدمت ہے۔ تصوف کا عنصر اس میں غالب ہے اور اس لیے یہ کتاب علما اور صوفیا دونوں میں مقبول ہے اور فلسفی بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں طرزِ مثنوی مولوی معنوں کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ان دو مختصر مثنویوں کا مولانا روم کی عظیم الشان کتاب سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ نسبت ضرور ہے کہ اقبال نے مثنوی شریف کی شیریں زبان اپنی مثنویوں کے لیے اختیار کی ہے

اور مثنوی کی مقبول بحر تبرکاً اپنے لیے انتخاب کی ہے۔ جناب مولانا علیہ الرحمۃ کا فیض معنوی سمجھیے کہ ان دونوں مثنویوں میں ایک خاص تاثیر موجود ہے۔ ذیل کے اشعار میں اسرارِ خودی کی تمہید میں اقبال نے خود اس فیض کا اعتراف کیا ہے:

این قدر نظارہ ام بے تاب شد
بال و پر شکست و آخر خواب شد
روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کہ بحرف پہلوی قرآں نوشت
گفت: ''اے دیوانہ ارباب عشق
جرعہ گیر از شراب ناب عشق
بر جگر ہنگامہ محشر بزن
شیشہ بر سر، دیدہ بر نشتر بزن
آشنائے لذت گفتار شو
اے درائے کارواں بیدار شو

''درائے کارواں'' یعنی اقبال نے بیدار ہو کر اس ارشاد کی تعمیل کی ہے۔ سوز و گداز خدا نے فطرت میں ودیعت کیا تھا، ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر پڑتے ہی وہ سوز و گداز نالہ نے کی طرح فریاد بن کر سینے سے نکلا اور پکارا کہ دنیا میں وہی افراد زندگی کا فرض کما حقہٗ ادا کرتے ہیں جو لذت عمل سے بہرہ یاب ہیں اور جو قوت عمل کھو بیٹھے یا محو خیال ہو بیٹھے ہوں ان کا شمار زندوں میں نہیں۔ اس ایک مضمون کو کئی پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے اور کئی تشبیہوں سے اور کئی مؤثر مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی کے لیے ایک بسیط ریویو جداگانہ درکار ہے جو پھر کبھی (اگر حالات مساعد ہوئے) لکھا جائے گا۔ اخبارات میں اس پر بہت لے دے ہو چکی ہے اور بہت کچھ اس کی تعریف میں لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت تو اس مثنوی کے دوسرے حصے سے بحث ہے جو حال میں شائع ہوا اور جس کا نام رموزِ بیخودی رکھا گیا ہے۔

اگر صرف دونوں مثنویوں کے ناموں کو سرسری طور پر دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ حضرت اقبال نے اضداد کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ نکتہ چینی زبان قلم سے بے اختیار نکلنے کو ہوتی ہے کہ پہلے تو ملت اسلامی کو پیغام دیا کہ اس کا ہر فرد خودداری سیکھے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جد و جہد زیست کے میدان میں مردانہ کارزار کے لیے تیار ہو اور پھر دوسری کتاب میں خود ہی خودی سے بیگانہ بن کر وہی بے خودی کا جادۂ فرسودہ اختیار کر لیا۔ لیکن جب رموزِ بیخودی کو غور سے پڑھیں تو یہ اعتراض رفع ہو جاتا

ہے۔اوّل تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے رموزِ بیخودی میں ان اُصول سے بالکل انحراف نہیں کیا جو اسرارِ خودی میں اُصول زندگی قرار دیے گئے تھے اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں افراد کے لیے خودی اور خودداری ذریعہ استواری ہے، وہی افراد کا اپنی ہستی، ہستی قومی میں محد کر دینا اور اپنی انفرادی زندگی کے جز کو قومی زندگی کی کل میں شامل کر دینا قومی ترقی کے لیے لازم ہے اور اس کو بے خودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔گویا یہ وہ بے خودی ہے جو خودداری اور خود شناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو فرد و قوم دونوں کے لیے عین نفع ہے۔اس مثنوی میں یہ مضمون کس خوبی سے ادا ہوتا ہے:

تو خودی از بے خودی نشاختی
خویش را اندر گماں انداختی
جوہر نوریست اندر خاک تو
یک شعاعش جلوۂ ادراک تو
خوگر پیکار پیہم دیدمش
ہم خودی ہم زندگی نامیدمش
چوں ز خلوت خویش را بیروں کشد[۲]
پائے در ہنگامہ جلوت نہد

———

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گل برگ چمن گردد خودی

یہ اُصول ذہن نشین کرتے ہوئے شاعر مطلب کی طرف آتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ ربط افراد افراد کا نام ہی ملت ہے اور افراد کی ہستی کے قیام کا مدار اسی ارتباط پر ہے اور اس دعوے کی زبردست دلیل نیچر کا مشاہدہ ہے:

مدعائے ما، مآل ما یکسیت
طرز و انداز خیال ما یکسیت
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

قومی زندگی کی بنیاد یک دلی پر رکھ کر قومی خیالات کی تدبیروں کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔ پہلے تنبیہ کی ہے کہ یاس و نا اُمیدی، قومی زندگی کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہیں۔ترقی چاہنے والی قوموں کو چاہیے کہ نا

اُمیدی کو پاس نہ آنے دیں، حوصلے بلند رکھیں اور سرگرم جستجو رہیں۔ نا اُمیدی عموماً خوف سے پیدا ہوتی ہے یا غم سے اس لیے خوف اور غم سے بھی الگ رہنا چاہیے۔ اس ہدایت پر عمل کی تاکید کرتے ہوئے مثنوی میں آیات و احکام قرآنی کے حوالے پیش کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے ڈرنا شان ایمان کے خلاف ہے، اور جب بیم غیر اللہ سے نجات ہو تو کوئی کام ایسے آدمی کے لیے دشوار نہیں ہوتا:

بیم چوں بند است اندر پاے ما
ورنہ صد سیل است در دریاے ما

اس سلسلے میں ایک حکایت اورنگ زیب عالم گیر کی درج کی ہے جس پر جنگ میں نماز پڑھنے کی حالت میں شیر نے حملہ کیا مگر بادشاہ اس سے نہ ڈرا اور بغیر تاک کر ضرب لگانے کے اس نے خنجر کا ایسا وار کیا کہ شیر ہلاک کر دیا اور پھر مصروف نماز ہو گیا۔ اس حکایت کو نظم کرتے ہوئے اورنگزیب کی خدمات مذہبی کی تعریف کی ہے اور اس ساری تعریف کی جان یہ شعر ہے جو عالم گیر کی شان میں کہا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے کی بلاغت خصوصاً قابلِ داد ہے:

درمیان کار زار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں

اس کے ملت اسلامی کو بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا باہمی رشتہ جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات بابرکت کی بدولت مضبوط ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما
کثرت ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملت شود

پھر ملت اسلامیہ کی خصوصیات چند پر معنی شعروں میں بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ حریت اور مساوات اس ملت کی سرشت میں داخل ہے۔ اسلامی مساوات کی تمثیل کے طور پر ایک درد انگیز تاریخی روایت نظم کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سلطان مراد نے ایک مسجد بنوائی تھی جو ملک خجند کے رہنے والے ایک پردیسی معمار نے بنائی تھی۔ بادشاہ کو اس کی عمارت کچھ ناپسند ہوئی اور اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس معمار نے قاضی کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف استغاثہ کیا۔ بادشاہ عدالت میں طلب کیا گیا۔ قاضی نے مقدمہ سننے کے بعد فتویٰ دیا کہ:

عبد مسلم کم تر از احرار نیست

خون شہ رنگیں تر از معمار نیست

یہ فتویٰ سن کر بادشاہ نے اپنا ہاتھ کاٹے جانے کے لیے پیش کیا:

چوں مراد ایں آیہ محکم شنید
دست خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند[۳]
آیہ بالعدل و الاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیٰؐ بخشیدمش

یعنی قانون نے ہاتھ کاٹنے کے عوض میں ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دے دیا مگر خود مستغیث کو رحم آ گیا اور اس نے بدلہ نہیں لیا اور بادشاہ کو معاف کر دیا۔ آگے چل کر میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے متعلق ایک پر درد باب لکھا ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت حریت کی بنیاد رکھنے کے لیے اور ضمیر انسانی کا حق آزادی قائم کرنے کے لیے تھی:

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

اقبال نے ایک باب ہجرت پر لکھا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس میں معنی آفرینی کی داد دی ہے۔ مقصود تو اس باب سے وہی ہے جو پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ ملت اسلام کی بنیاد مذہبی یگانگت پر ہے اور یہ کسی خاص ملک یا وطن کی پابند نہیں، مگر اس باب میں مصنف نے اپنے دعوے پر ایک زبردست دلیل ہجرت نبوی کے مسلمہ واقعے سے پیدا کی ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ جو مکہ شریف سے ہجرت کر کے مدینہ منور میں جا بسے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ فی الحقیقت دشمنوں سے عاجز آ کر بھاگ گئے تھے، بلکہ اس میں یہی حکمت چھپی تھی کہ اسلام کی عالم گیری کی بنیاد پڑے اور اسلام کے نام لیوا ہر جگہ اپنا وطن بنائیں اور وہاں نور اسلام پھیلائیں:

آں کہ در قرآن خدا او را ستود[۴]
آں کہ حفظ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش

لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است

اس کے مقابل میں ملت کی بنا وطن پر رکھنے کا جو خیال ہے اور جس کے خلاف دلائل چند اشعار میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ ان پر اس باب میں اقبال نے ایک اور دلیل اضافہ کی ہے اور وہ تمام انسانی اغراض کے لحاظ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف جغرافی قطعات میں سے ایک قطعہ بنائے ملت قرار پانے سے دنیا میں تنگ خیالی ایسی پھیلی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی ہے اور دنیا میں جنگ و جدال کی کثرت ہو گئی ہے۔ گہری فلسفیانہ نگاہ سے اگر دیکھیں تو عام بنی نوع انسان کو اس اُصول سے ضرور نقصان پہنچتا ہے، گو وہ محدود جماعتیں جو علیحدہ علیحدہ قومیں بنی ہوئی ہیں، اس اُصول کی بدولت جلد ترقی کر جائیں۔ ان خیالات کو نظم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است
تلخی پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام[۵] ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

اس مسئلے سے کہ ملت اسلامی حدود مکانی کی پابند نہیں، قدرتی طور پر حدود زمانی کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے اور اس کے متعلق شاعر نے ایک باب میں یہ بیان کیا ہے کہ ملت اسلامی کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

رومیاں را گرم بازاری نماند

آں جہاں گیری جہاں داری نماند
شیشہ ساسانیاں در خوں نشست
رونق خمخانہ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بودست و ہست
گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

اسلامیوں کو یہ بتانے کے بعد کہ ان کی ملت ان کے مذہب پر مبنی ہے اور اس کے دوام کا وعدہ ہو چکا ہے، ان کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب جبھی ہوگا کہ وہ اپنے آئین کے پابند ہوں جو ان کی آسمانی کتاب یعنی قرآن شریف میں مندرج ہے۔ اس باب میں قران شریف کی تعریف خوب اشعار میں کی گئی ہے جن میں سے صرف دو یہاں درج کیے جاتے ہیں:

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمین

آگے چل کر مسلمانوں کو شرع کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے:

ہست دین مصطفیٰؐ دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا
آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

اگر اس طرح باقی سب بابوں کا خلاصہ اس مختصر تبصرے میں درج کیا جائے تو شاید باعث طوالت ہوگا۔ شایقین اصل کتاب کو پڑھیں اور مستفید ہوں، مگر وہ تین بابوں کے خاص خاص اشعار کا ذکر کیے بغیر پھر بھی رہا نہیں جا سکتا۔ ان میں ایک تو وہ باب ہے جس میں علم تاریخ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ترقی قومی کے لیے تاریخ دانی لازم ہے۔ یہ مضمون کیسے خوب صورت سلیس لفظوں میں ادا ہوا ہے:

ربط ایام است ما را پیرہن
سوزنش حفظ روایات کہن

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہٖ
داستانے، قصہٗ افسانہٗ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشناے کار و مرد رہ کند

اس سے اگلا باب بھی توجہ کے قابل ہے۔اس میں عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ جتایا گیا ہے کہ اچھے بیٹوں، بیٹیوں کی ماں بننا بڑے فخر کی بات ہےاور نوع انسان کے صنف نازک کا یہ سب سے بڑا فرض ہے۔ جدید زمانے میں اس فرض کی طرف جو بےتوجہی کا میلان ہے وہ بہت نقصان دہ ہے۔ایک گنوار اور بدوضع لڑکی، جو کسی نیک اور کارآمد شخص کی ماں بنتی ہے، اس نازنین گل اندام سے بہتر ہے جو اپنے اس اہم فرض سے بے پروا ہو یا اس ذمے داری کی متحمل ہونے کے نا قابل۔اس پیغام کو تو حضرت اقبال سے انھی کے الفاظ میں سنیے:

آں دخ[6] رستاق[7] زادے جاہلے
پست بالائے، سطبرے[8] بد گلے[9]
نا تراشے، پرورش نادادہٗ
کم نگاہے، کم زبانے، شادہٗ
دل ز آلام اموت[10] کردہ خوں
گرد چشمش حلقہ ہائے نیل گوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمان غیور و حق پرست
ہستی ما محکم از آلام اوست
صبح ما عالم فروز از شام اوست

رسول عربیؐ کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرأؓ کا نام مبارک اس سلسلے میں مسلمان عورتوں کے لیے نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔وہ اپنی خوبیوں اور نیکی کے لحاظ سے رسول کریمؐ جیسے باپ کی پیاری بیٹی، حضرت علیؓ جیسے شوہر کی چہیتی بیوی اور حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ جیسے بیٹوں کی واجب التعظیم ماں بنیں اور اُنھوں نے اپنی زندگی میں مثال قائم کی کہ عورت ذات کس طرح اپنی زندگی کے ان تینوں مرحلوں پر اپنے فرائض کو ادا کرے کہ ساری ملت کے لیے بہتری کا باعث ہو۔حضرت فاطمۃ الزہرأؓ کی شان میں جو اشعار اقبال کے قلم سے نکلے ہیں وہ اس دلی ارادت کے ترجمان ہیں جو اقبال کو رسولؐ اور آل رسولؐ سے ہے اور

ان میں یہ دوشعر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ صفات کا ایک دریا ہے جو ایک ایک شعر کے کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ اہلِ نظر داد دیں گے اور جنھیں نہ معلوم ہو وہ صفحات تاریخ وسیر ملاحظہ کریں:

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامان نماز

آخری باب، جس میں مثنوی کے مطالب کا خلاصہ اور سورۂ "قل ھو اللّٰہ احد" کی تفسیر ہے، خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب کا خاتمہ عرض حال مصنف پر ہوتا ہے جو بارگاہِ رسالت مآبؐ میں کی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی موجودہ حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ راستے سے دور جا پڑے ہیں۔ ان کے ''شیخ''، ''برہمن'' سے زیادہ بت پرست ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے دماغوں میں بت چھوڑ مندر بھر گئے ہیں۔ جو صفات پہلے غیر مسلموں سے مخصوص تھیں وہ اُنھوں نے سیکھ لی ہیں۔ موت سے نہ ڈرنے کی بجائے ڈرنے لگے ہیں۔ عرب کی بجائے عجم کی تقلید میں مبتلا ہیں۔ دعا ہے کہ ان کو جو پیغام اس مثنوی کے ذریعے رہ حق کی طرف پھر آنے کے لیے دیا گیا ہے وہ بااثر ثابت ہو اور مقبول ہو۔

اخیر میں چند شعر شاعر نے اپنی ایک دلی آرزو کے اظہار میں لکھے ہیں اور ان میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان شعروں کا مزا اہلِ دل اور فدائیان نبیؐ لیں گے:

ہست شان رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانۂ
تا کجا زنجیریِ بت خانۂ
حیف چوں اور را سرآید روزگار
پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فردائے من

(ماہنامہ مخزن لاہور بابت ستمبر ۱۹۱۸ء)

مثنویات اقبال
(اسرار و رموز)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

مالک رام

مترجم کا نوٹ: جن لوگوں نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا دیباچہ دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ) جو علیحدہ کتابی صورت میں بھی بعنوان محاسن کلام غالب چھپ چکا ہے، پڑھا ہے، وہ اس سے موصوف کے عمق فکر اور پہنچائی خیال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے، جن سے علم و ادب اُردو کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ بدقسمتی سے اجل نے انہیں فرصت نہ دی کہ وہ کچھ مستقل خدمت زبان کر سکتے۔ اُنھوں نے سوائے چند مضامین کے کوئی اپنی زیادہ پائیدار یادگار نہیں چھوڑی، مگر جو تھوڑا بہت بھی ان کے قلم سے نکلا ہے، کافی ہے ہم اس سے اُن کے وسعت مطالعہ، وقت نظر اور اصابت رائے کی نسبت ایک صحیح رائے قائم کر سکیں۔

ایک برخود غلط ادیب کی رائے میں دیباچہ مذکور میں ''سوائے شرح اشعار کے اور جو کچھ ہے، سب واہی تباہی ہے۔'' یہ رائے اُردو کے ایک شاہکار مضمون کی نسبت ہے اور ہر شخص کا حق ہے کہ وہ کسی چیز کی نسبت جو رائے چاہے قائم کرے۔ مگر کیا اچھا ہو کہ تنقید اور رائے قائم کرنے سے پہلے جذبہ تنقیص و تفضیح دل سے نکال دیا جائے۔ پندار اور تفاخر کوئی اچھی چیز نہیں، اور جب کسی نقاد کے دل میں یہ چیزیں راہ پکڑ لیں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور رواروی میں ایسے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے جو کسی دوسری حالت میں غالباً وہ زبان پر نہ لائے گا۔

اگر ادیب ممدوح نے ذرا یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ مضمون لکھتے وقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی، تو شاید وہ اس فیصلے پر نہ پہنچتے۔ میرے نزدیک اس مضمون میں جو والہانہ جوش دکھایا گیا ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل، غالب سے پہلے اُردو زبان کا جو سرمایہ تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ ایسا پامال اور فرسودہ مضمون ہو چکا ہے کہ اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے ہمیں بتایا کہ

اُردو زبان میں ترقی کی کتنی صلاحیت ہے، اس میں وسعت کی کتنی گنجائش ہے، اور اس میں کیسے کیسے خیالات جدید اور مضامین عالیہ کا اظہار ممکن ہے۔ بجنوری مرحوم کے پیش نظر غالب بھی تھا اور اس کے پیشرو معاصرین بھی۔ انھیں حیرت ہوئی کہ اس آذر کدے میں یہ ابراہیم کیونکر ہوا؟ جواب ایک ہی تھا۔ جوہر صالح اور ذہانت خدا داد۔ اس امر نے ان کے دل پر غالب کے تفوق کو منقوش کر دیا اور اس کے ساتھ ہی قدرتی طور پر خوش اعتقادی کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مضمون میں مرحوم نے آئینہ غالب میں میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اپنا تخیل اتنا بلند اور علم اتنا وسیع تھا کہ لکھ تو وہ رہے تھے دیوان غالب پر تبصرہ لیکن جا بجا اپنی رُوح اور دماغ کے نقوش کی تعبیر دیوان غالب سے ڈھونڈ رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے مرغوبات کو غالب پر چسپاں کر دیا۔ لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون زیر بحث میں ایسے مبحث بھی آ گئے ہیں، جو نفس مضمون سے بے تعلق سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ واہی تباہی ہے۔ یقیناً اس میں بھی اتنا سامان بصیرت موجود ہے، کہ ہم اس سے غالب کی دھندلی تصویروں کو زیادہ اُجاگر کر سکتے ہیں اور غیر مما لک کے مصنفین کے ساتھ موازنہ کر کے ایک رائے (خواہ وہ کتنی ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو) قائم کر سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون بھی ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اسرارِ خودی سب سے اوّل بار ۱۹۱۶ء میں اور رموزِ بے خودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ مرحوم نے جب ہی یہ مضمون انگریزی رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ میں لکھا تھا۔ جب ایک ہی زبان کے خیالات دوسری زبان میں منتقل کیے جائیں تو وہ اپنی شگفتگی اور چستی کا اکثر حصہ کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے، میں نے لفظی ترجمہ سے احتراز کیا ہے مگر کہیں بھی اصل مضمون کی رُوح کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ نوٹ سارے کے سارے میں نے خود بڑھائے ہیں، اور کوشش کی ہے کہ متعلقہ اشعار درج کر دیے جائیں۔ لیکن پھر بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مضمون پر کے تمام اشعار دے دیئے گئے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ایک موضوع پر طرح طرح سے بحث کی گئی ہے۔ جگہ جگہ نئے نئے انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر تمام متعلقہ اشعار درج کرتا تو بلا مبالغہ دونوں مثنویاں ساتھ چھپ جاتیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ناظرین اسرار و رموز کا خود غائر مطالعہ کریں اور اُن کے مضامین کو سمجھنے کی سعی کریں۔ فقط،

مالک رام

جب نقد و تبصرہ کا موضوع کوئی زندہ مصنف ہو تو نقاد کے لیے لازم ہے کہ قدم پھونک پھونک کر اُٹھائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ مصنف اور نقاد کے درمیان کوئی رنگین پردہ حائل ہو جائے گا، یا قرب مکانی ہی

مصنف کے خط و خال کی تفاصیل کو دھندلا کر دے۔

ہندوستان کے اسلامی ادب میں رُوح ملائے اعلیٰ کی جانب صعود میرزا غالب کے زمانہ سے بدستور جاری ہے۔ غالب، حالی اور اقبال ایک مقدس اقالیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔ غالب نے اس سکون و جمود کا خاتمہ کر دیا ہے، جو انحطاط کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دیئے۔ مگر وہ کوئی غیر معقول مشکک نہیں تھا، جسے اپنے شک کی صحت پر بھی یقین نہ ہو۔ اس کا شک ایک چنگاری تھی، جس نے دُنیا میں آگ سی لگا دیں۔ دہلی کی سلطنت اس کی شاعری کی متحمل نہ ہوسکی اور اس کی ایک نگاہ نے اسے ملیا میٹ کر دیا۔

حالی نے جس کے خون میں شعرائے عرب کی سی گرمی تھی، دیکھا کہ دُنیا اپنے ظاہری حسن و نمائش کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس نظارہ نے اسے بہت متاثر کیا، مگر اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی۔ اس نے غم و یاس کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت کی مسرت کا احساس کیا اور اپنے اُستاد کی تاخت کردہ عمارت کے کھنڈرات پر ایک نئی دُنیا کی تعمیر ٹھانی، اور اسے اپنے سینہ میں نشو و نما دی۔ اُمید کی جھلک نے اسے نئی زندگی دی اور یوں تن مردہ میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔

اقبال کی شاعری اب یاس و قنوط کی زنجیروں سے آزاد ہوگئی ہے۔ اس نے اُس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے، اور نئی عمارت کو متفاؤلی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اس کا نام وعدہ و بشارت کا مترادف ہے۔ اس نے زمانہ حاضرہ کے غیر ملکی اثر پر قابو پا لیا ہے، جو فضائے ہند پر چھایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے اس اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے، جس کا منبع اور مبداء خالص اسلامی ہے۔ اس کی رُوحانی تعلیم نے اس انانیت کو فتح کر لیا ہے، جو اس مادّی دور کی پیداوار ہے۔ اقبال اسلامی کارواں کا سالار ہے جس کی منزل مقصود حرم محترم ہے۔

اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اور خود ہی جوان ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کی دونوں مثنویوں (اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی) سے پوری طرح نمایاں ہے۔ ان میں وہ زندگی ہے، وہ طاقت ہے جس کے لیے ہماری نئی نسل پُرانے غزل گو شعراء کے دواوین کو بے سود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا ہے، جس نے مردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے ہیں۔ زمانہ پر اس کے پیغام کی اہمیت رفتہ رفتہ واضح ہوگی، جو زمانہ حاضرہ کی ان دونوں معرکہ آراء نظموں میں پنہاں ہے۔

مثنویاں ایک ایسے غیر فانی کام کا جزو ہیں، جو تکمیل کے بعد اسلامی دُنیا کے خواب کی صحیح تعبیر ہوگا۔ اقبال نے نظریہ کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزل کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے عمل کی زندگی

کی بجائے افلاطونی بے عملی کو اختیار کر لیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ اور حافظ نے ان سے وہ احساس مسرت چھین لیا ہے، جو ''کچھ کر لو'' کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اور اس کی جگہ اس دماغی تفتیش نے لے لی ہے، جو ایک تن بیمار کا خاصہ ہے۔ مسلمانوں میں سنگ خارا کی سختی کی بجائے کوئلہ کی سی نرمی آ گئی ہے۔ خوف خدا کی جگہ مخلوق خدا کا خوف ان پر حاوی ہو گیا ہے۔[۱]

مگر زندگی کا ایک نصب العین بنانے سے سب خوف دور ہو جاتے ہیں۔ ترقی وعروج اسلام کے لیے خدا نے ودیعت کر رکھے ہیں۔ پس توحید الٰہی پر کامل اعتقاد ہمیشہ خوف کو زائل کرتا ہے[۲] اور دل میں وہ عزم صمیم پیدا کرتا ہے، جو اخلاق کا طغریٰ ہے۔ حکایت شیر وشہنشاہ عالمگیر[۳] اندر وقلس اور شیر کی کہانی[۴] نہیں ہے۔

اسلام کی رُوح مساوات کی رُوح نہیں ہے۔ بانیان سلطنت کا خون بانیان مکانات آب وگل سے زیادہ قیمتی نہیں۔ شریعت کے معتوب کے لیے کوئی پناہ نہیں اور جس کا محافظ قرآن کریم ہے، اسے خوف سے کوئی واسطہ نہیں۔[۵]

اقبال ایک محدود زمانہ کے اندر اسلامی نظام کو از سر نو حیات تازہ اور شباب بخشنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بعینہ جس طرح ایک مہوس مادۂ خام سے سونا نکال لیتا ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کا ہے مگر اس کی نظر مستقبل پر بھی ہے اور موجودہ زمانہ کا نکتہ چیں بھی ہے۔

ایمرسن[۶] افلاطون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہملٹ بالکل افلاطونی ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو افلاطون کے ہملٹ پن (تشائم پسندی) کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ اس تشائم پسندی اور اخلاقی ضعف نے کئی قوموں کو بلندی سے دے پٹکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس زمین پر رہیں اور یہاں کے ''سرکار'' کی نکوکاری پر توجہ دیں۔ افلاطون اس پرندۂ صبح کی مانند ہے، جو ایک اثیری دنیائے خواب وخیال میں پرواز پر قانع ہے۔ برخلاف اس کے اقبال ایک بحری عقاب کی طرح ہے، جو بحر حیات کی طوفان خیز موجوں پر سوار ہو۔ اقبال کا فلسفہ خودی اور عمل کا فلسفہ ہے۔

اقبال کو سب سے بڑا اعتراض اس یونانی فلسفی کے مسئلہ عیان[۷] پر ہے، جسے جدید افلاطونیوں نے مرتب کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ پر بدترین ضعف طاری ہے اور وہ ضعف فقدان جذبہ عمل سے ہے۔ ان کا مابعد الطبیعیات قاطع حیات ہے اور مقصد زندگی کا محو کنندہ۔ کیا یہ تباہی کا راستہ نہیں؟ اقبال کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہے۔ اسلامی زندگی سے بڑھ کر اور کوئی معراج نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تحقیق میں زمین پر ایک نائب قائم کرنے والا ہوں۔[۷]

اقبال میں جان ہے، چستی ہے، خلاق ہے، قناعت ہے، تفاؤل ہے، خون تازہ ہے، حقیقت پژوہی

ہے، اور سب سے بڑھ کر اسلام ہے۔ وہ نہیں دیکھ سکتا کہ ملت ابراہیمی دار الفنا میں داخل ہو، خواہ اس کا راستہ دکھلانے والا خود افلاطون اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کی فتادگی اور گوسفندی اسے غضبناک کر دیتی ہے۔ وہ اسے رُوحانیت اور تصوف جدید پر محمول کرتا ہے۔ یہاں وہ ایک مبارز کی حیثیت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مد مقابل کون ہے۔ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں، وہ حافظ شیراز ہے۔ اقبال کا علم تلوار سے کم کاٹ نہیں کرتا۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ یہ رُوحانیت یا تصوف بعد کی پیداوار ہے، اور ہمارے مذہب کی رُوح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اُصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد ''ہمہ اوست'' پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور ''ہمہ اوست'' منفی۔ ہارن کا خیال ہے کہ تصوف جدید بہت حد تک زرتشتی اور بدھ مت کے خیالات سے متاثر ہے۔ فان کریمر اس میں ویدانت کے آثار دیکھتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں صداقت افلاطونیت جدیدہ اور آزادنشو وارتقا کے بین بین ہے۔

تصوف کے رؤیت حق اور افلاطون کے اعیان نامشہود میں مماثلت ہے۔ صوفیوں کا رقص مستانہ در حقیقت نقل ہے۔ فلاطونی رُوح کی جو ایک متحرک دائرہ ہے، اپنے مرکز قدیم کے گرد اور بس۔ اور یہ مرکز خود خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ افلاطونیت جدید اور تصوف جدیدہ دونوں کی تفاصیل اور ظواہر میں بہت حد تک تطابق موجود ہے۔ براؤن لکھتا ہے کہ فلاطینوس[۸] کی تحریرات صاحب الفہرست[۹] اور شہرستانی[۱۰] سے مخفی نہیں تھیں۔

اسلام ان تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ خدا ربّ العالمین ہے اور مادّہ کی علت سے مبرا۔ اس کی مخلوق سراب نہیں۔ جس طرح خدا لکڑی اور پتھر سے تراشا نہیں جا سکتا، اسی طرح اس کی روئیت بھی مادّی یا رُوحانی آنکھوں سے ناممکن ہے۔ شیخ احمد سرہندی[۱۱] اپنے ملفوظات میں تحریر فرماتے ہیں: ''اگر کوئی صوفی یا مجذوب خیال کرتا ہے کہ اس نے خدا کا دیدار کیا ہے، چشم ظاہر سے یا چشم باطن سے، تو اس نے اپنے واہمہ یا دماغ کی متصور شکل کے سوا کچھ نہیں دیکھا'' خداوند تعالیٰ بے مثال ہے، یکتا ہے اور نظر سے اوجھل۔ خدا تک پہنچنے کا راستہ شریعت کا راستہ[۱۲] جدید تصوف کے خیالات باطلہ ''مغضوب'' اور ''ضالین'' کے راستہ پر چلاتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اسلامی عقائد و شعائر کو افلاطون اور ارسطو کے تاثرات سے آزاد کر دے۔ تاثرات جن کا لازمی نتیجہ رہبانیت و تباہی ہے۔ تصوف جدید رہبانیت ہے۔ یہ اس دُنیا کو خواب درخواب مایا یقین کرتا ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے سے کتراتا ہے۔ اس نے اسلام کی تعلیم عمل کو پس پشت ڈال دیا ہے؛ اور عمل ہی اصل اسلام[۱۳] ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو بھی اسی عمل کی طرف واپس بلاتا ہے۔ اس کی حقیقی رُوحانی تعلیم، اخلاقی قوت، جوش، فکر، سرگرمی اور عمل میں مضمر ہے۔ مگر وہ حافظ سے کیوں برسر کار پیکار ہے؟ اور مولانا جلال الدین رومی کے خلاف صف آرا نہیں ہوتا،

حالانکہ موخر الذکر تمام متصوفانہ شاعری کا باوا آدم ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ صوفی جب اپنے تجربات بیان کرتے ہیں، تو انھیں قدرتاً الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں جو عوام کے فہم و ادراک کے مطابق ہوں۔ خیالات خواہ آسمانی ہی کیوں نہ ہوں، مگر اظہار خیالات زمینی الفاظ ہوں گے۔ عشق جب ''مے'' اور ''نغمہ'' کے پردوں میں بیان کیا جائے گا، تو عجب نہیں اس سے مادّی اور ہیجانی لذات مراد لی جائیں۔ سنائی، عطار اور رومی باوجود اس کے ایسی زبان میں لکھتے ہیں، جو ان کی رُوحِ حقیقی کو صاف نمایاں کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ناظرین کو دُنیا سے پرے لے جائیں۔ مگر وہ اُس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے۔ برخلاف اس کے حافظ نے ان کے نشہ آور جرعہ میں اصلی شراب ٹپکا دی ہے۔ اس کا دیوان بصیرت سے زیادہ سکر آور ہے بے ریب سقراط[۱۴] کی مانند حافظ مخرب اخلاق نہیں، تاہم وہ ان کے خراب کرنے میں عمدہ معاون ضرور ہوا ہے۔ اس سے بہتوں نے شرابِ حقیقت کی بجائے شراب مجازی پی ہے۔ اقبال کا حملہ دراصل اس اپیکورس[۱۵] کے خلاف ہے، نہ کہ شعراء کے مادّی تصوف جدیدہ پر۔

جیسے کہ نکلسن دیوان شمس تبریز کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

تصوف جدید کے انحطاط کی انتہا ہے کہ اس نے پیر کو الوہیتی صفات سے متصف کر دیا ہے۔ پیر کے سب وشتم اور بد اخلاقیوں بلکہ اس کے جرائم کی نہ صرف یہ کہ تاویل کی جاتی ہے بلکہ اُن کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔۔۔ ایسے نظریوں کا جو براثر سادہ لوحوں پر پڑتا ہے، اس کے نتائج سے کون آگاہ نہیں۔'' یہ دوسری وجہ ہے اقبال اور آج کل کے صوفیوں کے درمیان جنگ کی۔ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی، تو بعض صوفی پیر جنھیں روایات باطلہ کی پابندی، اور شریعت حقہ سے ناواقفیت کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا[۱۶] اقبال کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ''اسے دار پر کھینچ دو، یہ مسلمانوں کو مغربی مادّیت کی تعلیم دیتا ہے۔'' اقبال کی آواز شور و شغب سے بلند سنائی دی۔ ''جاہل اور برخود غلط! خدا کی شان کہ آج افلاطونی اور ہمہ اوستی مجھے مغربی مادّیت کا شائع کرنے والا خیال کر رہے ہیں۔

آج ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے اہم ترین سوال مسئلہ وطنیت ہے۔ اسلام قید مکانی سے آزاد ہے اور وطنیت بستہ حدود و جہات ہے۔ اقبال بھی اپنے آپ کو اسلام اور وطن کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے۔ اس کی شاعری ان خیالات کی تصویر ہے، جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں گزر رہی ہیں۔ وہ میکیاولی[۱۷] کو مجرم گردانتا ہے، اور اسے ''مقامی ریاست'' کے خیال کا باقی قرار دیتا ہے۔ اقبال اس فلارنساوی کو موردِ طعن ٹھہراتا ہے، جس نے دُنیا کی اانکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کی ''کتاب الملوک'' شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی بلکہ اس لیے کہ اس کی تعلیم دانتے[۱۸] اور مارسلیس کے ''ریاست عالمگیر'' کے خیال کو زائل کرنے اور عیسائیت روما کو حدود اطالیہ میں قیام کرنے پر منتج ہوئی۔ اقبال نہیں چاہتا کہ اسلام ملکوں کی

چہار دیواری میں قید ہو کر لخت لخت ہو جائے۔ اقبال کی سیاست اخوت پر مبنی ہے، نہ کہ خود غرضی پر۔ مذہب سیاسی زندگی کا حقیقی پاسبان ہے۔ وطن یا ملک ایک عارضی یا جغرافیائی چیز ہے۔ تاریخی حوادث و واقعات اس کے حدود اور نصب العین کو متواتر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی حیات عارضی ہوتی ہے۔ اور وہ چند صدیوں کے لیے بھی ایک نہج پر قائم نہیں رہتا۔ اقبال کی ''ریاست عالمگیر'' مذہبی ہے، خدائی ہے، آدرش ہے، اور ابدی ہے مگر بایں ہمہ اقبال یہ نہیں کہتا ہے حبّ وطن، حبّ الایمان کی نقیض ہے۔ کل مین جز و ہوتا ہے۔ عالمگیر اخوت میں حبّ وطن پوشیدہ ہے۔ اسلامیاب ہند کے رایت پر دو نشان ہیں، اسلامیت محض اور وطنیت اور دونوں زندگی کی ایک ہی منزل کی جانب راہنمائی کرتے ہیں، اگرچہ راہیں الگ الگ ہیں۔[19]

درحقیقت اقبال میں مذہب کے غائر مطالعہ اور عمیق جذبہ حب الوطنی کا امتزاج کامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کا سیاسی مطمح نگاہ اس کے بلند مذہبی نصب العین کے ماتحت ہے۔ سیاسی نقطہ خیال اور مذہبی مقصد نظر کے اختلاط نے اس کے سیاسی فلسفہ کو ایک نئی حیثیت دے دی ہے۔

فریڈرک نٹشے[20] کے خیال میں فن کی دو شکلیں ہیں: (۱) اپالونی اور (۲) ڈایونیسنی، اپالونی پر وقار اور سنجیدہ تفکر ہے۔ ڈایونیسنی طوفان اور ہیجان کا دوسرا نام ہے۔ نٹشے کا ''ارشادات زرتشت'' جو عہد حاضر کے جرمنی کا شاہکار ہے، بالحاظ ہر دو موضوع اور طرز تحریر ڈایونیسنی ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی بھی جو دونوں اسلام کی حیاۃ ثانیہ کے نشانات ہیں، اسی قبیل سے ہیں۔ کیا اقبال نٹشے کے زیر اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے، اگرچہ وہ ہمیشہ مستعار چیزوں کو جلا دے کر ایک نئی اور عجوبہ چیز بنا دیتا ہے۔ نٹشے میں اس کے ماخذ حکایت ''الماس و زغال'' (اسرارِ خودی) سے دیکھے جا سکتے ہیں، جو تصنیف مندرجہ بالا کی حکایات[21] (پتھر و کوئلہ) سے ماخوذ ہے مگر چونکہ اقبال نٹشے سے بزرگ تر شاعر ہے، اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا ہے کہ الماس اس کا اپنا بن گیا ہے۔

نٹشے کی طرح اقبال بھی حریت فکر و فعل کا حامی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرات سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی حیات افروز مثنویوں کا حیرت انگیز اثر ہوا ہے۔ وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے:

''میں اسی طرح مرد و عورت کو چاہتا ہوں، ایک جنگ کے قابل اور دوسری امومت کے لائق۔''

نسائیت اقبال کے نزدیک امومت کے ہم معنی ہے۔[22] اے لوگو! ڈرو اپنے خدا سے جس نے تمھیں ایک نفس سے پیدا کیا اور تمہارے جوڑے پیدا کیے۔ اور پھر ان دونوں سے کئی مرد اور عورتیں پیدا کیں۔''[23] اور نسائیت کے لیے اسوۂ کاملہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ وہ دختر رسولؐ، بتول علیؓ اور امِ حسینؓ شہید کربلا ہیں۔ جب شاعری کی آنکھ عورت پر پڑتی ہے، تو وہ اس سے پرے خاتون جنت کو دیکھتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی آنکھیں دن رات اپنی اولاد کو دیکھتی ہیں، اور اسلامی دُنیا پر بارش ضیا و نور کی رہی ہیں۔[24]

عفت و عصمت مستورات وہ بنیادی پتھر ہے جس پر مذہب اور سیاست کی دیواریں قائم ہیں۔ آج کل کی نام نہاد آزاد عورت جو ایک محدود خاندان میں یقین رکھتی ہے، سلطنت کے زوال اور مذہب کے ادبار کی نشانی ہے۔[۲۵] اقبال نے ایک نہایت اہم سوال کو چھیڑا، مگر اس نوعی بحث کو طول دینے سے احتراز کیا، اور اس کے جملہ پہلوؤں کو منظرِ عام پر لانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ بہت لطف ہو، اگر وہ نسائیات کے بعض مسائل کی توضیح کر دیں، مثلاً مرد اور عورت کے لیے غیر مساوی شرائط نکاح یا پھر فقہائے قدیم کے اُصولوں کی کوئی نئی تاویل و توجیہ پیش کریں۔

اقبال بعض معاملات میں روسو[۲۶] کی مانند ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پھر سے عہدِ نبوی کے شاندار شب و روز آ جائیں، اس کے تمام خیالات اسی ایک خواب کی تعبیر ہیں۔ روسو فطرت کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اقبال دشتِ حجاز پر مٹا ہوا ہے، اس کا دل دکھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان تہذیبِ حاضرہ کے تصنع اور چمک دمک سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں، جس میں سطحی اور تعیش کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی روایات عربی ہیں، اس لیے انھیں اپنے شریفانہ جذبات اور قدرتی فطانت کو برقرار رکھنا چاہیے۔ یورپ کی نقل کسی طرح سود مند نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ایرانی اوضاع و اطوار نے ماضی میں کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔ غیر ملکی خیالات کا مبالغہ آمیز اور غلامانہ تتبع ہر ایک قوم کے لیے مہلک ثابت ہوا۔[۲۷]

لیکن اسلامی سوسائٹی ان پُرانی روایات پر پھر سے کیسے قائم کی جا سکتی ہے۔ ''تاریخ قوم کے لیے وہی کام دیتی ہے، جو حافظہ فرد کے لیے۔'' مسلمانوں کی تمام حیاتِ ماضی، ان کے تمام محسوسات و مزعومات، عزائم اور کامیابیاں، اس دن سے جب ان میں قومی و مذہبی زندگی کا احساس پیدا ہوا، اوراقِ تاریخ میں غیر فانی طور پر محفوظ ہیں اور تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانا چاہیے۔[۲۸] زندگی کو سادہ بناؤ، اس میں جھوٹے تصنع، فرقہ وارانہ خیالات اور غیر مخلصانہ و خود غرضانہ خواہشات کا گزر نہ ہو۔ اخلاقی، دماغی اور سیاسی بزدلی جو آج اسلام کی انفرادی حیثیت کی جڑیں کاٹ رہی ہے، اسے دور کرو۔

اس کے معنی رجعتِ قہقہری نہیں۔ مصلح کا کام ماضی سے شاندار عہد کی جانب رہنمائی کرنا ہے۔ اس سے مراد شادہ اخلاق، زندگی پر ایک مردانہ نظر اور عرب کی شجاعانہ جانبازی کا ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی عصبیت پیدا کر کے ان کے دلدر کاٹنا ہے۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کی بزدلی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکوں۔

جب مثنویوں کا علم کلام ہر جگہ سمجھ میں آ جائے، تو تمام اسلامی دُنیا میں وہ لہر چلے گی جس کا نتیجہ نہایت شاندار ہے۔ اقبال ایک پیغام بر ہے، وہ اسلام کے شاندار اور بے نظیر زریں ماضی اور مستقبل میں اس کی معاودت کا نظارہ کرتا ہے۔ مگر وہ مستقبل ایسا ہے جیسے اس کے ہر طرف دھند چھائی ہے، اگرچہ دھند گہری

نہیں ہے۔

بعض دفعہ اس ملک میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ آخر مثنویوں کو اُردو کی بجائے فارسی میں لکھنے سے کیا فائدہ مترتب ہوگا؟ اقبال ان لوگوں میں سے ہے جو گا ہے گا ہے ایک پیغام اور ایک مقصد کے ساتھ منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس کا پیغام تمام اسلامی دُنیا کے لیے ہے۔ اس کی مثنویاں بچوں کے مدارس میں سعدی کی گلستاں اور دہلی، کابل، طہران، قاہری، قازان، استنبول، مدینہ اور مکہ کی جامع مسجدوں کے منبروں پر مثنوی مولانا روم کی جگہ استعمال کرنے کے لیے ہیں۔

مثنویاں بحر رمل مسدس مقصود میں لکھی گئی ہیں۔ بحر رمل میں یہ تبدیلی غزل اور مثنوی میں متداول ہے۔ مثنوی معنوی بھی اسی بحر میں لکھی ہوئی ہے۔ پہلی مثنوی (اسرارِ خودی) زیادہ حقیقی ہے، دوسری (رموزِ بے خودی) زیادہ تخیلی ہے۔ رموز میں اگر تھوڑی سی حکایتیں اور ہو جاتیں، تو دماغ پر اس کی بھی وہی حقیقی گرفت ہوتی جو اسرار کی ہے۔ یہ کمی رموز کے نصف آخر میں خصوصاً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی ایسا نقص نہیں جو مصنف دور نہیں کر سکتا ہے۔

اقبال نے فارسی ادبیات کی جھوٹے مصنوعی ادب القدما سے اصلی ادب القدما کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ صائب کے بعد کے شعرا عہد زریں کا ایک غیر شعوری اور مدھم سی گونج رہ گئے تھے۔ اقبال کا پھر سے اساتذۂ قدیم کی روش اختیار کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ بیدل اور اس کے متبعین کی شاعری کے خلاف ہے، جو رنگین پردوں میں لپٹی ہوئی ہے جس میں حسن وکشش تو ہے مگر قوت وعمل نہیں۔ اس کا طرز تحریر مولانا روم کا ہے۔ لیکن الفاظ ایسے ہیں جیسے کسی مرصع تلوار کے دستہ میں موتی جڑے ہوں۔ لیکن باوجود اپنے اس عظیم الشان پیش رو کی تقلید کے اقبال یقیناً بیسویں صدی کی پیداوار ہے، نو بیدار مشرق کی رُوح ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اور اقبال کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس نے ایرانی شاعری کی وامانده رگوں میں خون تازہ دوڑا دیا ہے۔ اور حسن صوری کے ساتھ قوت معنوی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ مثنویوں کی زبان بہت پر شوکت ہے، لیکن اس مردانگی کے باوجود اس میں لوچ اور لچک ہے۔ آج جبکہ فارسی زبان خود اپنے وطن میں اس قدر بدنما ہو گئی ہے، اقبال اس کے شباب کی یاد دلاتا ہے۔ فارسی ادب ایک خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف جب خود ایران میں ادبی انحطاط نمایاں ہے دوسری طرف ایک موسیٰ نے اپنے عصا سے چٹان کو ضرب لگائی ہے اور ایک نیا کوثر پھوٹ بہا ہے، جو بنی اسرائیل کے بارہ چشموں سے کسی طرح کم نہیں۔[۲۹]

(نیرنگ خیال، اقبال نمبر ۱۹۳۲ء)

❀....❀....❀

حواشی وحوالہ جات

۱۔ اس مضمون کو علامہ ممدوح نے ''حکایت طائرے کہ از تشنگی بے تاب بود'' اور حکایت ''الماس و زغال'' میں بیان فرمایا ہے۔ موخر الذکر میں جب کوئلہ الماس سے پوچھتا ہے کہ باوجود یکہ ہماری پیدائش ایک کان سے ہوئی ہے، کیا وجہ ہے کہ تو سر تاج شہنشاہاں ہوتا ہے اور میں انگیٹھی میں جلتا ہوں۔ تیری قدر ہوتی ہے اور میں ہر جگہ ذلیل ہوں:

گفت الماس اے رفیق نکتہ بیں
تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں
تا بہ پیرامون خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثل سنگ شد
پیکرم از پختگی ذوالنور شد
سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد
خوار گشتی از وجود خام خویش
سوختی از نرمئ اندام خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثل سنگ شو الماس باش
می شود از روئے عالم مشیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشت خاکے اصل سنگ اسود است
کہ سر از جیب حرم بیروں زدست
البتہ از طور بالا تر شد است
بوسہ گاہ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی نا پختگی است

۲۔

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینہ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ماسویٰ قطع نظر
میں نہد ساطور بر حلق پسر
با یکی مثل ہجوم لشکر است
جاں بچشم او زباد ارزاں تراست

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر
ایں سبق صدیق را صدیق کرد
سر خوش از پیمانہ تحقیق کرد
از رضا مسلم مثال کوکب است
در رہ ہستی تبسم بر لب است
گر خدا داری زغم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو
قوت ایماں حیات افزایدت
ورد 'لا خوف علیہم'' بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از ''لا تخف'' محکم شود
بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رہزن است
بیم جاسوسے است از اقلیم مرگ
اندرونش تیرہ مثل میم مرگ
ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست
ہر کہ رمز مصطفیؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

یہی مضمون محاورہ ''تیر و شمشیر'' اور حکایت ''شیر و عالمگیر'' میں بیان کیا گیا ہے۔ آخرالذکر کے دو شعر درج ذیل ہیں:

عشق را آتش زن اندیشہ کن
روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہاں است و بس

-۳

شاہ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبار دودماں گورگاں
درمیاں کارزار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں
در صف شاہنشہاں یکتاستے
فقر او از تربتش پیداستے
روزے آن زیبندۂ تاج و سریر
آن سپہدار و شہنشاہ و فقیر
صبحگاہاں شد بہ سر بیشہ اے
با پرستارے وفا اندیشہ اے
سرخوش از کیفیت باد سحر
طائران تسبیح خواں بر ہر شجر
شاہ رمز آگاہ شد محو نماز
خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز
شیر ببر آمد پدید از طرف دشت
از خروش او فلک لرزندہ گشت
بوئے انساں دادش از انساں خبر
پنجہ عالمگیر را زد بر کمر
دست شہ نادیدہ خنجر برکشید
شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود راہے نداد اندیشہ را
شیر قالیں کرد شیر بیشہ را
باز سوئے حق رمید آں ناصبور
بود معراجش نماز با حضور

ایں چنیں دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینہ مومن وطن
تو ہم اے نادان دلے آور بدست
شاہدے را محملے آور بدست

۴- اندرد قلس اور شیر کی کہانی مشہور ہے:
اندرد قلس روما کا ایک رم خوردہ غلام تھا۔ اس نے ایک غار میں پناہ لی۔ اچانک اس غار میں ایک شیر بھی داخل ہوا اور بجائے غلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے اپنا پاؤں اس کے سامنے رکھ دیا جس میں کانٹا چبھا تھا۔ غلام نے وہ کانٹا نکال دیا اور شیر چلا گیا بعد میں غلام گرفتار ہوا اور حسب قانون اسے شیر کشتی لڑنے کا حکم ہوا۔ حسن اتفاق کہ اس کے مقابل وہی شیر چھوڑا گیا جس کا کانٹا اس نے نکالا تھا۔ جب شیر اس پر جھپٹ کر آیا تو اسے پہنچانتے ہی فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے پیر چاٹنے لگا۔ جب حکام نے یہ نظارہ دیکھا تو غلام کو آزاد کر دیا۔ ایک اسی طرح کا واقعہ برطانوی سفیر روما سر جارج ڈیوس کا بھی ہے۔ لیکن طوالت سے خالی نہیں۔ اس لیے چھوڑتا ہوں۔

۵- مساوات اسلامی کا مضمون نہایت تفصیل سے رموز کے باب رسالت میں درج ہے۔ میں صرف ''حکایت سلطان مراد ومعمار'' سے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں:

بود معمارے ز اقلیم خجند
در فن تعمیر نام او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد
مسجدے از حکم سلطان مراد
کوش نیامد شاہ را تعمیر او
خشمگیں گردید از تقصیر او
آتش سوزندہ از چشمش چکید
دست آں بیچارہ از خنجر برید
جوئے خوں از ساعد معمار رفت
پیش قاضی ناتوان و زار رفت
آں ہنر مندے کہ دستش سنگ سفت
داستاں جور سلطان باز گفت
قاضی عادل بدنداں خستہ لب
کرد شہ را در خود طلب
رنگ شہ از ہیبت قرآں پرید
پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام
اعتراف از جرم خود آوردہ ام

گفت قاضی فی القصاص آمد حیواۃ
زندگی گیرد بایں قانوں ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست
خون شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید
دست خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند
آیۂ بالعدل و الاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیٰ بخشیدمش
یافت مورے برسلیمانے ظفر
سطوت آئین پیغمبرؐ نگر
پیش قرآن بندہ و مولا یکے ست
بوریا و مسند دیبا یکے ست

۶- رالف والڈو ایمرسن (۱۸۰۳ء-۱۸۸۲ء) امریکہ کا مشہور مصنف، انیسویں صدی کے اخلاقیات پر اس کی تصنیفات اور تعلیم نے نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا فلسفہ خود اعتمادی و خود داری اور اس کا رُوح کے احکام کی پابندی پر زور دینا بہت مؤثر ثابت ہوا ہے اور حال اس کے خیالات کا دائرہ اثر ترقی پذیر ہے۔

۷-

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیلہائے ما فرماں رواست
جام او خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباس آدم است
حکم او برجان صوفی محکم است
عقل خود را بر سر گردوں رساند
عالم اسباب را افسانہ کواند
کار او تحلیل اجزائے حیات
قطع شاخ سرد رعنائے حیات
فکر افلاطوں زیاں را سود گفت

حکمت او بود را نابود گفت
بسکہ از ذوق عمل محروم بود
جان او وارفتہ و معدوم بود
منکر ہنگامہ موجود گشت
خالق اعیان نامشہود گشت
زندہ جاں را عالم امکاں خوش است
مردہ دل را عالم اعیان خوش است
آہوش بے بہرہ از لطف خرام
لذت رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقت رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوق روئیدن ندارد دانہ اش
از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوق عمل محروم گشت

۸- واذ قال ربك للملئكة انی جاعل فی الارض خليفة (البقرہ-۳۰)

۹- بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افلاطون، اس کے فلسفہ اور فلاطینوس اور افلاطونیت جدیدہ (اشراق) کی نسبت کچھ تھوڑا سا لکھ دیا جائے۔ کیونکہ یہ لفظ مضمون میں اکثر استعمال ہوئے ہیں:

(الف) افلاطون (۴۲۹-۳۴۷ ق م) وہ سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کا اصلی نام ارسطاقلس تھا۔ مگر اس کے چوڑے چکلے سینے کی وجہ سے سقراط نے اس کا نام افلاطون رکھا۔ اس نے فلسفہ کو تین شاخوں میں تقسیم کر دیا۔ اخلاقیات، منطق (ما بعد الطبیعیات) اور الہیات۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے تمام مخلوق کو اپنی شکل پر بنانے کا خیال کیا۔ اس نے پہلے رُوح کو بنایا جو محسوس اور معقول کے درمیان توصل کا کام دیتی ہے۔ اس رُوح کے ساتھ اس نے جسد خاکی کو ملایا۔ رُوح جسم کے تین حصوں میں رہتی ہے۔ دماغ، دل اور انتڑیاں، اور ان سے بالترتیب عقل، جوصلہ اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدائی کی طرح مادّہ کو بھی ازلی مانتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام علم اپنی انتہا میں واحد اور آزاد ہے۔ خدا تمام چیزوں کا معیار ہے۔ اور اس میں ہی ہمت اور عقل کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور قدرت میں جو کچھ اصلی ہے اور جو خیالات وقوانین کا مجموعہ ہے خدا سے نکلا ہے۔ اس کا مسئلہ اعیان نامشہود مشہور ہے۔ اس کی کتاب ''الجمہوریت'' اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ اور اس کے نصب العین سیاسیات کو واضح کرتی ہے۔

(ب) فلاطینوس (۲۰۳ یا ۲۰۴ میں پیدا ہوا اور ۲۶۲ اور ۲۷۰ کے درمیان فوت ہوا) نے افلاطونیت جدیدہ کو مرتب کیا۔ اپنے خیال میں وہ افلاطون کا شارح اور متبع تھا۔ مگر اس کے خیالات اپنے پیشرو سے کچھ اس قدر مختلف ہیں کہ افلاطون سے اس کی نسبت بھی غلطی ہے۔ فلاطینوس کے فلسفہ کی قدر و قیمت اس کے خیالات کی وجہ سے نہیں بلکہ بوجہ اپنی تاریخی اہمیت اور بعض انسانی طبائع کے تجزیہ کی وجہ سے ہے۔ افلاطون کے نزدیک عقل میں جو کچھ بہترین اور اعلیٰ ترین ہے،

اس کا نام خیر ہے۔ فلاطینوس خیر کو تجرید محض خیال کرتا ہے۔ افلاطون انسانی اخلاق کی معراج عقل انسانی کے ذریعہ تتبع خداوندی قرار دیتا ہے۔ فلاطینوس تتبع اور خود صفات اللہ کو بنگاہ حقارت دیکھتا ہے اور انسانی مطمح نظر ادغام بر الہ یقین کرتا ہے۔ فلاطینوس کے نظریہ کے مطابق رُوح اپنے مبداء سے ایسے ہی نکلی ہے جیسے سورج سے شعاعیں، اور اب غیر ارادی طور پر اپنے منبع کو دیکھنے کے لیے تگ و دو کر رہی ہے۔ اس حرکت میں اس سے تصور اور تصور سے خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہ خیال انسانی رُوح کا آفرینندہ ہے۔ مادّہ خیر کا زیریں ترین مقام ہے اور اسی کی ارتقائی حالت خیر ہے۔ وہ انسان اور خدا کے درمیان بلا واسطہ تعلق کا قائل ہے۔

۱۰- ابوالندیم۔

۱۱- ابوالفتح محمد الشہر ستانی۔ مصنف کتاب الملل والنحل جس میں مختلف سنی فرقوں کا حال بالتفصیل درج ہے۔ کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ سال وفات ۱۱۵۳ء مطابق ۵۴۸ھ۔

۱۲- شیخ احمد سرہندی کا لقب مجدد الف ثانی ہے۔ شیخ عبدالوحید فاروقی سرہندی کے فرزند ارجمند تھے۔ سرہند ۱۵۶۳ء مطابق ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے مشہور ولی اللہ خواجہ باقی اللہ کے مرید تھے۔ ان کا یقین تھا کہ ہر ہزار سال کے بعد ایک شخص ایسا پیدا ہوتا ہے، وہ تمام علومیہ اسلامیہ میں کامل اور طاقت و شوکت اسلام کا بڑھانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ دعویٰ کرتے تھے کہ دوسرے ہزار سال کا مجدد میں ہوں۔ ۱۶۲۴ء مطابق ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ مقبرہ سرہند میں ہے۔

۱۳-

در شریعت معنی دیگر مجو
غیر ضو در باطن گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہر گر است
ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقات یقیں
پختہ تر از دے مقامات یقیں
ملت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمے خیزد دوام
با تو گویم سر اسلام است شرع
شرع آغاز است وہ انجام است شرع
شارع آئین شناس خوب و زشت
بہر تو ایں نسخہ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت
جانے کوبے در جہاں اندازدت

خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دین مصطفیٰ دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آن سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دل آہن رباید زنگ را

۱۴- فلسفہ عمل علامہ کا بڑا دل پسند موضوع ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام کتابوں میں اس کی تعلیم دی ہے، اور ہر جگہ نئے انداز سے دی ہے۔ اگر جگہ تنگ نہ ہوتی تو دوسری کتب سے حوالہ جات پیش کرتا مگر:

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

صرف اسرار و رموز ہی پر اکتفا کرتا ہوں، اور وہ بھی صرف ایک جگہ سے۔ ضرورت ہے کہ ناظرین کتاب کو خود نگاہ غائر مطالعہ کریں:

اے ز جور چرخ ناہنجار و تنگ
جام تو فریادی بیدار سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا
سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمون حیات
لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہان تازہ شو
شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہان نا مساعد ساختن
ہست در میدان سپر انداختن
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیاد موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرات را
می کند از قوت خود آشکار
روزگار تو کہ باشد سازگار

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست
آزماید صاحب قلب سلیم
زور خود را از مہمات عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
حربہ دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوت پیداستے
اصل او از ذوق استیلاستے
عفو بیجا سردی خون حیات
سکتہ اے در بیت موزدن حیات
ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

۱۵- سقراط (۴۶۹-۳۹۹ ق م) یونانی فلسفی۔ افلاطونی کا اُستاد۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اپنے نفس کو جانو یعنی اپنی انا کا اندازہ کرو۔ رُوح کی تعریف وہ یوں کرتا ہے، ہماری وہ چیز جو علم بھی رکھتی ہے اور بے علمی بھی، خیر بھی اور شر بھی۔ اپنی خدا پرستی کی وجہ سے زہر سے ہلاک ہوا۔

۱۶- اپیکرس (۳۴۲-۲۷۰ ق م) یونانی فلسفی۔ اس کی تعلیم کا اُصول یہ تھا کہ چونکہ خوشی اور غم ہی دُنیا کے خیر و شر ہیں لہٰذا فلسفہ کا مقصد اولیٰ حصول مسرت اور انعدام کلفت ہونا چاہیے۔ اس کے نزدیک سکون قلب مبنی بہ مراقبہ خیر پر منتج ہوتا ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ اس کی تعلیم ''کھاؤ پیو اور خوش رہو'' ہے غلط فہمی پر مبنی ہے۔

۱۷- حضرت علامہ نے ایک جگہ ایسے پیروں کی نہایت صحیح شکل کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتہ تسبیح از زنار ساخت
پیر ہا پیر از بیاض مو شدند
سخرہ بہر کودکان کو شدند
دل ز نقش لا الٰہ بیگانہ اے
از صنمہائے ہوس بت خانہ اے
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش
آہ زیں سوداگران دیں فروش

با مریداں روز و شب اندر سفر
از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند
سینہ ہا از دولت دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصف پرست
اعتبار ملت بیضا شکست
واعظ ما چشم بر بتخانہ دوخت
مفتی دین مبیں فتویٰ فروخت
''چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما
رخ سوئے مے خانہ دارد پیر ما''

۱۸- میکیاولی (۱۴۶۹ء-۱۵۳۷ء) اطالوی مورخ وسیاس۔ وہ فلارنس میں پیدا ہوا۔ اور وہاں مدتوں ریاست میں مناصب جلیلہ پر سرفراز رہا۔ آخر معطل کیا گیا اور اپنے جاگیری بندوبست میں بقیہ عمر بسر کی۔ اس کی ''كتاب الملوك'' سب سے پہلے ۱۵۳۲ء میں پوپ کلیمنٹ ہفتم کی اجازت سے شائع ہوئی۔ اس میں اس نے سیاسیات اور اخلاقیات کے درمیان ایک حد فاصل قائم کی۔ اور اس میں زمانہ حال کے کئی سیاسین نے اس کی تقلید کی ہے، وجو اپنی سیاسی اغراض ومقاصد میں اُصول اخلاق کو دخل نہیں دیتے۔ حضرت علامہ اس کی نسبت سے فرماتے ہیں:

دہریت چوں جامہ مذہب درید
مرسلے از حجرت شیطاں رسید
آں فلارنساوی باطل پرست
سرمہ او دیدۂ مردم شکست
نسخہ اے بہر شہنشاہاں نوشت
در گل ما دانہ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت
حق ز تیغ خامہ او لخت لخت
بت گری مانند آزر پیشہ اش
بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت
فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد
نقد حق را بر عیار سود زد
باطل از تعلیم او بالیدہ است
حیلہ اندازی فنے گرویدہ است

طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت
ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بہ چشم اہل عالم چیدہ است
مصلحت تزویر را نامیدہ است

۱۹- دانتے (۱۲۶۵ء-۱۳۲۱ء) اٹلی کا بزرگ ترین شاعر ہے۔ اس کی ڈیوائن کو میڈی (طربیہ الٰہی) مشہور و معروف ہے۔ اس میں مصنف نے طبقات علوی کی سیر کا حال بیان کیا ہے۔ اسے اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دوزخ، دارالکفارۃ اور جنت۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ میں ایک گھنے جنگل میں جا نکلا ہوں، جہاں ورجل (اس سے پہلے کا ایک اطالوی شاعر) کا ہیولا ظاہر ہوتا ہے اور دوزخ اور دارالکفارۃ میں اس کی رہنمائی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ دوزخ کے جو نظارے دانتے نے بیان کیے ہیں، بلحاظ وقت نظر، اعتقاد تامہ اور جزئیات کرداری نگاری غالباً بے نظیر ہے اور شاید کسی ایک مصنف کے کلام میں اتنی خوبیاں بیک وقت نہیں ملیں گی۔ دارلکفارۃ میں نظارے تقریباً وہی ہیں البتہ سزا وعقوبت عارضی ہے۔

جنت سماویٰ میں اس کا رہبر اس کی معشوقہ بطریس ہے۔ سات طبقوں کی سیر کے بعد وہ آٹھویں طبقہ میں پہنچتا ہے۔ جہاں حضرت یسوع مسیح کو اپنے صاحب عظمت حواریوں کے حلقہ میں دیکھتا ہے۔ نویں طبقہ میں وہ اپنے آپ کو رُوح کل کی موجودگی میں محسوس کرتا ہے۔ اور ارواح مرحومہ کو ایک لامحدود دائرہ میں تختوں پر بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ خداوند تعالیٰ خود دسویں طبقہ میں، جسے وہ وفورِ نور کے باعث نظارہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام رؤیائی تجربات کی بنیاد دراصل اعتقاد حسن، خیر و زشت، شر اور محبت کی عالمگیری اور قدرت عظیمہ ہے۔ اور یہ سب کچھ اس جوش و خروش اور صحت کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ الہام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مدتوں اس کے ہم وطنوں کا یہ خیال رہا کہ یہ تمام حالات الہامی ہیں۔

۲۰-

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست
رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اسلام نیست
زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم
خویش را در خاکداں گم کردہ ایم
مسلم استی دل باقلیمے مبند
گم مشو اندر جہان چون و چند
می نہ گنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دل او یاوہ گردد شام و روم
عقدۂ قومیت مسلم کشود

از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطان دین
مسجد ما شد ہمہ روئے زمین
آں کہ در قرآں خدا او را ستود
آں کہ حفظ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش
لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویان حق ز ما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است
صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قید مقام آزاد شو
از فریب عصر نو ہشیار باش
رہ فتد اے راہبر و ہشیار باش

۲۱- فریڈرک نٹشے (۱۸۴۴-۱۹۵۰ء) جرمن شاعر اور فلسفی۔ لیکن چونکہ وہ اصل میں شاعر تھا، اس لیے اس کے نزدیک فلسفہ بھی ندگی اور فکر کی تنقید ہی ہے۔ اس کے خیال میں تمام مخلوق میں جس میں انسان بھی شامل ہے، آرزوئے حیات سب سے زیادہ ہے، جس کے معنی کہ طاقت حاسل کی جائے اور تمام رکاوٹوں کا قلع قمع کیا جائے جو زندگی کو مشکل بناتی ہیں۔ موجودہ انسان مخلوق خداوندی کا منتہائے مقصود نہیں، بلکہ جیسے جانور کی ارتقائی صورت انسان ہے، ایسے ہی انسان بھی عارضی ہے۔ اور اس کے بعد مکمل انسان (فوق البشر) ہوگا، جس میں حسن و طاقت، عقل و اخلاق، قوت ارادی و عمیق نگاہ بدرجہ کمال ہوں گے۔ اور ان الفاظ کے معنی بھی ان کے موجودہ مطلب سے کچھ زیادہ وسیع ہوں گے۔ محبت، رحم اور ہمدردی اس کے لیے بے معنی الفاظ ہیں۔ اس کے نزدیک فطرت ان الفاظ سے مبرا ہے اور مندرجہ بالا مقصود کی طرف بغیر دائیں بائیں دیکھے جاری ہے۔

اس طرح گویا اس نے انتہا درجہ کی انفرادیت کی تعلیم دی جس میں زندگی کی نسبت مقصد حیات گنا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اشتراکیت اور فوضویت، مساوات سیاسی اور حکومت عوام کالانعام کے سخت خلاف ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرمنوں کی موجودہ ذہنیت کے لیے بہت حد تک وہ ذمہ دار ہے اور گزشتہ جنگ عظیم کی تہہ میں اسی کی تعلیم تھی۔

-۲۲

نغمہ خیز از زخمہ زن ساز مرد
از نیاز او دو بالا ناز مرد
پوشش عریانی مرداں زن است
حسن دلجو عشق را پیراہن است
آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر اور فرد با طیب و الصلوٰۃ
نیک اگر بنی امومت رحمت است
زانکہ او را با نبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیر ما
در خط سیمائے او تقدیر ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے
حرف امت نکتہ ہا دارد بسے
ملت از تکریم ارحام است و بس
ورنہ کار زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتار حیات
از امومت کشف اسرار حیات
از امومت پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حباب جوئے ما

-۲۳ یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا و بث منھما رجالاً کثیراً و نساء۔ (نساء آیت ۱)

-۲۴

سیرت فرزند ہا از امہات
جوہر صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودے چادرے خود را فروخت
نوری و ہم آتشی فرمانبرش
گم رضائش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا

آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامان نماز
اشک او بر چید جبریل از زمیں
ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں
رشتہ آئین حق زنجیر پاست
پاس فرمان جناب مصطفیٰ است

اسی سلسلہ میں ''خطاب بہ مخدرات اسلام'' بھی زیر نظر رہی۔

-۲۵

آں تہی آغوش نازک پیکرے
خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است
ظاہرش زن، باطن او نازن است
بند ہائے ملت بیضا گسیخت
تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بار اموت بر نتاخت
بر سر شامش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستان ما نارستہ بہ
داغش از دامان ملت شستہ بہ

۲۶- روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸ء) ایک عجیب انقلابی دل و دماغ کا مالک تھا۔ فرانس میں جب حکومت نے اس کو جلا وطن کیا تو انگلستان پہنچا۔ یہاں بھی ہوا راس نہ آئی، تو واپس فرانس آیا تو عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے سخت مخالفین میں سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کی ابتدائی فطرتی حالت بہترین تھی۔ اس میں عجیب طور پر سرگرم جذبہ محبت و رافت کے ساتھ ساتھ تمام قائم شدہ اُصول و قواعد کے خلاف سخت مخالفانہ و جارحانہ خیالات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے لیے وہ بھی بہت حد تک ذمہ دار گردانا گیا ہے۔

-۲۷

اے میان کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی او را بزن
فکر روشن بیں عمل را راہبر است
چوں درخش برق پیش از تندر است

فکر صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت
دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کرد
از چمن زار عجم گل چیدہ ای
نوبہار ہند و ایراں دیدہ ای
اند کے از گرمی صحرا بخور
بادۂ دیرینہ از خرما بخور
سر یکے اندر بہر گرمش بدہ
تن دمے با صرصر گرمش بدہ

مگر رموز میں اس سے اور بھی صاف اور واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت
قوم را رمز بقا از دست رفت
آں نہال سر بلند و اُستوار
مسلم صحرائی اشتر سوار
آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند
گشت از پامال مورے درد مند
آنکہ حزمش کوہ را کاہے شمرد
با توکل دست و پائے خود سپرد
کوشش او با قناعت ساز کرد
تا بہ کشکول گدائی ناز کرد
شیخ احمد سیّد گردوں جناب
کاسب نور از ضمیرش آفتاب
گل کہ می پوشد مزار پاک او
لا الہ گویاں دمد از خاک او
با مریدے گفت اے جان پدر
از خیالات عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت
از حد دین نبی بیروں گذشت
اے برادر ایں نصیحت گوش کن
پند آں آقائے ملت گوش کن

قلب را زیں حرف حق گرداں قوی
با عرب در ساز تا مسلم شوی

-۲۸

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ
داستانے قصہ پارینہ ؟
ایں ترا از خویشتن آ گہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند
رُوح را سرمایۂ تاب است ایں
جسم ملت را چو اعصاب است ایں
ہمچو خنجر بر فسانت می زند
باز بر روئے جہانت می زند
شمع او بخت امم را کوکب است
روشن از وے امشب وہم دیشب است
چشم پر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضی تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو
موج ادراک تسلسل زندگی است
مے کشاں را شور قلقل زندگی است

-۲۹ واذ استسقیٰ موسیٰ لقومه فقلنا اضرب بعصاك الحجر فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا قد علم كل الناس مشربهم (البقرہ۶۰)

❁...❁...❁
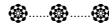
فلسفۂ بیخودی

رموزِ بیخودی کے تناظر میں مطالعہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہماری زندگی فی الحقیقت علائق اور نسبتوں کی ایک نامتناہی زنجیر ہے۔ جز وکل کا ربط ناگزیر ہے۔ وہ ہر چیز جسے ہم انسانی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تعیناتِ مخصوصہ کا نام ہے اور تعین کا وجود تسلسل سے ہے افراد کا جماعت سے تعلق ہوتا ہے، جز کی بحث ہو چکی۔ اب کل کے ساتھ اس کی نسبتوں پر نظر ڈالنی لازم آتی ہے، اقبال نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے:

فرد و قوم آئینہ یک دیگراند
سلک و گوہر کہکشاں و اختراند

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل ست
قوتش آشفتگی را مائل ست

ملت کا قیام اختلاط افراد پر ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل نبوت سے ہوتی ہے، جماعت کا حقیقی مفہوم نفس نبوت کا ترجمان ہے ہر شے خواہ وہ افراد سے متعلق ہو یا جماعت سے جب تک کوئی زندہ عقیدہ یا قانون اسے مربوط یا مستحکم نہ کرے، ربط کا کوئی حقیقی مفہوم پیدا نہیں ہوتا:

تا خدا صاحب دلے پیدا کند

کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازۂ
خاک را بخشد حیاتِ تازۂ

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلے رنگیں ز یک ساغر کند

بندہا از پا کشاید بندہ را
از خداونداں رہاید بندہ را

گویدش تو بندۂ دیگر نہٖ
زیں بتان بے زباں کمتر نہٖ

تا سوے یک مدعایش می کشد
حلقہ آئیں بپایش می کشد

ایک اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک اس عالم کی حقیقی نجات بہ الفاظ دیگر معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی وکامرانی اسلامی اصول کی پابندی اوران کے نفاذ سے وابستہ ہے۔ شاعری کا براہ راست کام یہ ہے کہ وہ جذبات کو متاثر کرے اور ایک مذہب پرست کا شیوۂ مذہبی عقائد کی ترویج وتلقین ہے وہ بھی اس طور پر کہ وہ اپنے عقائد کو محض عقائد کی حیثیت سے تسلیم کرائے۔ ان نظریات کو ملحوظ رکھ کر اقبال کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ باوجود شاعر اور مذہب پرست ہونے کے، انسانی ذہن وفکر کے میلانات طبعی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ارکان اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن وفکر کا اسلام سے انحراف کرنا ناممکنات سے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعر وشاعری میں الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث واستدلال ایک فاضل حکیم کے انداز سے کرتے ہیں۔ اسلام کے ارکان اساسی میں توحید، رسالت، نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کو مخصوص حیثیت حاصل ہے، آخرالذکر چار فرائض ایسے ہیں جو عمل سے متعلق ہیں، اقبال نے ان کے فلسفہ پر خیالات ظاہر کیے ہیں لیکن پہلے دو حقیقتوں یعنی توحید اور رسالت پر رموز بےخودی میں نہایت شرح وبسط سے بحث کی ہے، توحید اور رسالت کا تعلق چونکہ معتقدات سے ہے اور یہیں سے دوسرے شعبہ جات کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس لیے اقبال نے ان پر خصوصیت کے

ساتھ بحث کی ہے، کیونکہ توحید اور رسالت کو دیگر ارکان اسلامی سے وہی تعلق ہے جو بقیہ دفعات قانونی کو تمہید یا ''پری ایمبل'' سے ہوتی ہے فرماتے ہیں:

اہل حق را رمز توحید ازبر است
در اتیِ الرّحمٰن عبداً مضمر ست

دیں از و، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

ملت از یک رنگیِ دلہاستی
روشن از جلوۂ ایں سیناستی

قوم را اندیشہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے

جذبہ باید در سرشتِ او یکے
ہم عیار خوب و زشتِ او یکے

گر نباشد سوز حق درساز فکر
نیست ممکن ایں چنیں انداز فکر

مدعاے ما، مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست

توحید ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو ان مکروہات سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے جن میں اسیر ہو کر وہ زندگی کو پرآشوب تصور کرنے لگتا ہے۔ مایوس، محزوں یا مخوف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو انسان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے یا پھر وہ کسی ایسے حکیم و قادر کا قائل نہیں ہے جو نہ کبھی غلطی کرتا ہے اور نہ کبھی ظلم گوارا رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ خود اعتمادی کا اصلی راز بھی اسی عقیدۂ توحید میں مضمر ہے، ہم کو اپنے اوپر اس لیے اعتماد نہیں ہے کہ ہماری قوت وحکومت کے ذرائع و وسائل نامحدود ہیں

بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ جہاں سے ہم قوت وقدرت حاصل کرتے ہیں وہ ایک ایسی ہستی اور حقیقت ہے جو کبھی غلطی یا زیادتی نہیں کرتی۔ اس لیے جب تک ہم اس حقیقت یا ہستی کی پیروی کریں گے ناکامیاب نہیں رہ سکتے۔ اقبال نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

مرگ را ساماں ز قطع آرزو ست
زندگانی محکم از لاتقنطُوا ست

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لاتحزن بگیر

چوں کلیمے سوے فرعونے رَود
قلب او از لاتخف محکم شود

بیم غیراللہ عمل را دشمن ست
کاروانِ زندگی را رہزن ست

بیم چوں بندست اندر پاے ما
ورنہ صد سیل ست در دریاے ما

ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم ست اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف میگیرد فروغ

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اسلام سے پہلے، انسانی ذہن وفکر کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جسے آج ہم علم وتہذیب کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں، انسان موجودات فطرت کی پرستش کرتا تھا اس لیے وہ کبھی اس پر جری نہ ہوسکا کہ ان کو اپنا تابع اور مسخّر بنائے چاند، سورج، برق وباراں، پہاڑ، دریائیں غرض کہ اس قسم کی تمام چیزیں اس کے نزدیک معبود کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ان کا کسی طور پر تجزیہ کرتا یا ان پر قدرت حاصل کرنے کی

جرات کرتا اس سے ترقی کر کے انسان نے انسان کی پرستش شروع کی، اس کی مختلف صورتیں تھیں، کبھی اس نے اپنی ہی نوع کو مذہبی حیثیت سے قادر مطلق گردانا اور کبھی کسی جابر قہرمان کے آگے جھکا، اس کا ایک نہایت دل نشین خاکہ رموز بے خودی میں اقبال نے یوں پیش کیا ہے:

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابودمند و زیر دست

سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش
بند ہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشت خراب او نوشت

در کلیسا اسقف رضواں فروش
بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

ایک دوسرے مقام پر اس کا اعادہ یوں کیا ہے:

فکر انساں بت پرستے بتگرے
ہر زماں در جستجوے پیکرے

باز طرح آزری انداخت ست
تازہ تر پروردگارے ساخت ست

کاید از خوں ریختن اندر طرب

نام او رنگ ست و ہم ملک و نسب

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو دنیا کو تفویض کی وہ یہ ہے کہ ہر انسان علم و عمل کے لیے آزاد ہے اس طور پر بقول اقبال اسلام کو ایک وسیع علمی تحریک قرار دینا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کو اسلام سے قبل طرح طرح سے مستور رکھا گیا۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے اس حقیقت کو فطری ہی طور پر برافگندہ نقاب بھی کیا، اس نے محض ایک مقولہ نہیں پیش کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ نمونہ بھی دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ بھی اس سہل اور سادہ انداز سے کہ معمولی سے معمولی عقل و تمیز بھی اس سے پوری طور پر آشنا ہو سکی۔ اسلام کے خدا نے اسلام کا محض اپنے کلام و الہام سے اعلان نہیں کیا بلکہ اس کو جناب رسالت مآبؐ کی ذات میں ثابت بھی کر دیا۔ رسالت مآبؐ کے وجود و حیات سے نہ صرف یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کیا ہے بلکہ انسان کو کیا کرنا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی سکتا ہے، نظر برآں رسالت مآبؐ کی زندگی کو خدا سے وہی نسبت حاصل ہے جو انسانوں کو رسالت مآب سے حاصل ہے۔ اس لیے جہاں تک علم و عمل کا دخل ہے رسالت مآب کی زندگی ہم انسانوں کے لیے خدا کی ذات و صفات سے زیادہ قریب، زیادہ قابل تقلید اور زیادہ ممکن العمل ہے ممکن ہے اسی عقیدے کا اظہار اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہو:

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوت قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی

رسالت مآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل اپنے نمونہء زندگی سے پیش کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''حریت'' ''مساوات'' و ''اخوت بنی نوع انسان'' کی بنیاد اس کا نمونہ اور اس کا مقصود ''رسالت محمدیہ'' تھی، عالم انسان کی نجات ان ہی ہر سہ حقیقتوں کی تشکیل و تعمیم میں مضمر ہے۔ حریت نے ہر انسان کو انفرادی طور پر آزاد کیا، مساوات نے ان سب کو باعتبار فطرت ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو جس نے دنیا کے لیے باعث رحمت و عافیت بنایا وہ ''اخوت بنی نوع انسان'' تھی۔ اسلام کے اصطلاحی اور محدود مفہوم سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان صفات کے اعتبار سے اسلام زمان و مکان دونوں کی قید سے آزاد ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو جس کی بنا پر اقبال کی زبان پر آیا ہو۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد

بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

خدمت ساقی گری باما گذاشت
داد مارا آخریں جامے کہ داشت

حریت مساوات اور اخوت کی بنا پر قومیت کا جغرافیائی مفہوم بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔''پین اسلامزم'' کا رمز ملک گیری میں نہیں بلکہ ''اخوت بنی نوع انسان'' میں مضمر ہے، ترکوں کا جدید رویہ جس کی بنا پر انھوں نے جمہوریہ ترکی کو''وطنیت ترکیہ'' پر قائم کیا ہے اس بناء پر صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے ترک یا ترکی اور اسلام کو دو مختلف حیثیتیں دے دی ہیں۔عزل خلافت سے انھوں نے اسلام کے مفہوم کو بھی مسخ کر دیا ہے۔خلافت کا کام یہ نہ تھا کہ اسلام کے دینی اقتدا کو دنیوی طاقت سے برقرار رکھا جائے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دنیوی اقتدار کو ان پابندیوں سے بے نیاز نہ ہونے دیا جائے جن سے آزاد ہو کر حکومت اور اس کی نعمتیں محض ایک ہی قوم اور ایک ہی خطہ تک محدود نہیں رہ جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے موجب آزار ہوتی ہیں۔حکومت ترکی نے وطنیت ترکیہ کے قائم کرنے میں یوں غلطی کی ہے کہ اس نے نہ صرف اسلام کی ہمہ گیری اور اس کے فیض عام کو ترکی تک محدود کر دیا اور شاید یہ بھی متیقن نہیں ہے۔ بلکہ ایک طور پر اس نے دوسرے اقوام کو بھی اسلام کی خوبیوں سے بے خبر رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔اسلام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں آیا بلکہ یہ دوسرے اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے بھی ایک پیام عمل و عافیت ہے، اسلام صرف اسلامیوں کے لیے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لیے ایک عام تبلیغ عمل ہے جس کو کسی صورت میں محدود نہیں کرنا چاہیے۔ملت اسلامیہ زمان و مکان دونوں قیود سے آزاد ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں نسل و ملک کا کوئی مفہوم نہیں:

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفال جام ماست
رومی و شامی گلِ اندام ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست

مرز بوم او بجز اسلام نیست

مسلم استی دل بہ اقلیمے مبند

گم مشو اندر جہان چون و چند

می نگنجد مسلم اندر مرز بوم

در دل او یاوہ گردد شام و روم

عقدۂ قومیت مسلم کشود

از وطن آقاے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملت گیتی نورد

بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد

ہجرت آئین حیات مسلم ست

ایں ز اسباب ثبات مسلم ست

صورت ماہی بہ بحر آباد شو

یعنی از قید مقام آزاد شو

آں چناں قطع اخوت کردہ اند

بروطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن را شمع محفل ساختند

نوع انساں را قبائل ساختند

مردمی اندر جہاں افسانہ شد

آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند

آدمیت گم شد و اقوام ماند

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت
ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت
قصہ دینِ مسیحائی فسرد
شعلہ شمع کلیسائی فسرد

بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است
دوشہا خوں گشت و فردا باقی است

در سفر یار است و صحبت قائم است
فرد رہ گیر است و ملت قائم است

فرد بر می خیزد از مشت گلے
قوم زاید از دلِ صاحبدلے

گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد
از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد

امتِ مسلم ز آیاتِ خدا ست
اصلش از ہنگامہ قَالُوْا بَلٰی ست

از اجل ایں قوم بے پروا ستے
استوار از نَحنُ نَزّلْنَا ستے

سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
زاں تو آئینِ کہن پندار پرس

آتش تاتاریاں گلزار کیست؟
شعلہ ہائے او گلِ دستار کیست؟

رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشہ ساسانیاں درخوں نشست
رونق خمخانہ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند

درجہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بود ست و ہست

ملت کی بنیاد اختلاط افراد پر ہے لیکن خود ملت کی شیرازہ بندی کے لیے بھی کسی آئین یا دستور کا وجود لازمی ہے۔ ایک ایسی ملت کے لیے جو تمام عالم کے لیے ابدالآباد تک ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو ضروری ہے کہ اس کا آئین بھی اتنا ہی ہمہ گیر اور لازوال ہو، جیسا کہ اس سے پہلے کہیں آچکا ہے۔ افراد اور ملت دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا پذیر ہیں لیکن مقصد حقیقی ان اسالیب عمل سے بلند و پائندہ تر ہوتا ہے، جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

فصل گل از نسترن باقی تر ست
از گل و سرو سمن باقی تر ست

کان گوہر پروری گوہر گرے
کم نہ گرد و از شکست گوہرے

ملّتِ اسلامیہ کا آئین قرآن مبین ہے۔ اقبال نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے:

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستی
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستی

در گلوے مانفس موج ہوا ست
چوں ہوا پابند نے گردد نواست

تو ہمیں دانی کہ آئین تو چیست؟
زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال ست و قدیم

حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رَحمة لّلعَالَمِیْن

آنکہ دوش کوہ بارش برنتافت
سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

بنگر آں سرمایہ آمال ما
گنجد اندر سینہ اطفال ما

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اسی سلسلے میں اقبال نے ایک نہایت نازک لیکن اتنا ہی معرکہ آرا مسئلہ بھی پیش کیا ہے جس پر اس زمانہ میں صبر و ایمانداری کے ساتھ غور کرنا اتنا ہی ممکن معلوم ہوتا ہے جتنا یہ ضروری بھی ہے، یعنی زمانہ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔

آج بیرونی اثرات کے سیلاب اور مذہبی ناواقفیت (جس میں علم و عمل دونوں کا فقدان ہے) نے ہر شخص کو اس پر جری کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم پر نظر ثانی کرے۔ کسی مسئلے پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالنا قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ آج اجتہاد کے علم بردار کہے جاتے ہیں اُن کے میلانات ذہنی یا استعداد علم و عمل کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل تو تیں برسرکار نظر آئیں گی جن کے موجود ہوتے ہوئے یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ ان نام نہاد اجتہادیوں کا طرز عمل صحیح نہیں ہے:

۱۔ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب ہر حال میں مفید اور قابل تقلید ہے۔ اس وقت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تہذیب یورپ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین جو یورپین تہذیب اور خیالات سے باخبر کہے جاسکتے ہیں یا کہے جاتے ہیں، اپنے سامنے یہ حقیقت رکھ کر آگے بڑھتے ہیں کہ جو کچھ اس وقت یورپ میں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مفید اور بہتر

خیال کیا جاتا ہے وہ اسلام کی تاریخ اور تہذیب سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اصول غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔

۲۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام کے بعض اصول کو کسی طور پر کمزور یا قابل اصلاح سمجھتے ہیں وہ خود اپنے علم و عمل کے اعتبار سے جامع نہیں کہے جا سکتے۔ جب تک اسلام اور مغربی اصول دونوں کا صحیح اور مکمل تجربہ نہ ہو اس وقت تک کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ یورپ کو اس وقت ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے اس کو وہ سب فطری سہولتیں حاصل ہیں جو اس کے تہذیب و تمدن کو مقبول بنا سکتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں خالص اسلامی شریعت نافذ ہے وہاں اسلامی اصول کا نفاذ کہاں تک مفید یا مکمل ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو افغانستان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بعض حضرات ترکی کی مثال پیش کرنا زیادہ اہم سمجھیں گے۔ اب تک ترکوں یا کمالیوں کا اس بارۂ خاص میں جو رویہ رہا ہے۔ اسے ملحوظ رکھتے ہوئے بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت صحیح معنوں میں سلطنت اسلامیہ نہیں ہے بلکہ محض سلطنت یا ''وطنیت ترکیہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی نے جو نیا ورق پلٹا ہے اس کا کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو جن اسباب یا واقعات کی بنا پر اس نے اتنا زبردست انقلاب روا رکھا ہے وہ اسلام یا خلافت کی کوتاہیوں یا زیادتیوں کے سبب سے نہ تھا بلکہ اس کی اصلی وجہ خلفائے عثمانیہ یا دولت عثمانیہ تھی۔

۴۔ انحطاط کے زمانہ میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنے نظروں میں ناقابل رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں، انسانی فطرت دشوار پسندی اور الولوالعزمی سے فطری طور پر کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کی بجائے فاتحین کی ہمرکابی و ہمنوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبال نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے:

عہد حاضر فتنہ ہا زیر سر است
طبع نا پروائے او آفت گر ست

بزم اقوام کہن برہم ازو
شاخسار زندگی بے نم ازو

جلوہ اش ما را زما بیگانہ کرد
ساز مارا از نوا بیگانہ کرد

از دل ما آتش دیرینہ برد
نور و نار لَا اِلٰہ از سینہ برد

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت ست
معنی تقلید ضبط ملت ست

اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط

ز اجتہاد عالمان کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

جس طور پر ہر عمل کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے خواہ یہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسی طور پر ملت اسلامیہ محمدی کا ایک نصب العین ہے اور وہ ''حفظ ونشر توحید'' ہے۔ افراد کو جو قوت جماعت کی شکل میں نمودار کرتی ہے۔ وہ کسی مخصوص مقصد کی تبلیغ یا تشکیل ہے اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور جماعت کبھی ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہو سکیں اس لیے ''جمعیت'' کا مدار کسی مخصوص نصب العین کی تعمیر و تعیم پر ہے لیکن ''حقیقی جمعیت'' اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب نصب العین بھی ہر طور پر مکمل و مستحسن ہو۔ اس عالم حیات کا اصلی راز تبلیغ توحید میں مضمر ہے اور چونکہ اسلام کو دین فطرت ہونے کا دعویٰ ہے اس لیے مقصد بھی اتنا ہی عالمگیر اور مقدس ہے:

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل
کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل

گردش خونے کے در رگہاے ماست
تیز از سعیِ حصول مدعا ست

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

نالہ ہا درکشت جاں کاریدہ است
تا نواے یک اذاں بالیدہ است

نقطہ ادوار عالم لَا الٰہ
انتہائے کار عالم لَا الٰہ

زانکہ در تکبیر راز بود تست
حفظ و نشر لَا اِلٰہ مقصود تست

جلوہ در تاریکیِ ایام کن
آنچہ برتو کامل آمد عام کن

لرزم از شرم تو چوں روز شمار
پرسدت آں آبروے روزگار

حرف حق از حضرت مابردۂ
پس چرا بادیگراں نہ سپردۂ

حیات انسانی کے تمام افعال و مشاغل باعتبار تعینات ہمیشہ متشکل ہوتے رہتے ہیں اور یہ محض اس لیے کہ مزید سعی و کوشش کے لیے ایک نمونہ سامنے ہو اور یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہر سعی و حرکت کس طور پر اور کہاں تک بارآور ہوئے اور جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے کیا وہ اس پایہ کی ہے کہ اس کے لیے مزید کوشش کی جائے یا اس کے قائم رکھنے میں مزید تگ و دو روا رکھی جائے۔ گویا ہر مزید کوشش ابتدائی کوشش کے لیے ایک سند جواز ہے۔ اس طور پر گویا زندگی کی یہ سعی پیہم ایک مقصد و مرکز کے لیے ہے۔ حیات ملّیہ کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ''مرکز محسوس'' ہو، ملت اسلامیہ کا مرکز ''بیت الحرام'' ہے، اقبال نے اس تفصیل و تخصیص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

در گرہ چوں دانہ دارد برگ و بر
چشم برخود واکند گردد شجر

خلعتے از آب و گل پیدا کند
دست و پاو چشم و دل پیدا کند

ہمچناں آئین میلاد امم
زندگی بر مرکزے آید بہم

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر ست
خط او در نقطۂ او مضمر ست

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دارِ راز ما بیت الحرام
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

دعویِ او را دلیل استیم ما
از براہین خلیلؑ استیم ما

در جہاں مارا بلند آوازہ کرد
باحدوث ما قدم شیرازہ کرد

تو ز پیوند حریمے زندۂ
تا طواف اوکنی پائندۂ

در جہاں جان امم جمعیت است
در نگر سر حرم جمعیت است

عبرتے اے مسلم روشن ضمیر
از مآل امت موسیٰؑ بگیر

داد چوں آں قوم مرکز راز دست
رشتہ جمعیت ملت شکست

آج یورپ کی جو چیز ہم کو سب سے زیادہ قابل رشک معلوم ہوتی ہے وہ اس کے فرزندوں کی ''تسخیر قوائے نظام عالم'' ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک قوائے نظام عالم کو مسخر کرنے کا تعلق ہے یورپ کی ترقی بہرنوع مہتم بالشان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس حقیقت سے آشنا ہیں یا آشنا ہونا پسند کرتے ہیں کہ جو ترقیاں علم وعمل کی آج نظر آرہی ہیں ان کی آج سے بہت پہلے مسلمانوں نے یورپ میں

ابتدا کی تھی۔ یورپ کو جو برکات مسلمانوں سے حاصل ہوئیں ان کے شمار کرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔اس کا اعتراف خود اہل یورپ کر چکے ہیں مسلمان اکثر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ وہ عام عالم اسلام پر اس وقت جو انحطاط رونما پاتے ہیں وہ اسلام کے اساسی تعلیمات کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اس کا باعث مسلمان خود ہیں۔مسلمانوں سے پہلے یہ تعلیم کسی مذہب نے نہیں دی ہے کہ یہ سورج، چاند،ستارے، پہاڑ، دریائیں آبشار، برق و باد پرستش کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کے تابع کئے گئے ہیں اور وہ اس کے ذہن و فکر اور قوت عمل کی مختلف وسیع جولا نگاہیں ہیں۔اسلام تو ایک شریعت عمل تھا ہم نے اس کو یا تو متکلمین و معتزلہ کی ورزش دماغی سمجھ لیا یا پھر جاہل مولویوں یا واعظوں کا وسیلہ رزق۔قوائے عالم کی تسخیر ڈرائینگ روم کی لطیف معصیتوں یا تکفیر کے فتووں سے نہیں کی جاسکتی اس کے لیے ضرورت تھی محنت اور قربانی کی جس سے ہم آج بھی بہت دور ہیں۔ ہم تو دوسروں کے ثمرۂ محنت سے مستفید ہونا ہی اپنا ایک بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم کو محض ''راہ نجات'' یا ''بہشتی زیور'' کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک ایک زندہ جاوید پیغام عمل ہے جس سے منحرف رہ کر مسلمان ہی نہیں کوئی قوم دنیا میں زندہ یا کامیاب نہیں رہ سکتی۔حیات ملیہ اسلامیہ کا مقصد اسرار حیات کو اس طور پر براقگندہ نقاب کرنا ہے کہ دنیا میں امن و کامرانی کے امکانات وسیع ہوتے رہیں۔اس لیے حیاتِ ملّی کے لیے لازم ہے کہ اس کا مقصد عین تسخیر قوائے نظام عالم ہو۔اقبال نے اس کی تبلیغ یوں کی ہے:

اے کہ با نادیدہ پیماں بستۂ
ہمچو سیل از قید ساحل رستۂ

چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز
دل بغائب بند و حاضر ستیز

ماسوا از بہر تسخیر است و بس
سینہ او عرضہ تیر است و بس

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

کوہ و صحرا، دشت و دریا بحر و بر
تختۂ تعلیم ارباب نظر

نائب حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

آنکہ بر اشیا کمند انداخت ست
مرکب از برق و حرارت ساخت ست

علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصار آدم است

جس طور پر افراد کے لیے استحکام خودی ضروری ہے اسی طور پر حیات ملیہ کے لیے بھی ''احساس خودی'' لازمی ہے۔ جہاں تک ان اصول وعقائد کا تعلق ہے جن کے حفظ، تعمیم وتشکیل کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے یہ بحث اس سے پہلے آ چکی ہے کہ ہماری حیات کا مقصد اور اس کا دارومدار لا اِلہ پر ہے لیکن امت کو جو نسبت رسول سے حاصل ہے وہ کئی حیثیت سے اہم ہے۔

خدا نے بعثت نبوی میں سب سے بڑا راز یہ رکھا ہے کہ وہ جو کچھ ہم بندوں سے کرانا چاہتا ہے اس کا ہم بندوں ہی میں سے نمونہ بھی پیش کر دیتا ہے تا کہ ہم اس کو اپنے لیے محض ایک آسمانی کرشمہ نہ سمجھیں جو بندوں کی فہم وادراک یا ان کے سعی عمل سے بالا ہو۔ بلکہ ایک ممکن العمل حقیقت تصور کریں۔ ٹھیک اسی طور پر ملت کی ترقی و بقا کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم محض عقائد مجردہ کی علم برداری کرتے رہیں بلکہ ان روایات کا احترام کریں اور اس کو برقرار رکھیں جو ہمارے برگزیدہ اسلاف نے اپنے عمل سے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں اقبال نے اس کی تفصیل وتوضیح ایک نوزائیدہ بچے سے کی ہے جو ابتداً ہر شے سے ناآشنا ہوتا ہے اور جس کا:

بستہ با امروز او فرداش نیست
حلقہ ہاے روز و شب در پاش نیست

چشم ہستی را مثال مردم ست
غیر را بینندہ و از خود گم ست

رفتہ رفتہ:

صد گرہ از رشتہ خود وا کند
تا سر تار خودی پیدا کند

گرم چوں افتد بکار روزگار
ایں شعور تازہ گردد پایدار

نقشہا بردار و اندازد او
سرگذشت خویش رامی سازد او

اسی طور پر:

قوم روشن از سواد سرگذشت
خود شناس آمد زیادِ سرگذشت

سرگذشت او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود

چشم پرکارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفسہاے رمیدہ زندہ شو

سر زند از ماضیِ تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن از خواہی حیات لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موج ادراک تسلسل زندگی است
می کشاں را شور قلقل زندگی است

موجودہ زمانہ میں ہر حقیقت کی سند جواز یا عدم جواز یورپ سے حاصل کی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یورپ کے اصول یا اس کے فیصلے نقائص یا غلطیوں سے مبرا ہوتے ہیں۔ بلکہ آج وہ فاتح کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے حواریین کو ممتاز اور مخالفین کو سرنگوں کرنے کے قابل ہے، ہم آج یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا خوبیاں ہیں بلکہ یورپ کے بعض صریح نقائص کو بھی چاہتے ہیں کسی طور پر مستحسن ثابت کرسکیں قطع نظر دیگر

مسائل کے جن کو معرض بحث میں لانا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ایک مسئلہ خواتین کی تعلیم حقوق اور آزادی کا ہے، یہاں اس سے بحث نہیں کہ یورپ نے عورتوں کو کیا سمجھ یا بنا رکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا جو درجہ مقرر کیا ہے وہ ہماری نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔تعداد ازدواج، پردہ اور اس قسم کی اور چیزیں ہم روشن خیالوں کے لیے نہایت روح فرسا ہیں اور مغرب کے لیے جب ''حلف وفاداری'' اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر عورت ہی پر پڑتی ہے اس کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اگر مذہب بھی زد میں آجائے۔ نام نہاد روشن خیال طبقہ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے یا ان کی میلانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر ایک کی نظر صرف دو نقائص پر پڑتی ہے، ایک مذہب دوسری عورت۔لیکن لطف، عبرت یا تعجب یہ ہے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو مشرق بالخصوص اسلام کے امتیازات خصوصی ہیں، اسلام نے عورت (بالفاظ دیگر امومت) کو کیا درجہ دیا ہے۔ اقبال کے حسب ذیل خیالات سے ظاہر ہوگا:

پوشش عریانی مرداں زن ست
حسن دل جو عشق را پیراہن ست

آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود باطیب و صلوٰۃ

ملت از تکریم ارحام ست و بس
ورنہ کار زندگی خام ست و بس

بردمد ایں لالہ زار ممکنات
از خیابان ریاض امہات

حافظ رمز اخوت مادراں
قوت قرآن و ملت مادراں

اقبال نے نساءِ اسلام کے لیے سیدۃ النسآءؑ کو ''اسوہ کاملہ'' قرار دیا ہے:

نور چشم رحمتہ للعالمین
آں امام اولین و آخریں

بانوے آں تاجدار ھل اتی

مرتضٰی مشکل کشا شیر خدا

مادر آں مرکز پر کار عشق
مادر آں کارواں سالار عشق

مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لب قرآں سرا

مثنوی کے اس حصے کو اقبال نے انتہائے جوش عقیدت سے لکھا ہے جس کے ایک ایک حرف سے والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے موجودہ زمانہ میں تہذیب و شائستگی کے نام سے پیکر ناموس و عفت کے ساتھ جیسا کچھ سلوک روا رکھا جا رہا ہے، اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

اے ردایت پردۂ ناموس ما
تاب تو سرمایہ فانوس ما

اے امین نعمت آئین حق
در نفسہائے تو سوز دین حق

دور حاضر تر فروش و پرفن ست
کاروانش نقد دیں را رہزن ست

کور و یزداں ناشناس ادراک او
ناکساں زنجیری پیچاک او

چشم او بیباک و نا پرواستے
پنجۂ مژگان او گیراستے

ہوشیار از دست برد روزگار
گیر فرزندان خود را درکنار

این چمن زاداں کہ پر نکشادہ اند
ز آشیان خویش دور افتادہ اند

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہراؓ بلند

تا حسینؓ شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

خاتمہ مثنوی پر اقبال نے سورۂ اخلاص (قل ھو اللّٰہ) کی تفسیر دی ہے اور اسے ''خلاصہ مطالب مثنوی'' قرار دیا ہے۔''ھو اللّٰہ احد'' کا پیغام حضرت صدیقؓ کے زبان مبارک سے یوں دیا ہے:

آں کہ نام تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوے یکی آوردہ است

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ
واے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

صد ملل از ملتے انگیختی
بر حصار خود شبیخوں ریختی

یک شود توحید را مشہود دکن
غائبش را از عمل موجود کن

اسی طور پر دیگر آیات شریفہ کی ترجمانی کی ہے:

گر بہ اللّٰہ الصمد دل بستۂ
از حد اسباب بیروں جستۂ
بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردش دولاب نیست

راہ دشوارست ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر

خود بخود گردد در میخانہ باز
برتہی پیمانگان بے نیاز

فارغ از اب و ام و اعمام باش
ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

گر نسب را جزو ملت کردۂ
رخنہ درکار اخوت کردۂ

رشتۂ ما یک تولایش بس ست
چشم مارا کیف صہبایش ست

ہر کہ پادر بند اقلیم وجدست
بے خبر از لم یلد لم یولد ست

رشتۂ با لم یکن باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی

آں کہ ذاتش واحد ست و لاشریک
بندہ اش ہم در نہ سازد باشریک

مومن بالاے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی

آخر میں اقبال نے ''رحمۃ للعالمین'' کے حضور میں ''عرض حال'' کیا ہے:

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
در جہاں شمع حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

مسلم از سرِ نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل
ہر یکے دارد دبتے اندر بغل

اے کہ از احسان تو ناکس کس ست
یک دعایت مزد گفتارم بس ست

عرض کن پیشِ خدائے عزوجل
عشق من گردد ہم آغوش عمل

ہست شان رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

تا بیاساید دل بے تاب من
بستگی پیدا کند سیماب من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

(آثار اقبال، مرتّبہ: غلام دستگیر، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء)

❀...❀...❀
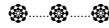
علامہ اقبال کا فلسفۂ بیخودی

مولانا عبدالسلام ندوی

ڈاکٹر علامہ اقبال سے پہلے خودی اور بے خودی میں باہم کوئی ربط و علاقہ نہ تھا، اس لیے دونوں نامکمل تھے۔ نٹشے کے یہاں ''انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور غیر مبہم سا رہ جاتا ہے۔'' لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ خودی نہایت ناقص ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس کے برعکس صوفیا انفرادی خودی کو خدا کی ذات میں بالکل فنا کر دینے کی تعلیم دیتے تھے اور اس غرض سے وہ انفرادی خودی کو قطرہ سے اور خدا کو دریا سے تشبیہ دیتے تھے، جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح قطرہ دریا سے مل کر بالکل فنا ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کو اپنی خودی خدا کی ذات میں فنا کر دینی چاہیے لیکن ڈاکٹر صاحب اس کی مخالفت کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر قطرہ دریا میں جا کر موتی نہ بنا اور بالکل فنا تو یہ سراسر اس کا نقصان ہے کہ اپنی گرہ کا مال بھی گیا اور کچھ حاصل بھی نہ ہوا:

ز خود گذشتۂ اے قطرۂ محال اندیش　　　شدن بہ بحر و گہر بر نخاستن ننگ است

اس لیے وہ قطرہ کو ایک دریا میں جانے کی تعلیم دیتے ہیں جس میں ابھرنے اور ڈوبنے دونوں حالتوں میں خودی اور بھی نمایاں ہوتی ہے:

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر　　　کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر　　　مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

لیکن یہ دریا خدا کی ذات نہیں جیسا کہ صوفیا کا خیال ہے بلکہ قوم و ملت کا وجود ہے اور اسی دریا میں ڈوب کر افراد انسانی دریا کے اندرونی خزانہ سے مالا مال ہو سکتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص　　　کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

اس بحر بیکنار میں ڈوب پر جب افراد اپنی خودی کا بالکل فنا کر دیتے ہیں تو وہ گوہرِ مقصود ہاتھ آ جاتا ہے جس کو قومی خودی کہتے ہیں:

مسلمانی غم دل در خریدن   چو سیماب از تپ یاراں تپیدن
حضورِ ملت از خود در گذشتن   دگر بانگِ انا الملت کشیدن

اسی بنا پر ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ:

خودی از بے خودی آید پدیدار

اور اب یہ قومی خودی اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لیے جائز ہو جاتا ہے:

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست   سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ   اگر قومے بگوید ناروا نیست

اسی بے خودی یا فردِ ملت کے باہمی ربط کو ڈاکٹر صاحب نے مختلف شاعرانہ تمثیلات سے سمجھایا ہے مثلاً:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ   ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے   کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور   خالی ہے جیب گلِ زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور   رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو   نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ   پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے   کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے
محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی   عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو! آے آسماں کے تارو!   تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے   رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں   شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمھاری

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے   وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

حسنِ ازل سے پیدا تاروں بھری فضا سے   جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیزگام ایسا　　قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم　　داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے　　جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے　　پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
برگ سبزے کز نہالِ خویش ریخت　　از بہاراں تارِ امیدش شکست
مردمان خوگر بیک دیگر شوند　　سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
محفلِ انجم ز جذبِ باہم است　　ہستیِ کوکب ز کوکب محکم است

انفرادی حالت میں خودی بالکل خودمختار، مطلق العنان اور سراپا غرور ہوتی ہے لیکن جماعت میں شامل ہوکر یہ تمام اخلاقِ رذیلہ بدل جاتے ہیں اور ان کے بجائے باہمی لطف و محبت کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے:

جبر قطعِ اختیارش میکند　　از محبت مایۂ دارش میکند
ناز تا ناز است کم خیزد نیاز　　ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز
در جماعت خود شکن گردد خودی　　تاز گلبرگے چمن گردد خودی

لیکن سوال یہ ہے کہ فرد و جماعت کے باہمی ربط کا وہ اصول جس سے عداوت کے بجائے محبت اور ناز کے بجائے نیاز پیدا ہو، کیا ہے؟ یورپ نے اس کے متعلق جو اصول قائم کیے تھے، وہ سب کے سب سیاسی، معاشی اور وطنی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان سے محبت کے بجائے عداوت اور نیاز پیدا ہوتا تھا۔ انقلابِ فرانس جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں شروع ہوا تھا، فرد کی آزادی کا علمبردار تھا، لیکن جب مشینی ترقی کے سیلاب نے دولت اور ذخائر دولت کو چند افراد کی ملکیت بنانا شروع کیا اور سرمایہ داروں نے شہنشاہیت کے ساتھ ساز باز کرکے پوری دنیا کو چند افراد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو فرد کی آزادی کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اور اس بغاوت نے ایک طرف تو مارکس کی بین الاقوامی اشتراکیت کو پیدا کیا اور دوسری طرف میکیاولی کے قومی اتحاد کے تصور کو رفتہ رفتہ جرمنی کی قومی اشتراکیت (نیشنل سوشلزم) اور اٹلی کی فسطائیت (فاشزم) کے روپ میں جلوہ گر کیا، جس کا فرد کو جماعت پر قربان کردینا سب سے پہلا اصول ہے۔

غرض جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا دماغ غور و فکر کے مراحل طے کررہا تھا، یورپ میں فرد و ملت

کی بحثیں شروع ہوگئی تھیں۔ اگر چہ اس مسئلہ کے متعلق اب تک مفکرین مختلف الرائے ہیں، تاہم اتنا طے ہو چکا ہے کہ فرد کو شترِ بے مہار کی طرح بالکل آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا، لیکن جہاں فسطائیت و اشتراکیت میں فرد کی آزادی کو بالکل نظرانداز کر دینے پر اصرار کیا جاتا ہے وہاں جمہوریت میں فرد و ملت کی آزادیوں کے درمیاں ایک قسم کی مفاہمت کرانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بہرحال یہ تمام اصول سیاسی، معاشی اور وطنی ہیں اور دنیا میں اس وقت جو قیامت خیز ہنگامے برپا ہیں، ان سب کو انھی اصولوں نے پیدا کیا ہے اور اس بنا پر پیدا کیا ہے کہ ان کی بنیاد مادیت پر ہے، روحانیت پر نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفۂ بےخودی کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر ان تمام جھگڑوں کو ختم کرنا چاہا ہے اور یہی وہ اصولی فرق ہے جو ان کے فلسفۂ فرد و ملت کو یورپ کی جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور قومی اشتراکیت جیسے فلسفوں سے بالکل علیحدہ کر دیتا ہے اور افراد کا یہ روحانی ربط ایک ایسی ملت پیدا کر دیتا ہے جس کے حدود قوم و نسل رنگ و نسب یا وطن و مرز بوم کی رائج الوقت اصطلاحوں سے متعین نہیں ہوتے بلکہ روحانی افکار و خیالات سے اس کی حد بندی ہوتی ہے۔ اس لیے اجتماعیت اور انفرادیت کی جو کشمکش دولت و ذخائر دولت کے محدود ہونے کی وجہ سے یورپ میں نظر آتی ہے، وہ ان کے فلسفہ میں نابود ہے۔

(عبدالسلام ندوی ـــ اقبال کامل)
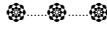
مقدمہ شرح رموزِ بیخودی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مثنوی رموزِ بیخودی جب ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ تو اس کے ساتھ حضرت علامہ نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی شامل کر دیا تھا۔ جسے دوسرے اڈیشن میں حذف کر دیا تھا۔ چونکہ اس میں علامہ نے اس مثنوی کے مقاصد کی تشریح کی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی کو درج کرتا ہوں:

یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعینِ عمل و ذوق، حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشو ونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل واقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تبائن وتناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہوجائے۔[1]

افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل واستحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حسیات واعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ وقائم رکھتی ہے۔

علم الحیات وعمرانیات کے اسی نکتے کو مدِنظر رکھ کر مَیں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا وعناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص[2] الہیّت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط ومحکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آچکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔[3]

مثنوی کے مباحث پر ایک نظر

اس مثنوی کا مقصد تو علامہ کے ارشادات سے بالکل واضح ہو گیا، چنانچہ اس پر مزید حاشیہ آرائی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے مباحث پر اجمالی تبصرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اس مثنوی کے مباحث عالیہ پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ علامہ نے اس میں اسلام کے دستور العمل کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی اس کے مطالعہ سے ہر شخص اسلام کے بنیادی افکار، اُصول اور ارکان سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور جو نقش اس کے مطالعہ سے دماغ میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دینِ اسلام بلاشبہ ایک مخصوص ہیئتِ اجتماعیہٗ انسانیہ کا نام ہے، اس لیے وہ دنیا کے کسی نظام حیات یا دستور العمل سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اسلامی دستور العمل ایک عضوی کل کا حکم رکھتا ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کر کے ملتِ اسلامیہ میں شامل رہ سکے۔ اس دستور العمل کے اُصول اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر ایک اصل کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جس طرح مشین کا ایک پرزہ اگر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو پوری مشین بیکار ہو جائے گی۔ مثلاً

(۱)　اگر آپ ختمِ نبوت کے عقیدہ سے دستبردار ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ کہ میں آخری کتاب ہوں باطل ہو جائے گا۔

(۲)　اگر آپ مساوات کے عقیدہ کا انکار کر دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے اسود اور احمر، سرمایہ دار اور مزدور کے امتیاز کو اسلامی نظام میں داخل کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" کی تعلیم باطل ہو جائے گی۔

(۳)　اگر آپ سود کو جائز کر دیں تو قرآن کا تمام معاشی نظام زیر و زبر ہو جائے گا۔

(۴)　اگر آپ ملوکیت کو تسلیم کر لیں تو توحیدِ الٰہی کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

(۵)　اگر آپ یہ تسلی کر لیں کہ صداقت، قرآنِ حکیم سے باہر بھی پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے تو تبلیغ و اشاعت اسلام کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی حیات کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

(۶)　اگر آپ سیاست کو دین سے جدا کر دیں تو دین کی حیثیت سے اسلام بالکل ختم ہو جائے گا، محض پوجا پاٹ کا نام رہ جائے گا۔

(۷)　اگر آپ زندگی کے کسی ایک شعبے میں بھی دنیا کے کسی آدمی کو اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو آنحضرتؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ ان چند مثالوں سے میرا مطلب ناظرین پر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام کا ایک کامل اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے علاوہ تمام نظام باطل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ اعلان فرما دیا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (۳۳:۹)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تا کہ وہ اس کو تمام ادیان عالم پر غالب کر دے، اگر چہ یہ فعل مشرکوں کو تو ضرور ناگوار گزرے گا۔

اس آیت سے، جو اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہے، یہ بات بالکل روشن ہے کہ دینِ اسلام ساری دنیا کے خلاف چیلنج یا الٹی میٹم ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اس دین (دستور العمل) کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرے اور چونکہ یہ کام صرف اسی صورت سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اظہارِ دین کے لیے جدو جہد کریں اس لیے ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی بسر کرنا سیکھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ ''لا اسلام الا بالجماعة''، یعنی جماعت سے علیحدہ رہ کر کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور اقبال دونوں کی یہ تعلیم قرآن حکیم کی اس آیت سے مقتبس ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۱۰۳:۳)

اے مسلمانو! سب مل کر اللہ کی رسی (قرآنِ حکیم) کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اور اپنے آپ کو مختلف فرقوں میں تقسیم مت کرو۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جب تک سارے مسلمان قرآنِ حکیم پر جمع نہیں ہوں گے، وہ اس کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی متحدہ کوشش نہیں کر سکتے اور جب متحدہ کوشش نہیں ہوگی تو قرآنِ حکیم، ادیانِ عالم پر غالب کیسے آ سکتا ہے؟ چونکہ آج ہم مسلمان مختلف فرقوں میں منقسم ہو چکے ہیں، اس لیے قرآنِ حکیم کو دنیا میں شائع کرنے کے لیے نہ کوئی جماعت کوشش کر رہی ہے نہ کوئی حکومت، نہ کوئی مملکت۔ کیا یہ انتہائی افسوس کا مقام نہیں ہے کہ سعودی حکومت نے بھی قرآنِ حکیم کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی!

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رموزِ بیخودی میں اقبال نے قرآنِ حکیم کی اسی آیت شریفہ کی تفسیر کی ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

(۲)　　آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپؐ (اور آپؐ کے متبعین) اس دین (دستور العمل) کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دیں۔ یعنی تمام باطل ادیان کو دنیا سے مٹا دیں۔ تا کہ ساری دنیا دینِ حقّہ (اسلام) کی پیرو (مطیع) بن جائے اور ساری دنیا میں ایک ہی دستور العمل نافذ ہو جائے جس کا نام اسلام ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔ (۳:۱۹)

یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف اسلام ہی سچا دین (دستورِ حیات) ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ مسلمان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے پسندیدہ دین (دستور العمل) کو دنیا میں نافذ کر دیں۔

(ا)　یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب دوسرے ادیان مٹ جائیں۔

(ب) اور یہ اسی صورت سے ممکن ہے کہ سارے مسلمان مل کر دینِ اسلام کے غلبہ کے لیے جدوجہد کریں۔

(ج) اور متحدہ کوشش اسی وقت ہو سکتی ہے جب سارے مسلمان قرآنِ حکیم کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ یعنی قرآنِ حکیم پر جمع ہو جائیں۔

اس تصریح کے بعد اب ہم مثنوی کے مطالب کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

علامہ نے اس مثنوی کو کسی شخص سے منسوب کرنے کی بجائے ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ موجودہ صدی میں کسی مسلمان نے اس سے بہتر ہدیہ اپنی قوم کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔ تمہید میں علامہ مرحوم نے فرد و ملت کے ربط باہمی کو واضح کیا ہے۔ تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ پہلے باب میں اُنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ملت (قوم) افراد کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے باب میں اُنھوں نے ملتِ اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے پہلے رکن ''توحید'' کا بیان کیا ہے۔

تیسرے باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ عقیدۂ توحید، یاس و حزن و خوف اور دوسرے رُوحانی امراض کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اور اس نکتہ کو تیر و شمشیر اور حضرت عالمگیرؒ کی حکایت سے واضح کیا ہے۔

چوتھے باب میں اسلام کے دوسرے بنیادی رکن ''رسالت'' کی توضیح کی ہے۔

پانچویں باب میں یہ بتایا ہے کہ رسالتِ محمدیہؐ کی غایت یہ ہے کہ بنی آدم کو حریت، اخوت اور مساوات (اُصول سہ گانہ) کی دولت نصیب ہو جائے، اور ان اُصول سہ گانہ کا مفہوم تین تاریخی حکایات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔

چھٹے باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ملتِ محمدیہؐ چونکہ توحید اور رسالت پر مبنی ہے۔ اس لیے کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں ہے۔ اس نکتہ کو اُنھوں نے جداگانہ باب میں واضح کیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی

قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ توحید ہے۔

ساتویں باب میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ جس طرح اُمتِ محمدیہؐ مختص بالمکان نہیں ہے۔اسی طرح مختص بالزمان بھی نہیں ہے۔یعنی یہ ملت شریفہ قیامت تک باقی رہے گی۔

آٹھویں باب میں یہ بیان کیا ہے کہ قانون کے بغیر کسی قوم کا نظام صورت پذیر نہیں ہوسکتا،اور ملتِ محمدیہؐ کا قانون (ضابطہِ حیات) قرآن ہے۔

نویں باب میں یہ بتایا ہے کہ جب قوم کے اندر ذہنی اور عقلی اعتبار سے انحطاط رُونما ہو جائے تو اجتہاد کی بجائے تقلید زیادہ مناسب حال ہوتی ہے۔

دسویں باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قومی سیرت کی پختگی صرف شریعتِ الہیّہ کی پابندی سے ہوسکتی ہے۔

گیارہوں باب میں اس راز کو فاش کیا ہے کہ قومی سیرت میں دلکشی محض اتباعِ رسولؐ سے پیدا ہوسکتی ہے۔

بارہویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ قومی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مرکز محسوس کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مرکز بیت الحرام ہے۔

تیرہواں باب اس ساری کتاب کی جان ہے اور اس میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ حقیقی جمعیت اس وقت پیدا ہوسکتی ہے کہ قوم کا ہر فرد ملی نصب العین کے حصول میں منہمک ہو جائے اور امتِ محمدیہؐ کا نصب العین توحید الٰہی کی حفاظت اور اشاعت ہے۔

چودہویں باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی قوم، نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کر لے تو اُس کی قومی زندگی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

پندرہویں باب میں اس نکتہ کی صراحت کی ہے کہ حیاتِ ملی کا کمال یہ ہے کہ فرد کی طرح ملت میں بھی خودی کا احساس پیدا ہو جائے اور یہ احساس، ملی روایات کی حفاظت اور ان پر عامل ہونے سے پیدا ہوسکتا ہے۔

سولہویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ نوعِ انسانی کی بقا عورت کی ماں ہونے کی حیثیت پر موقوف ہے۔لہٰذا عورتوں اور خاص طور سے ماؤں کا احترام اسلام کی بنیاد ہے۔

سترہویں باب میں اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ مسلمان عورتوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

اٹھارہویں باب میں اقبال نے مسلمان عورتوں سے خطاب کیا ہے اور ان کو اسوۂ بتولؓ پر عامل ہونے کی تلقین کی ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے مثنوی کے مطالب کو سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے اور اس

میں شک نہیں کہ اس باب میں اُنھوں نے بہت ندرتِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی آیتوں کا مطلب بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ یہی رنگ اپنے اندر پیدا کرو۔

آخر میں اُنھوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں پہلے اپنا حال دل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد یہ درخواست کی ہے:

ہست　　شانِ　　رحمت　　گیتی　　نواز
آرزو　　دارم　　کہ　　میرم　　در　　حجاز

رموزِ بیخودی میں حضرت اقبال نے دنیا کو اس دستورِ حیات کے بنیادی اُصول سے آگاہ کیا ہے جسے قرآن کریم نے دینِ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دین بلا شبہ ادیان عالم میں عدیم المثال اور فقید النظیر ہے، لیکن اس دین کے پیرو بارہ سو سال سے اس کے پیش کردہ آئین سے بکلی منحرف ہو چکے ہیں اور گزشتہ تین چار سو سال سے تو یہ حالات ہے کہ اسلام وہ اسم ہے جس کا مسمّیٰ خارج میں کہیں موجود نہیں[۴] ہے، اس لیے اس کی بنیادی خصوصیات ایک ایک کر کے پردۂ خفا میں مستور ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی آئین کو خوبی صرف اس آئین پر عمل کرنے ہی کی بدولت اہلِ عالم پر آشکار ہو سکتی ہے۔

دراصل دینِ اسلام، جملہ ادیان و مذاہب عالم اور انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے تمام ضابطوں کے خلاف ایک زبردست چیلنج ہے، یعنی دعوتِ مبارزت ہے۔

چنانچہ قرآنِ حکیم کی آیت میرے دعویٰ پر شاہد ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (۸۱:۱۷)

اور آپؐ اعلان کر دیجیے کہ "الحق" آ گیا (اس کے آنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل مٹ جائے گا۔ بالفاظ دیگر باطل کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا) اور مٹ گیا۔ "الباطل" بلا شک باطل کی ذات میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مٹ جانے والا ہے یعنی حق کے مقابلہ میں اُسے کبھی ثبات و دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اس کے اقتضائے ذات کے خلاف ہے۔ میں نے یہ مفہوم عارف علوم ربّانی دانائے حقائقِ قرآنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مجدد دہلوی کے ترجمہ سے اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وبگوئید آمد دینِ حق و نابود شد دینِ باطل۔ ہر آئینہ باطل است نابود شوندہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے الحق کا ترجمہ دینِ حق کیا ہے اور دینِ حق صرف قرآنِ حکیم کے اندر محصور ہے۔ اس کے باہر کہیں دینِ حق نہیں ہے اور الباطل کا ترجمہ دینِ باطل کیا ہے یعنی دنیا کے تمام ادیانِ باطلہ۔ الحق کا مطلب یہ ہے کہ صرف قرآن ہی حق ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، سب باطل ہے۔[۵]

اس آیت شریفہ سے ثابت ہو گیا کہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ صداقت، ہدایت اور حق قرآنِ حکیم کے علاوہ اور کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر دینِ اسلام کے علاوہ اور تمام ادیان و مذاہب عالم باطل ہیں۔ اور یہی مطلب ہے قرآن حکیم کی ان آیتوں کا:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔ (۱۹:۳)

بلاشبہ خدا کے نزدیک دینِ معتبر صرف اسلام ہی ہے۔

وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَ ھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَo (۸۵:۳)

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی طلب کرے گا۔ وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اُس سے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ اسلام کے علاوہ اور کوئی دین، اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ دینِ اسلام اس وقت قرآنِ عزیز کے علاوہ اور کسی کتاب میں محفوظ نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مقدس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَo (۹:۱۵)

بے شک ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دینِ اسلام صاف اور صریح لفظوں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ صداقت اور ہدایت اس وقت قرآن کے علاوہ اور کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ کسی نظامِ اخلاق میں نہیں ہے اور کسی ہیئتِ اجتماعیہ میں نہیں ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔ کہ کیا دوسرے لفظوں میں یہ ساری دنیا کو چیلنج نہیں ہے؟

دینِ اسلام کی تمام خصوصیات کی تفصیل تو اس تمہید میں ناممکن ہے۔ اس لیے صرف ایک خصوصیت کے بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ دنیا میں جس قدر مذاہب ہیں وہ سب انسان کی اخروی نجات کا بندو بست کرنے کے مدعی ہیں، دنیاوی زندگی کے لیے کوئی ضابطہ یا دستور العمل پیش نہیں کرتے۔ لیکن دینِ اسلام ایک مکمل دستورِ حیات ہے یعنی وہ ایک اخلاقی نصب العین بھی ہے اور ایک نظام سیاست و معاشرت بھی ہے چنانچہ فرد اور جماعت کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی گرفت میں آزاد نہیں ہے اور جہاں تک بنیادی اُصول کا تعلق ہے، اسلام کسی نظام سے مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام مذہبوں اور اخلاقی نظاموں کو مٹا کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان زندگی کے کسی شعبہ میں بھی کسی دوسرے شخص کی رہنمائی قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وفاداری کا آخری مرجع صرف قرآنِ حکیم اور سنتِ رسولؐ ہے۔

چونکہ دین اسلام زندگی کا ایک مکمل ضابطہ ہے اس لیے وہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان ایک سلک میں منسلک ہو جائیں اس مقصد کے لیے اس نے ایسا حیرت انگیز ضابطہ نافذ کیا ہے کہ دنیا کے کسی قدیم یا جدید مذہب یا نظامِ فکر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔یعنی اس نے ساری دنیا کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(ا) جو لوگ سرکارِ مدینہ ﷺ کی غلامی اختیار کر لیں وہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہیں۔خواہ وہ کالے ہو یا گورے اور چینی ہوں یا جاپانی۔

(ب) جو لوگ حضورِ انور ﷺ کی غلامی سے انکار کریں وہ سب ملتِ کفر کے افراد قرار دیے جائیں گے۔ الکفر ملة واحدة یعنی دینِ اسلام کی رو سے مسلمانِ عالم کی بنیاد، نہ وطن ہے نہ رنگ نہ نسب ہے نہ زبان، بلکہ عقیدۂ توحید ہے۔ چونکہ یہ تعلیم دینِ اسلام کو تمام مذاہبِ عالم سے متمیز کر دیتی ہے۔اور نظریہ قومیت و وطنیت اسلام کے بنیادی اُصول کی بیخکنی کر دیتا ہے۔اس لیے علامہ اقبال نے ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک یعنی ساری عمر اس غیر اسلامی نظریہ کے خلاف جہاد کیا۔ چنانچہ ارمغان میں لکھتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرار جاں من
بدورِ فتنۂ عصر کہن او — بدورِ فتنۂ عصر رواں من

رموزِ بیخودی کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ اسلام، دیگر مذاہب کی طرح محض پوجا پاٹ کا نام نہیں ہے یا فرد کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے۔اس لیے کوئی مسلمان ملت سے جدا ہو کر اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔اور جب یہ ممکن نہیں تو وہ اپنی خودی کو بھی مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔

اب میں خود علامہ کی تحریروں سے اس نکتہ کو واضح کرتا ہوں۔تا کہ ناظرین کے دلوں پر اس کی اہمیت نقش ہو جائے۔

> جس طرح نوعِ انسان کی مجموعی ترقی کے لیے مختلف اقوام کا نیست و نابود ہو جانا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ کسی قوم کے ارتقا کے لیے کئی افراد نذرِ اجل ہو جائیں یا قوم کے نشوونما کی خاطر ان کے ذاتی حقوق کی پرواہ نہ کی جائے۔لیکن یہاں ایک عجیب اور مشکل سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ ہے کہ جس صورت میں کسی خاص فرد کو قوم کی آئندہ نسلوں کی بہبودی، ان کی عظمت و جلال اور ان کی عقلی اور تمدنی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔تو کیوں اس کے ذاتی حقوق پر قومی ارتقا کو ترجیح دی جائے؟ کیا میں آج سے سو سال کے بعد زندہ ہوں گا؟ اگر نہیں تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے آپ کو قوم کے لیے قرباں کر دوں؟ اور اپنی نیند حرام کر کے قوم کی آئندہ بہبودی کے لیے بے خواب راتیں بسر کروں؟ اگرچہ اس سوال کا کوئی عقلی

جواب ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اس خطرناک شبہ کے وقت مذہب ہماری دستگیری کرتا ہے۔ اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایثار یعنی اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بنا پر عقلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ نیکی جو ارتقا نوعِ انسانی وقومی کے لیے بہت ضروری ہے، ایک فوق العادت اُصول پر مبنی ہے۔ آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اس کی حقیقی وقعت عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دار و مدار اس روحانی مشاہدہ پر ہے جو نبی کی غیر معمولی قوتوں کو حاصل ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی آواز میں وہ ربّانی سطوت اور جبروت پیدا ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از رسالہ مخزن بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء)

مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصلی اُصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن اور نہ اشتراک اغراض اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں، وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تمام مادّی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے، اور اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے، جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے، جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قومِ عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا، اس کی پولیٹیکل نشو و نما میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے سرانجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے۔ لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسی اُصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے؟ (ماخوذ از ملتِ بیضا پر عمرانی نظر)

اسلام کی حقیقت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اُصولِ اسلام سے پُوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی وطن ہے، جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہی نسبت اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اُصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں ''خدا کی رسی'' ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر نظر نہیں ڈال کر اغیار کے تمدن کو بلا مشارکتِ احدے اپنا

ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ اور یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبرالہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا۔ چنانچہ وہ نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پُکار اُٹھتے ہیں:

شیخِ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخِ مرحوم کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اُس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تہذیب و تعلیم کے بارے میں سرسیّد احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر پڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ ''شیخ مرحوم'' کے قول میں جو صداقت مضمر ہے، اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنجیدہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب العلم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نا بلد ہے۔ روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے۔ اور اگر موجودہ صورت حالات بیس سال تک[۶] قائم رہی تو وہ اسلام رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برادروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل اُصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے۔ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی راہیئت اور نوعیت سے بہت زیادہ باخبر تھے۔

خودی اور بےخودی میں نسبتِ باہمی

بعض لوگ قلتِ تدبر کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ خودی اور بےخودی میں تباین یا تضاد کی نسبت ہے۔ اس غلطی کا مبنیٰ یہ ہے کہ فارسی زبان میں لفظ ''بے'' سے نفی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً ہوشیار سے ہوش کر نفی کرنے کے لیے بے ہوش اور زردار سے زر کی نفی کے لیے بے زر کی ترکیب مستعمل ہے۔ لیکن یہاں بےخودی سے خودی کی نفی مراد نہیں ہے، اس لیے ان لفظوں میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے۔ یعنی بےخودی، خودی کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں لفظوں میں عدم وملکہ کی نسبت ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱)　دو چیزوں میں جو نسبتیں قائم کی جاتی ہیں وہ دو اعتبار سے کی جاتی ہیں۔

(ا)　یا تو صدق وحمل کے اعتبار مثلاً نسبت تباین یا تساوی یا عموم وخصوص۔

(ب)　یا وجود کے اعتبار سے مثلاً تضاد یا تضایف یا عدم وملکہ۔

نوٹ:　جن چیزوں میں تساویٰ یا عموم وخصوص کی نسبت ہوتی ہے، ان میں تضاد یا تضایف کی نسبت قائم نہیں ہوسکتی، بلکہ ان میں اتحاد کلی یا اتحاد جزئی کی نسبت ہوتی ہے۔

(۲)　جب دو مفہوم ایسے ہوں کہ اُن دونوں کا ایک ہی حیثیت سے ایک زمانہ میں اور ایک محل میں اجتماع نہ ہو سکے، اور ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے عدم پر مشتمل ہو، لفظاً یا معناً، تو ان میں ایجاب وسلب یا عدم وملکہ کی نسبت ہی متصور ہو سکتی ہے۔

جو ذات اس عدمی وصف کے ساتھ موصوف ہو اگر اُس میں وصفِ وجودی کے ساتھ موصوف ہونے کی صلاحیت ہے تو عدم وملکہ کی نسبت ہے۔ اور اگر یہ صلاحیت نہ ہو تو ایجاب وسلب کی نسبت ہے۔

(۳)　خودی ایک مفہوم وجودی ہے اور بے خودی اسی خودی کے عدم پر مشتمل ہے، اور جو ذات، بے خودی کے وصف کے ساتھ موصوف مانی جائے وہ وہی ہو سکتی ہے جس میں خود کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ جو خودی کا موصوف نہیں بن سکتا، اس کو ہم بے خود بھی نہیں کہہ سکتے۔

(۴)　اس سے ظاہر ہوا کہ خودی اور بے خودی میں عدم وملکہ کا تقابل پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ ذات جو خودی کے ساتھ موصوف ہو۔ وہ کسی دوسری حیثیت سے بے خودی کا محل بن جائے۔ اسی طرح وہ ذات جو کسی اعتبار سے کسی بے خودی کے ساتھ متصف ہے وہ دوسرے اعتبار سے محلِ خودی ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حالات واز منہ کے تغیر سے ایک ہی محل میں خودی اور بے خودی دونوں کیفیتیں یکے بادیگرے متوارد ہوتی رہیں۔ کیونکہ متقابلین کے لیے دو جہتوں سے مجتمع ہو جانا، یا مختلف حالات واز منہ میں انکا متوارد ہو جانا عقلاً ناجائز نہیں ہے۔ مثلاً محبت اور عداوت اگرچہ صفات متقابلہ ہیں لیکن ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً زید ایک ہی وقت میں رام سے محبت کر سکتا ہیا ور شام سے نفرت کر سکتا ہے۔

(۵)　اسی طرح خودی اور بے خودی یہ دونوں صفات ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جا سکتی ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ خودی اور بے خودی میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے بلکہ عدمِ وملکہ کی نسبت ہے یعنی ایک شخص خودی کی منزل میں رہتے ہوئے بے خودی کی منزل میں بھی آ سکتا ہے۔

(شرح رموزِ بیخودی از یوسف سلیم چشتی)
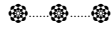
حواشی وحوالہ جات

۱-　تباین اور تناقض دونوں منطقی اصطلاحیں ہیں ان کا مثالوں سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

(ا)　انسان اور درخت میں تباین کی نسبت اور

(ب)　انسان پر اور لا انسان میں تناقض کی نسبت پائی جاتی ہے۔

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حدود کے مقرر ہو جانے سے افراد کے اعمال میں بڑی حد تک یگانگت اور یکسانیت پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ جن افراد کی منزل مقصود ایک ہوتی ہے ان میں وحدتِ کردار کا پایا جانا یقینی ہوتا ہے۔

۲- اس لفظ سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اجتماعی زندگی کے لیے جو دستور العمل عطا فرمایا ہے اس کی نظیر اقوام عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ مثلاً دنیا کی تمام قوموں نے اپنی قومیت کی بنیاد، وطن، نسب، رنگ یا نسل پر رکھی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے عقیدۂ توحید کو ملتِ اسلامیہ کی قومیت کی بنیاد قرار دیا ہو اور اسی نکتہ کو علامہ نے یوں بیان کیا ہو۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر　　　خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　　قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
(بانگِ درا)

۳- علامہ نے اس مثنوی کا تیسرا حصہ تو نہیں لکھا لیکن اس سوال کا تفصیلی جواب جاوید نامہ اور ضربِ کلیم میں ہدیہ ناظرین کر دیا ہے۔

۴- حضرت قدس مجدد الف ثانیؒ المتوفی ۱۰۳۴ھ نے اپنے مکتوبات میں کئی جگہ اس تلخ حقیقت کا اظہار فرمایا کہ ''اکنوں از اسلام بجز اسمے ہیچ شے باقی نماندہ است'' نیز حضرت مجدد دہلویؒ المتوفی ۱۱۷۶ھ نے ایک جگہ بایں الفاظ اپنے تاثرات بیان فرمائے کہ ''مسلماناں در گور، مسلمانی در کتاب'' واضح ہو کہ ہندوستان میں دینِ اسلام سے مسلمانوں کی برگشتگی کا سب سے بڑا سبب اکبر مرتد کا پیدا کردہ وہ فتنہ تھا جسے تاریخ میں ''دینِ الٰہی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جبھی تو اقبال نے یہ لکھا ہے:

تین سو سال ہیں ہند کے میخانے بند　　　اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

۵- افسوس کہ اغیار کو خوش کرنے کے لیے صاحبِ ترجمان القرآن نے قرآنِ عزیز کی اس بنیادی تعلیم کو مداہنت کے غلاف میں پوشیدہ کر دیا۔ اور حق و باطل کو مخلوط کر کے ایک ایسے اسلام کی ترجمانی کی ہے جسے نہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور نہ کوئی غیر مسلم اُسے قبول کرنے کی طرف راغب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں موجود ہیں تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ کر بدیشی مذہب اختیار کرے؟

۶- علامہ مرحوم نے یہ اندیشہ ۱۹۱۲ء میں ظاہر کیا تھا، اور وہ صورتِ حالات چالیس سال سے بعینہٖ قائم ہے، لہٰذا ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اس وقت ۱۹۵۲ء میں وہ ''اسلامی رُوح'' جس کی بقا کے لیے مرحوم نے ساری عمر جدو جہد کی ''ہماری جماعت'' میں کس حد تک باقی رہ گئی ہوگی۔ میرے خیال میں اسی صورتِ حالات کو دیکھ کر اکبر الہ آبادی نے یہ شعر لکھا تھا:

دین سے ملت سے یا اللہ سے الفت ہوتی کیوں　　　دودھ تھا ڈبہ کا اور تعلیم تھی سرکار کی

❀...❀...❀

رموزِ بیخودی کے مباحث

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اقبال کی کتاب اسرارِ خودی کے بعض نظریات کو سطحی فہم رکھنے والے نقادوں نے نظرِ تحسین سے نہ دیکھا۔ روایتی تصوف کے دل دادگان کو اس سے جابجا ٹھوکر لگی۔ ہمارے ادب میں تو خودی ایک مذموم چیز تھی اور تصوف و اخلاق اس کو ابلیسانہ چیز سمجھتے تھے۔ فارسی اور اُردو ادب میں نفس انسانی کے ایزدی جوہر کے متعلق تو بہت کچھ ملتا ہے لیکن ہر جگہ تلقین یہی ہے کہ انسان اپنی خودی کو سوخت کر کے ہی اس جوہر کو اُجاگر کر سکتا ہے۔ خودی کی پرستش گناہ ہے اور خدا پرستی کے مخالف ہے:

تجھ کو خودی پسند ہے مجھ کو خدا پسند　　　تیری جدا پسند ہے میری جدا پسند

اس تصور میں یہ 'انا' یا 'میں' یا 'ہم' پندار کا ایک بت ہے اور تمام بتوں کا قلع قمع کرنے کے بعد آخر میں یہی سنگ گراں معرفت میں سنگ راہ بن جاتا ہے:

گو لاکھ سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

وحدت وجود کا فلسفہ، جو اسلامی شاعری اور تصوف کا مرکز و محور بن گیا، زیادہ تر خودی سوز ہی ہے۔ کیونکہ اس کے اندر مخلوقات کی حیثیت محض ظلی ہے۔ اقبال نے روایتی تصوف کے خلاف جہاد اسرارِ خودی ہی سے کیا اور عمر کے آخری لمحوں تک یہ جہاد جاری رہا۔ مابہ النزاع خودی ہی کا مسئلہ تھا۔ اقبال خدا کو خودی میں جذب کرنے کی تلقین کرتا تھا اور تصوف خودی کو خدا میں گم کرنے کی تعلیم دیتا تھا۔ اسرارِ خودی سے بہت سے قارئین نے دھوکا کھایا اور سمجھا کہ یہ قوت اور تکبر کی تعلیم ہے اور اس میں انسان کی خودی کو خدا بنا دیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی میں خدا کہیں نمایاں معلوم نہیں ہوتا، انسانی خودی وہاں خلاق بن گئی ہے۔ ان نقادوں کو یہ علم نہ تھا کہ اقبال اس سے اچھی طرح آشنا تھا کہ بےخودی بھی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ اگرچہ بےخودی کا مفہوم بھی اس کے نزدیک روایتی مفہوم سے بہت مختلف تھا۔ اقبال کے حکیمانہ اور دینی تصورات کا فقط ایک پہلو اسرارِ خودی میں پیش ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے دوسرے پہلو کو

پیش کرنا لازمی تھا۔ رموزِ بیخودی، اسرارِ خودی کا تکملہ ہے۔ اقبال کے نظریاتِ حیات میں بحیثیت مجموعی ایک توازن موجود ہے۔ اگرچہ کلام کے بعض حصوں کو الگ الگ کر دیکھیں تو بعض اوقات فقط ایک پہلو کسی قدر شدت اور مبالغے کے ساتھ نظر کے سامنے آتا ہے۔

رموزِ بیخودی کی تمہید میں ربطِ فرد و ملت کے متعلق اقبال اپنا زاویہ نگاہ پیش کرتا ہے۔ یہ مسئلہ نفسیات' اخلاقیات' سیاسیات اور معاشیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے متعلق اختلاف زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرد کو ایک ایٹم سمجھ کر جو نفسیات لکھی گئی وہ حقیقتِ حیات سے بہت دور ہو گئی۔ سادہ اخلاقی تصورات بھی اس کے لیے نا قابلِ فہم ہو گئے اور ہجوک جیسے اخلاقیات پر ضخیم تصنیف کرنے والے فلسفی آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں ایک فرد اپنی ذاتی مسرت کو دوسروں کے لیے قربان کرے۔ کانٹ کی اخلاقیات بھی آخر میں بے بنیاد ہو گئی اور اس نے اس عقیدے کا سہارا لیا کہ اگر تلافی کرنے والے خدا اور بعد الموت کا عقیدہ نہ ہو تو فرد کی فرض شناسی اور جماعت کے اغراض کے لیے اس کی ذاتی سعادت و مسرت کی قربانی کی کوئی عقلی تاسیس ممکن نہیں۔ جرمن فلسفی شٹیرنر اور نطشے کی طرح بعض حکماء نے فرد کو مطلق العنان کرنے کی تلقین کی تاکہ جماعت کے حدود و قیود اور اوامر و نواہی اس کی شخصیت کے بے روک ارتقاء میں خلل انداز نہ ہوں۔ دوسری طرف ہیگل جیسے فلاسفہ نے جماعت اور مملکت کو معبود بنا دیا اور فرد کی انفرادیت وہاں ایک بے حقیقت سا مظہر رہ گئی۔ اس کا اثر معاشیات و سیاسیات پر بہت گہرا پڑا۔ کارل مارکس نے اپنے فلسفے کا ڈھانچا ہیگل سے اخذ کیا اور اس کا عملی نتیجہ وہ اشتراکیت ہے جہاں فرد کی آزادی ضمیر اور آزادی عمل ایک گناہِ کبیر ہے۔ مغرب میں حقوق طلبی کے جوش و خروش میں فرد نے جماعت کو اپنا حریف سمجھا، رفتہ رفتہ وہ مذہب سے بھی برگشتہ ہو گیا جو فرد کو جماعت کے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ تھا کشاکش افراط و تفریط کا نتیجہ تھی۔

اسلام اعتدال اور توازن کا نام ہے۔ ادیان میں فرد و ملت کے ربط کا مسئلہ عمدہ طور پر اسلام نے حل کیا تھا۔ اسلام فرد کے نفسیات کے کسی پہلو کو جماعت کے مفاد سے الگ نہیں کرتا۔ اس کی تمام عبادات میں اجتماعی عنصر بہت نمایاں ہے۔ نماز ہو یا روزہ، سب میں فرد جماعت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے باوجود اسلام نے بڑے زور و شور سے آزادی ضمیر کی تلقین کی اور کہا کہ دین، جس میں عقیدہ اور طریقِ زندگی شامل ہے، کسی جبر کو گوارا نہیں کرتا۔ جو چیز اختیار سے قبول نہیں کی گئی اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ رہبانی مذاہب میں اخلاق اور روحانیت افرادی رہ گئے تھے۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف فرد جو غار میں یا صحرا میں جماعت سے بے نیاز ہو کر خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

اقبال کے ہاں 'ربطِ فرد و ملت' کا نظریہ اسی اسلامی زاویہ نگاہ سے اخذ کردہ ہے۔ جماعت کے ساتھ

تمام نفسیاتی روابط کو ساقط کر کے نفس انسانی کی باقی ماندہ حقیقت کو دیکھیں تو وہ صفر رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے بہت پہلے کہا تھا کہ ''وجود افراد کا مجازی'' ہے یعنی فرد کی، جماعت سے ربط کے بغیر کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن جماعت کا یہ ہمہ گیر رابطہ انسان کی انفرادی خودی کو سوخت نہیں کرتا، بلکہ اس کی پرورش کرتا ہے۔ ہر شاخ اور ہر پتے کی اپنی بھی ایک مخصوص حیثیت ہے، لیکن شجر سے منقطع ہو کر نہ شاخ میں روئیدگی رہ سکتی ہے اور نہ پتا سرسبز رہ سکتا ہے:

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

تمام نوع انسان کی وحدت کی تعلیم قرآن میں موجود تھی کہ سب انسان ایک نفس واحدہ سے سرزد ہوئے ہیں۔ گویا تمام نوع انسان ایک جسم ہے اور مختلف افراد اس کے اعضا ہیں۔ اسی قرآنی تصور کو ان اشعار میں ادا کیا گیا ہے:

بنی آدم اعضاے یک دیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نہ ماند قرار

اگر کسی عضو میں ایسی انانیت پیدا ہو جائے کہ وہ دوسرے اعضا سے تعاون لا حاصل ایثار سمجھے تو خود وہ عضو معطل ہو جائے گا۔ یہ تمثیلی حکایت حکمت آموز ہے کہ انسانی جسم کے اعضا میں بے بصری سے ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہم تو سب جدو جہد کرتے رہتے ہیں لیکن یہ پیٹ نکھٹو، نا کردہ کار ہماری محنت سے پیدا شدہ رزق کو اپنے اندر ڈال کر خود لطف اٹھاتا ہے۔ اس نکھٹو کا کامل مقاطعہ کرنا چاہیے۔ تمام اعضا نے رزق کی کوشش چھوڑ دی، پیٹ میں کچھ نہ گیا تو سب کی حالت زار و نزار ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ہم بے جان کیوں ہو رہے ہیں۔ آخر دماغ نے ان بے وقوفوں کو سمجھایا کہ شکم سمیت تم سب ایک ہی جان کے مظاہر اور اس کے خدمت گزار ہو۔ ہر ایک کا کام اسے خود بھی نفع پہنچاتا ہے اور کل جسم کو بھی۔ جماعت کے ساتھ ہی ربط رکھنے سے عضو میں زندگی اور قوت ہے۔ فرد و جماعت کے ربط کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ علامہ اقبال بھی اسی تصور سے آغاز کرتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامہ احرار باش

اس کے بعد ایک حدیث نبویؐ کے حوالے سے کہا ہے کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔ فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد و ملت کا احترام و نظام ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ فرد کا جماعت میں گم ہونا خودی کو سوخت کرنا نہیں بلکہ قطرے کا قلزم بننا ہے۔ زندگی کے اقدار کا سرمایہ ملت ہی کے گنجینے میں ہوتا ہے۔ نوع انسان جو کچھ قرون میں یہ دوران ارتقاء پیدا کرتی رہی ہے، فرد اس تمام ثروت کا مالک بن

جاتا ہے اور انسانیت کے مستقبل کی طرف بھی جماعت ہی قدم بڑھاتی ہے۔ ماضی اور مستقبل اس کی ذات میں ہم آغوش ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔لیکن جماعت باقی رہتی ہے۔فرد کے اندر ترقی کی خواہش بھی جذبہ ملی سے پیدا ہوتی ہے اور خیر وشر کا معیار بھی حیات ملی کی پیداوار ہے۔ انسان کو حیوان ناطق کہتے ہیں لیکن فرد بے جماعت ناطق نہیں ہوسکتا۔ زبان جو ہزار ہا سال کے انسانی تجربات کی سرمایہ دار ہے، کسی ایک فرد کی پیدا کردہ چیز نہیں۔ یہ قیمتی ورثہ جماعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ گرمی صحبت سے فرد میں ملت کی وسعت آجاتی ہے۔تمام کثرت وحدت میں منسلک ہو جاتی ہے۔لفظ کے اندر معنی کی ثروت جملے یا مصرعے کے دوسرے الفاظ سے متحد ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے۔تنہا فرد کے مقاصد خور ونوش کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں۔فرد کے مضمرات وممکنات اگر معرض شہود میں آتے ہیں تو محض ملت کے ربط سے۔ضبط ونظم سے زندگی کونشو ونما حاصل ہوتا ہے۔حقیقی آزادی جو معاون حیات وارتقاء ہے وہ جماعتی پابندیوں ہی سے حاصل ہوتی ہے۔جس طرح کہ ندی کے اگر کنارے نہ ہوں، جو اس کی روانی کو حدود کے اندر رکھتے ہیں، تو وہ ندی ہی نہیں بن سکتی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ تو نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو نہیں پہچانا، اس لیے وہم و گمان میں مبتلا ہو گیا ہے اور ان کو باہم متضاد سمجھنے لگا ہے۔ تیری ذات کے اندر ایک جوہر نور ہے۔ اس نفس واحدہ میں دوئی نہیں۔لیکن مظاہر حیات میں یہ وحدت من وتو کا امتیاز پیدا کر لیتی ہے۔ اس کی فطرت آزاد خود اپنی تکمیل کے لیے آئین کی زنجیریں بناتی ہے۔ اس جزو کے اندر ہمہ گیر قوت ہے۔ پیکارِ حیات اس شمشیر کے لیے سنگ فساں ہے:

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا

اسی کو خودی کہتے ہیں اور اسی کا نام زندگی ہے۔ جماعت کے اندر گم ہو کر، یعنی بے خودی سے، یہ خودی اپنے آپ کو استوار کرتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئین کے جبر نے اختیار فرد کو سوخت کر دیا ہے، لیکن محبت اسی کا نام ہے کہ محبّ محبوب کی ذات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ خودشکنی سے کس طرح خودی مضبوط ہوتی ہے؟ استدلال کے لیے یہ نکتہ آسانی سے قابل فہم نہیں، اس میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے:

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد است تیز　　　گر نمی فہمی ز پیش ما گریز

اس تمہید کے بعد اقبال نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی فطرت میں یکتائی کا جوہر بھی ہے لیکن اس کی حفاظت انجمن آرائی سے ہی ہوتی ہے۔ افراد خود اپنی تکمیل ذات کے لیے اپنے آپ کو ایک لڑی میں پرو لیتے ہیں۔ پیکار حیات میں ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ افلاک پر نظام انجم بھی جذب باہم سے قائم ہے۔ انسانی افراد بھی اسی آئین سے قیام وثبات حاصل کرتے ہیں۔ ابتدائی حالت میں انسان جب دشت وجبل میں آوارہ تھے تو زندگی کی قوتیں خوابیدہ تھیں، آرزوئیں محدود تھیں:

گوشمال جستجو نا خوردۂ　　زخمہ ہائے آرزو نا خوردۂ

خون میں گرمی نہیں تھی۔ دیو پری کے اندیشے سے لرزاں تھے۔ عقل وفکر نے بھی ماحول پر غلبہ حاصل نہ کیا تھا۔ برق و رعد سے خائف تھے۔ خود رو چیزیں کھا کر گزارہ کر لیتے تھے۔ اپنی کوشش سے فطرت سے کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔ ایک انفعالی کیفیت تھی۔ جو کچھ میسر آ گیا اس پر قناعت کر لی۔ اس حالت میں انسان اس وقت نکلا جب کسی جماعت میں ایک مرد صاحب دل پیدا ہوا۔

یہ قرآنی تصور ہے کہ آدمیت کا آغاز نبوت سے ہوا ہے۔ بعض حکما نے کہا ہے کہ ہر علم وفن کا آغاز بھی وحی ہی کی بدولت کی ہوا۔ ایسا شخص انسانوں کو انتشار سے نکال کر ان میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ ''تا دوئی میر د یکی پیدا شودٗ''۔ ایسے مرد صاحب دل کا انداز نظر بالکل تازہ ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کو ایک نئی بصیرت سے دیکھتا ہے اور اس سے نئے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کے اندر زندگی کی حرارت ہوتی ہے جس کی چنگاریاں بے شمار قلبوں میں شعلے پیدا کرتی ہے۔ اس کی بدولت عقل کو بھی ایک نیا پیرایہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ وہ زندگی کے اقدار کی نئی تقدیر کرتا ہے۔ وہمی معبودوں کی پرستش سے انسان کو نجات دلاتا ہے۔ مادّی فطرت کو قوتوں کا خوف دلوں سے زائل کرتا ہے اور انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ تو خدائے خلاق واحد کے سوا کسی کا بندہ نہیں۔ اس کے طفیل میں انسان ایک جماعت بن جاتے ہیں اور توحید الٰہی وحدت انسانی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تمام زندگی کے لیے ایک مقصود معین ہو جاتا ہے:

حلقہ آئیں بپایش می کشد　　تا سوے یک مدعایش می کشد

رسم و آئین نیاز آموزدش　　نکتہ توحید باز آموزدش

اس قسم کے توحید آموز اور وحدت آفریں تلمیذ الرحمان کو اسلامی اصطلاح میں نبی کہتے ہیں۔ از آدم تا ایں دم نوع انسان نے جو ترقی کی ہے اور انسان کی بصیرت اور قوت میں جو اضافے ہوئے ہیں، سب کا سرچشمہ نبوت ہی ہے۔

اس کے بعد، ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ، کے عنوان کے تحت رکن اوّل توحید کی شرح ہے۔ انسانی عقل ابتدائی کوششوں میں اپنے ماحول میں اشیا وحوادث کا فرداً فرداً ادراک کر کے ان کے ساتھ کوئی ہنگامی توافق پیدا کرتی رہی۔ ابھی تک ایسا شعور پیدا نہ ہوا تھا جو مظاہر کی گونا گونی اور کثرت کو کسی وحدت سے منسلک کر سکے۔ عقل کا پہلا ارتقائی قدم توحید کی بدولت اٹھا، ورنہ عقل کے لیے خود اپنا مقصود واضح نہ تھا۔ فطرت کی تسخیر فہم فطرت کے ساتھ وابستہ ہے اور اس فہم کا کام حوادث کی کثرت میں آئین کی وحدت تلاش کرنا ہے:

در جہان کیف و کم گردید عقل　　پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ این بے چارہ را منزل کجاست　　کشتی ادراک را ساحل کجاست

کم فہم لوگ دین اور دانش کو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں سمجھتے ہیں۔ اگر نکتہ توحید ان کی سمجھ میں آ جائے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو کہ توحید کی پیدا کردہ وحدت کوشی ہی دین اور حکمت دونوں کا سرچشمہ ہے اور تمام قسم کی قوتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں:

دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو　　زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو

عالموں کی حیرت اور عاشقوں کی قوت عمل اسی زاویہ نگاہ کا نتیجہ ہیں۔ یہی عقیدہ خاک کو اکسیر بناتا ہے۔ اس سے انسان کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ انسان راہ حق میں گرم رو ہو جاتا ہے۔ شک اور خوف کی جگہ یقین محکم پیدا ہوتا ہے، چشم بصیرت پر ضمیر کائنات کا انکشاف ہوتا ہے۔

کلمہ توحید ہی ملت بیضا کے تن میں بطور جان ہے۔ یہی عقیدہ ملت کا شیرازہ بند ہے۔ اسی سے زندگی میں قوت کا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی سے تو وہ گل دل بن جاتا ہے اور دل میں سے اگر یہ نکل جائے تو دل مٹی ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی اصلی دولت یہی ہے۔ اسی توحید نے اسود و احمر کی تمیز مٹائی اور بلال حبشی (رضی اللہ عنہ) فاروق (رضی اللہ عنہ) اور ابوذر (رضی اللہ عنہ) کا ہمسر ہو گیا۔ ملت نہ جغرافیائی چیز ہے اور نہ نسلی یا لسانی۔ بقول شاعر ''ہم دلی از ہم زبانی بہتر است'' ملت دلوں کی یک رنگی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ بات توحید ہی کی برکت سے ظاہر ہوتی ہے:

ملت از یک رنگی دلہاستے　　روشن از یک جلوہ سیناستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے　　در ضمیرش مدعا باید یکے

ملت اسے کہتے ہیں جس میں خیر و شر اور خوب و زشت کا معیار یکساں ہو۔ یہ اتحاد خدائے واحد ہی کی بخشی ہوئی بصیرت کا نتیجہ ہوسکتا ہے، ورنہ ہر شخص خود اپنے لیے معیار بن جائے اور انسانی وحدت کا شیرازہ بکھر جائے۔ بعض ملتوں نے اپنی تقدیر کو وطن کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ بعض نے اتحاد ملت کی تعمیر نسل و نسب کی بنیادوں پر قائم کی ہے۔ لیکن وطن پرستی خدا پرستی نہیں، وہ ایک خطہ ارض کی پرستش ہے، اسی طرح نسب کا مدار جسمانی توارث پر ہے، لیکن انسان کی ماہیت جسم نہیں بلکہ روح ہے۔ ملت اسلامیہ کی اساس نفسی ہے۔ یہ ایک غیر مرئی رشتہ ہے، جس طرح تجاذب انجم کے تار کسی کو نظر نہیں آتے مگر وہی نظام انجم کے قوام ہیں۔ اس قسم کی وحدت نفسی توحید پرستوں کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتی۔

قرآن نے جہاں نفس مطمئنہ اور نجات یافتہ، خدا رس انسان کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے دو ہی صفات بالتکرار بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسا انسان یاس و حزن و غم سے پاک ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ کسی قسم کا

خوف اس کے دل میں نہیں رہتا۔ اسی صفت کا نام حریت ہے اور یہ توحید ہی کا ثمر ہے۔ مرد موحد کبھی نا اُمید نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس کے نزدیک نا اُمیدی کفر ہے۔ اُمید سے زندگی کی قوتیں پیدا اور استوار ہوتی ہیں اور یاس سم قاتل کا کام کرتی ہے۔ قطع اُمید سے انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مایوس انسان کے عناصر سست ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ غم انسان کی جان کو کھا جاتا ہے مسلمانوں کو خدا اور رسولؐ نے ''لا تحزن'' کی تعلیم دی ہے اور نصب العین لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون قرار دیا ہے:

گر خدا داری ز غم آزاد شو　　　از خیال بیش و کم آزاد شو

اسی قوت سے موسیٰ (علیہ السلام) فرعون کے مقابل میں کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کو غرقاب کرتا ہے۔ غیر اللہ کا خوف عمل کا دشمن ہے لیکن خدا پر یقین ہمت عالی کا منبع ہے۔ خوف سے فکر و عمل کی تمام قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں اور انسان خود مسخر و مغلوب ہو جاتا ہے۔ جس شخص کو سست عمل دیکھو سمجھ لو کہ اس کے دل میں خوف نے جگہ کر لی ہے۔

جدید نفسیات نے کوئی پچاس قسم کے 'فوبیا' یعنی خوف کی قسمیں دریافت کی ہیں جو انسان کے تحت الشعور میں داخل ہو کر اس کے نفس میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ 'نفسیاتِ تحلیلی' ان چوروں کو قلب کے تہ خانوں سے نکالنے کی تجویزیں کرتی رہتی ہیں، لیکن خود ایک بڑا ماہر نفسیات جدید، ینگ اس کا اقرار کرتا ہے کہ خدا پر راسخ عقیدہ رکھنے والے ان خوفوں اور نفسی پیچیدگیوں سے بری ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا علاج عقیدہ توحید ہے:

ہر شے پنہاں کہ اندر قلب تست　　　اصل او بیم است اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ　　　ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

موحد کے دل بے ہراس کے متعلق ایک تمثیل پیش کی ہے کہ حزن و خوف سے بری انسان میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ حوادث کے تیر اس پر بے اثر ہو جاتے ہیں۔ تیر شمشیر سے کہتا ہے کہ میں کسی کے سینے میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر دل یاس و بیم میں مبتلا ہے یا نہیں۔ جہاں میں نے دیکھا کہ یہ شخص مایوس اور ڈرپوک معلوم ہوتا ہے، وہاں میں دھڑلے سے اس کی خوں ریزی کرتا ہوں، لیکن اگر سینے کے اندر قلب مومن نظر آئے تو میں اس کی حرارت سے پگھل کر پانی ہو جاتا ہوں:

در صفاے او ز قلب مومن است　　　ظاہرش روشن ز نور باطن است

از تف او آب گردد جان من　　　ہمچو شبنم می چکد پیکان من

اس نظم میں بےخودی کا مفہوم اس لحاظ سے داخل ہے کہ جب خودی میں سے خوف و حزن کے عناصر ناپید ہو جائیں تو اس قسم کی بےخودی کی حالت مستی و مدہوشی کے مماثل نہیں ہوتی بلکہ حوادث کے مقابلے

میں نا قابلِ شکست حصن مدافعت بن جاتی ہے۔ خودی اور بے خودی میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ اسی خیال کو 'حکایت شیر وشہنشاہ عالمگیر' میں ایک تاریخی واقعے سے استوار کیا ہے۔ نماز عاشقاں میں ایک بے خودی کی کیفیت ہوتی ہے کیوں کہ نفس انسانی اپنے تئیں کلیتاً خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس سپردگی کی بدولت اس میں بے حد قوت اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیر نے عالمگیر پر دوران نماز میں حملہ کیا۔ کوئی معمولی انسان خوف زدگی میں شیر کا شکار ہو جاتا ہے یا بے اختیار فرار کی کوشش کرتا لیکن عالمگیر کی بے خودی میں خودی کی طاقت دیکھیے:

دست شہ نادیدہ خنجر برکشید شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود را ہے نداد اندیشہ را شیر قالیں کرد شیر بیشہ را

ایسے نفس میں خودنمائی کے ساتھ خودشکنی ہوتی ہے، لیکن یہی خودشکنی الٰہی قوتوں کی جاذب بن جاتی ہے:

ایں چنیں دل خود نما و خود شکن دارد اندر سینہ مومن وطن

بعض اوقات لوگوں کو لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی صفت پڑھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ ماسوا کا خوف معدوم ہونے پر بھی خدا کا خوف تو باقی رہتا ہے، اس لیے بندہ مومن مطلقاً لاخوف تو نہ ہوا۔ لیکن یہ دھوکا انسانی زبان کی کوتاہی سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے خوف کے وہ معنی نہیں جو ماسوا کے خوف کے معنی ہیں۔ خدا کوئی ڈراؤنی چیز نہیں ہے جسے دیکھ کر انسان کانپنے لگے۔ وہ تو سراپا رحمت وشفقت ہے۔ خوف خدا کے معنی ہیں حکم خداوندی اور آئین الٰہی کی خلاف ورزی کے دردناک نتائج فطری ہیں۔ انھیں معنوں میں خوف خدا کو حکمت کا سرچشمہ کہا گیا ہے۔ ماسوا کا خوف تو انسان کو حواس باختہ اور عقل سوختہ کر دیتا ہے۔ خوف خدا کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ ایک فرمان بردار بچہ سراپا شفقت ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے سے گریز کرتا ہے تا کہ محبت کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ یہاں سزا کا خوف نہیں ہوتا بلکہ محبت کے فقدان کا خوف ہوتا ہے۔ ان معنوں میں خدا ہی کا خوف انسان کو ہر قسم کے خوف حوادث سے نجات دلوا سکتا ہے:

عشق را آتش زن اندیشہ کن روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس خوف غیر از شرک پنہاں است و بس

خدا کے سوا کسی چیز سے خائف انسان کلمہ لا الٰہ الا اللہ زبان سے پڑھنے کے باوجود اندر سے شرکِ خفی میں مبتلا ہوتا ہے۔

رموزِ بیخودی میں اقبال پہلے اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ انسانوں میں ملت آفریں وحدت ان مردان حق کی بدولت پیدا ہوئی ہے جنھیں اصطلاحاً نبی کہتے ہیں۔ اس سے قبل اس عنوان کے تحت اشعار

درج ہو چکے ہیں کہ 'ملت از اختلاط افراد پیدا می شود و تکمیل تربیت او از نبوت است' اسلام کا ''رکن دوم'' ''رسالت'' ایک مخصوص تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انبیا تو آدمؑ سے لے کر محمدؐ تک لاتعداد ہوئے ہیں لیکن قرآن کریم نے مسلمانوں کو ملت ابراہیمؑ کہا، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ کا توحید کی تعمیر اور شرک کی بیخ کنی میں جہاد تاریخ دین کا ایک اہم واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ توریت و انجیل سے پہلے کا زمانہ ہے، اس لیے توحیدی رموز میں ان کو تمام انبیائے بنی اسرائیل پر زمانی سبقت حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی بنیادیں قائم کیں تو اس وقت نہ کوئی یہودی تھا اور نہ کوئی نصرانی۔ یہ سب بعد کے، کم و بیش بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لیے توحید کو بھی خالص کرنے کے لیے موحد قدیم حضرت ابراہیمؑ کی ہی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ پہاڑ میں سے نکلتے ہوئے چشمے کا پانی صاف ہوتا ہے، بعد میں بہتی ہوئی ندیوں میں خس و خاشاک اور کثافت کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ رسالت کی توضیح میں علامہ اقبال، ابراہیمؑ خلیل اللہ ہی سے آغاز کرتے ہیں:

تارک آفل براہیم خلیلؑ　　　انبیا را نقش پاے او دلیل

جس طرح عقیدۂ توحید وحدت آفریں ہے، اسی طرح رسالت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ ہزار ہا انسان ایک عدل عام اور رحمت عامہ کی سلک میں منسلک ہو جائیں:

از رسالت در جہاں تکوین ما　　　از رسالت دین ما آئین ما

از رسالت صد ہزار ما یک است　　　جزو ما از جزو ما لاینفک است

ابراہیمی رسالت نے جن بنیادوں کو اُستوار کیا اور رسالت محمدیؐ نے ان پر جو عظیم الشان تعمیر انسانیت کھڑی کی، اسی کی بدولت توحید پرستوں کی ایک ملت بن گئی جو اہلِ عالم کے لیے پیام رحمت ہے۔ رسولؐ کی محبت خدا کی محبت کا وسیلہ ہے۔ کوئی فرد شاید براہِ راست بھی راہبوں کی طرح خدا سے رابطہ پیدا کرے، لیکن ملت کی شیرازہ بند تو رسالت ہی ہے:

فرد از حق، ملت از وے زندہ است　　　از شعاع مہر او تابندہ است

رسالت کی بدولت لاتعداد انسان ہم نوا اور ہم مدعا ہو جاتے ہیں۔ کثرت اس وحدت میں آ کر زندہ تر ہو جاتی ہے۔ دین فطرت کا تقاضا اسی قسم کی وحدت آفرینی ہے۔ رسالت محمدیؐ کی پیدا کردہ وحدت اگر ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے تو ہم ابد پیوند ہو سکتے ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں لیکن ایسی عالمگیر ملت قائم و دائم رہ سکتی ہے محمد رسول اللہؐ پر رسالت کے مقصد کی تکمیل ہو گئی۔ اس پر اب کوئی انسان بنیادی حقائق کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح محمدؐ خاتم النبیین ہیں اسی طرح ان کی اُمت خاتم الامم ہے۔ اس کے علاوہ جو ملتیں قائم ہوں گی وہ آئین فطرت کے خلاف ہوں گی، یا جغرافیائی ہوں گی یا نسلی، یا لسانی۔ ان

میں سے کسی کو بقا حاصل نہیں ہو سکتی۔ حق کے مقابل میں باطل کی عمر نہایت قلیل ہوتی ہے۔ اب کوئی نئی نبوت اس سے وسیع تر وحدت پیدا نہیں کر سکتی۔ البتہ کسی جدید دعوائے نبوت سے انسانوں میں مزید تفریق و تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے:

لا نبی بعدی ز احسان خدا است　　پردہ ناموس دین مصطفیٰؐ است

قوم را سرمایۂ قوت ازو　　حفظ سر وحدت ملت ازو

دل ز غیر اللہ مسلمان می کند　　نعرۂ 'لا قوم بعدی' می زند

اس عقیدے کی نسبت یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ مسلمان تمام نوعِ انسان تو نہیں۔ مسلمانوں کی باہمی اخوت رنگ و نسل و وطن سے بالاتر سہی، لیکن دُنیا کی کثیر آبادی تو ان سے باہر ہے، اس لیے اسلام کی اخوت عالم گیر اخوت تو نہ ہوئی۔ یہی اعتراض اسرارِ خودی کے انگریز مترجم پروفیسر نکلسن نے کیا تھا۔ اس کا جواب اقبال نے نہایت مدلل اور مسکت دیا تھا کہ اسلام کا مقصود عالم گیر محبت و اخوت ہے لیکن جب تک ایک ملت اس کی مثال قائم نہ کرے اور دوسروں کے لیے نمونہ نہ بنے، تب تک اخوت کی حدیں وسیع نہیں ہو سکتیں۔ اقبال نے اس جواب میں اپنا پختہ یقین بیان کیا کہ میرے نزدیک اُمت محمدیہ کا خاص مشن یہی ہے کہ وہ عالم گیر اخوت کے اُصول کا عملی جامہ پہنائے۔ چنانچہ رموزِ بیخودی میں اس مضمون کے لیے ایک خاص عنوان قائم کیا ہے، درمعنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است، اس عنوان کے تحت یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کا پیغام تمام نوعِ انسان کے لیے آزادی، برابری اور برادری کا پیغام ہے۔ اسلام نے جو کچھ تلقین کی اور اپنی خالص حالت میں جو معاشرت، معیشت اور سیاست پیدا کی اس نے تمام انسانوں کی گردنوں میں سے طوق اور دست و پا سے غلامی اور استبداد کی زنجیریں توڑ دیں۔ انسان انسانوں کی پوجا کرتے تھے۔ ارباب من دون اللہ معبود بنے ہوئے تھے۔ لا قیصر و لا کسریٰ کا اعلان اسلام نے کیا۔ کاہن و پاپا و سلطان و امیر سب مل کر انسانوں کا شکار کرتے۔ کلیسا جنت کے پروانے ابلہان فریب خوردہ کے ہاتھ بیچتا تھا۔ برہمن نجات کے کمیشن ایجنٹ بنے ہوئے تھے۔ مذہب استحصال جاہ و مال کا آلہ بن گیا تھا۔ فطرت انسانوں کو آزاد پیدا کرتی تھی، لیکن وہ مہد سے لحد تک طرح طرح کے توہمات اور استبداد کی زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔ خدا نے جو امانت آدم کے سپرد کی تھی وہ اس سے چھن چکی تھی۔ جب زبونی حال اس درجے کو پہنچی تو رحمت حق جوش میں آئی اور حق بحق دار سپردن کا دور شروع ہو۔ یہ اسی نبیؐ کی بدولت ہوا جس کو اس کے ہم وطن لوگ نبوت سے قبل بھی امین کہتے تھے:

تا امینے حق بہ حق داراں سپرد　　بندگان را مسند خاقان سپرد

اب مکرم و معظم ہونے کا ایک ہی معیار رہ گیا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم جو سیرت میں افضل ہے وہی سردار ہے، خواہ وہ ایک نادار حبشی ہی ہو۔ انسانیت کے لیے یہ کام اور کس نے کیا؟ فقط حریت و اخوت و مساوات کے نعرے لگاتے رہے تاکہ اس دھوکے سے عوام کا شکار کرتے رہیں۔ محنت کش کسان اور مزدور کے لیے الکاسب حبیب اللہ کس نے کہا؟ یہ تمام اصنام کہن اسلام نے توڑے۔ یہ کسی ایک ملت پر احسان نہ تھا بلکہ تمام انسانیت میں ایک تازہ جان آفرینی تھی:

تازہ جان اندر تن آدم دمید　　　بندہ را باز از خداونداں خرید

اسلام صحیح معنوں میں انقلاب تھا، وہ دُنیائے کہن کی موت اور عالم جدید کی تکوین تھی۔ دین اور ضمیر کے معاملے میں ہر قسم کا جبر ممنوع ہو گیا۔ حریت و مساوات کی تحریکیں عصرِ نو میں بھی پیدا ہوئی ہیں، لیکن تاریخ انسانی میں یہ تمام تقاضے اسلام کے منشور میں داخل ہو کر پہلے پہل منصۂ شہود پر آئے:

حریت زاد از ضمیر پاک او　　　ایں مَے نوشیں چکید از تاک او

عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است　　　چشم در آغوش او وا کردہ است

جس اسلام نے کل مومن اخوۃ کہا، اسی نے تمام نوع انسان کی وحدت کی حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ تمام انسان، مرد و زن گورے کالے، امیر و غریب ایک نفس واحد کے اعضا ہیں۔ اخوت اور مساوات اسلام کی نہاد میں ہیں۔ جو کوئی جس حد تک اخوت، مساوات اور حریت کو لائحہ عمل بناتا ہے اسی قدر وہ مسلم و مومن ہے۔

اس کے بعد تاریخِ اسلام سے مساوات ورزی کی کچھ مثالیں بیان کی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف جنگ میں ان کا سپہ سالار جابان گرفتار ہو گیا۔ اس نے یہ نہ بتایا کہ میں کون ہوں اور ایک معمولی سپاہی سے امان طلبی کی۔ اس نے اسے امان دی اور وعدہ کیا کہ تمھیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ جنگ کے ختم ہونے پر معلوم ہوا کہ وہ اوّل نمبر کا جنگی مجرم ہے۔ سب نے ابوعبیدہ سپہ سالار سے کہا کہ اس کو قتل کرنا لازمی ہے۔ ابوعبیدہ سپہ سالار عسکر اسلامی نے کہا کہ اے مسلمانو! ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک کا وعدہ سب کا وعدہ ہے۔ امان دینے والا معمولی سپاہی سہی لیکن ہماری ملت کا فرد ہے۔ ہمیں اس کا پاس ہونا چاہیے۔ ملت کی یک آہنگی بڑے سے بڑے جبّار قاتل کے قتل کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے:

نعرۂ حیدر نوائے بو ذراست　　　گرچہ از حلق بلال و قنبر است

ہر یکے از ما امین ملت است　　　صلح و کینش صلح و کین ملت است

اس کے بعد سلطان مراد اور معمار کا قصہ بیان کیا ہے۔ ایک معمار کی تعمیر سلطان کو پسند نہ آئی اور خشم گین ہو کر اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس نے قاضی کے ہاں نالش کی۔ قاضی نے سلطان کو عدالت میں طلب

کیا۔ ایک طرف معمار دست بریدہ وستم رسیدہ فریادی ہے اور دوسری طرف ایک وسیع مملکت کا شہنشاہ شرمندہ کھڑا ہے۔ سلطان نے جرم کا اقبال کیا۔ قاضی نے کہا کہ از روئے قرآن قصاص واجب ہے۔ شریعت سلطان اور معمولی انسان کے حقوق وفرائض میں فرق روانہیں رکھتی:

عبد مسلم کمتر از احرار نیست　　　خون شہ رنگیں تر از معما نیست

سلطان نے اپنا ہاتھ پیش کیا کہ قصاص میں اس کو کاٹ دیا جائے مدعی نے کہا کہ خدا نے قصاص کا حکم بھی دیا ہے لیکن عدل واحسان کو افضل قرار دیا ہے:

گفت از بہر خدا بخشیدمش　　　از برائے مصطفیؐ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر　　　سطوت آئین پیغمبرؐ نگر
پیش قرآن بندہ و مولا یکے ست　　　بوریا و مسند دیبا یکے ست

حریت کی مثال میں اقبال نے امام الشہدا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے جگر گداز واقعے کو نظم کیا ہے۔ اسلام نے شہنشاہی اور سلطانی کا خاتمہ کر کے انسان کی حریت کو محفوظ کیا تھا، کیوں کہ مطلق العنان سلطانی جو عادل و ظالم، عاقل واحمق کو ورثے میں ملتی رہے ہر قسم کے استبداد کا مسموم سرچشمہ ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ تک حریت کا یہ عالم تھا کہ معمولی فرد بھی خلیفہ پر نالش کر کے اس کو عدالت میں پیش ہونے پر مجبور کر سکتا تھا اور عورتیں مجمع عام میں امیر المومنین سے معمولی باتوں میں بھی باز پرس کرتی تھیں اور اس کے کسی غیر قرآنی فتویٰ کے خلاف احتجاج کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ جیسے بارعب خلیفہ سے بھی کوئی مرعوب نہ ہوتا تھا بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھے۔ مساوات وحریت کا یہ نمونہ چشم آفتاب نے اس دُنیا کی سطح پر پھر کبھی نہ دیکھا۔ مگر جب خلافت سلطنت میں تبدیل ہوگئی تو تھوڑے ہی عرصے میں وہی قیصریت واپس آگئی جس کی بیخ کنی اسلام کا فرض اوّلین تھا۔ ایک مردِ مجاہد وحق پرست، رسول اللہؐ و بتول کا پروردہ آغوش اور حیدر کرار کا فرزند ارجمند، اس حریت کشی اور اسلام سوزی کو برداشت نہ کر سکا۔ حضرت امام حسینؓ نے استبدادی سیاست کے خلاف حق کا علم بلند کیا اور حریت کی حفاظت میں اپنی اور اہل وعیال کی جانیں قربان کر دیں۔ مسلمانوں کا ایک گروہ آج تک اس پر ماتم کرتا ہے۔ لیکن اس امام احرار کی حریت پروری اور استبداد کشی کو کسی نے اپنا مسلک نہ بنایا۔ اب حریت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کی ضرورت ہے۔

عقل و عشق کا موازنہ اقبال کا ایک خاص مضمون ہے۔ حضرت امام حسینؓ کے ذکر میں بھی شروع میں پندرہ اشعار عقل حیلہ کی تحقیر اور عشق کی مدح میں ہیں۔ اس موازنے میں نہایت لطیف نکات پیدا کیے ہیں۔ اقبال کا مقصود یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے اندر عشق کی جذبہ انگیزی اور قوت ایثار کا نقشہ کھینچا جائے۔ اگر حضرت امام حسینؓ میں صرف عقل مصلحت اندیش ہوتی تو کمزور ایمان والے مسلمانوں کی طرح وہ بھی

خاموشی سے یزید کی ولی عہدی کو تسلیم کر لیتے۔ حریت اور عشق ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ حضرت سیّد الشہدا حریت کی حمایت میں انتہائی قربانی پر آمادہ ہوئے۔ یہ جذبہ بھی زندگی کے اعلیٰ اقدار کے عشق ہی کا مظہر ہے:

عشق را آرام جاں حریت است　　　ناقہ اش را سارباں حریت است

دُنیا ہمیشہ خیر و شر کی قوتوں کا میدان کارزار رہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون اور حسینؓ و یزید زندگی کی دو مختلف قوتوں کے نمائندے ہیں۔ خلافت کو سلطنت بنا دینا گویا موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کی حمایت کے مترادف تھا:

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت　　　حریت را زہر اندر کام ریخت

حریت کا علم بردار سر بکف اٹھا، وہ انسانیت کے لیے ایک سحاب رحمت تھا:

بر زمین کربلا بارید و رفت　　　لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد　　　موج خون او چمن ایجاد کرد
ماسوااللہ را مسلماں بندہ نیست　　　پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

علامہ اقبال اپنی شاعری کی ابتدا میں وطنیت کے ترانے الاپ کر بصیرت اندوزی کے ساتھ اس بت پرستی سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ اس انقلاب نظر کے بعد اُنھوں نے فارسی اور اُردو میں وطن پرستی کے خلاف ایک مسلسل جہاد کیا۔ رموزِ بیخودی میں بھی یہ مضمون ایک خاص انداز میں موجود ہے۔ اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں کہ ملت اسلامیہ ایک ابد قرار ملت ہے کیونکہ اس کی تعلیم حیات ابدی کی تعلیم ہے اور اس کے اُصول فرت کے اُصول ہیں جن کی نسبت قرآن میں ارشاد ہے:

فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا۔ لا تبدل لخق اللّٰہ اس سے لازم آتا ہے کہ اس ملت میں کوئی نہایت زمانی نہ ہو۔ اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں کہ لازمانی ہونے کی طرح یہ ملت لامکانی بھی ہے یہ کسی خطہ ارض کے ساتھ وابستہ نہیں:

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا　　　تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا　　　غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

یہ بانگِ درا وہی لا الہ الا اللہ ہے جس سے ماورئ کوئی حقیقت نہیں۔ مسلمان کا وطن اسلام ہے، جس طرح ایک مقتدر اصحابی نے اپنا نسب اسلام بتایا تھا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام ایک روحانی نظریہ ہے اور اس خاک دان سے اس کا کوئی لازمی رشتہ نہیں۔

قلب ما از ہند و روم و شام نیست　　　مرز بوم او بجز اسلام نیست

رسول کریم ﷺ کو حضرت کعب نے قصیدے میں سیف الہند کہا جو فولاد کی خوبی اور تیزی کے لیے مشہور تھی۔ رسول کریم ﷺ نے کہا کہ سیف الہند نہیں سیف اللہ کہو۔ اس سے اقبال نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ اپنے پیغام اور اسلام کو کسی خطہ ارض کے ساتھ وابستہ کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ اسی طرح اس دُنیائے ارض کو ایک مشہور حدیث میں دنیاکم یعنی تمہاری دُنیا کہا ہے۔ جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں اس عالم خاکی کا باشندہ نہ سمجھتے تھے۔ وہ یہاں چند روزہ مہمان اور مسافر تھے۔ ہجرت میں بھی یہ تعلیم مضمر تھی کہ اسلام کے مقابلے میں وطن کوئی چیز نہیں۔ رسول کریمؐ نے تمام روئے زمین کو مسجد کہا۔ زمین کا کوئی مخصوص ٹکڑا یا مخصوص معبد ہی خدا کا گھر نہیں۔ جس طرح خدا کسی خطے میں محصور نہیں اسی طرح بندہ خدا کے لیے شرق و غرب برابر ہیں۔ وللہ المشرق والمغرب، فاینما تولوا فثم وجہ اللہ خدا نے جس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اس کو مکے سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ مکے میں رہتے ہوئے بھی خدا دشمنوں کا قلع قمع کر سکتا تھا۔ ہجرت فقط وطن پرستی کے خلاف ایک موثر تلقین تھی:

صورت ماہی بہ بحر آباد شو　　یعنی از قید مقام آزاد شو
ہر کہ از قید جہات آزاد شد　　چوں فلک درشش جہت آباد شد

اسلام کا مقصود نوع انسان کی وحدت ہے۔ مغرب کی قومیت پروری اور وطن پرستی نے جغرافیائی حدود کے اِدھر اور اُدھر رہنے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ اب مجلس اقوام بنا کر اس مہلک بیماری کا علاج کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل علاج تب ہوگا جب مجلس اقوام کی جگہ مجلس انسان بنے گی۔ موجودہ مجلس میں تو اقوام ہی کی رسہ کشی اور حیلہ سازی نظر آتی ہے اور ظاہری کوشش صلح گرگ آشتی ہے۔ اصل خلل زاویہ نظر میں ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند　　بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
مردی اندر جہان افسانہ شد　　آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت وہفت اندام ماند　　آدمیت گم شد و اقوام ماند

مغرب میں دین کو کچھ مادّیت نے سوخت کیا اور کچھ وطنیت نے جو مادّیت ہی کی ایک صورت ہے۔ وطن پرستی اور مملکت پرستی نے مغرب میں شیطان کا ایک مرسل بھیج دیا جس کا نام میکیا ویلی ہے۔ اس نے یہ تلقین کی کہ وطن اور مملکت کی حمایت اور قوت افزائی کے لیے عدل و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ فرنگ اسی مرسل شیطان کے صحیفے کا معتقد اور اسی پر عامل ہے۔ فرنگیوں کے ہاں مملکت معبود بن گئی ہے۔ مسلمانوں نے بھی اگر اس کی تقلید کی تو وہ بھی دین سے بیگانہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اقبال پھر اس خیال کی طرف عود کرتا ہے کہ ملت اسلامیہ کبھی زمانے کی دستبرد سے کالعدم

نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم نے اُمتوں کے متعلق ایک کلیہ بیان کیا ہے ولکل امۃ اجل۔ اذا اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون اقبال کہتا ہے کہ ملت اسلامیہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ جن اُمتوں کو ازمنہ ماضیہ میں اجل آئی یا آئندہ اجل کا شکار ہوں گی ان کی اساس ابدی حقائق پر نہ تھی۔ اگر اسلام کا چراغ کفر کی پھونکوں سے بجھ نہیں سکتا تو لازم ہے کہ اس پر کار بند اُمت کا چراغ حیات بھی ہمیشہ روشن ہے:

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد　　　از اجل فرماں پذیرد مثل فرد
اُمت مسلم ز آیات خداست　　　اصلش از ہنگامہ قالوا بلیٰ است
از اجل ایں قوم بے پرواستے　　　اُستوار از نحن نزلنا ستے

تیرہ چودہ صدیوں میں ملت اسلامیہ پر قیامت خیز آفتیں آئیں، کبھی اپنے اعمال کی پاداش میں اور کبھی حوادث روزگار سے لیکن اس کی راکھ میں جو چنگاریاں تھیں ان کی بدولت پھر نئے سرے سے حرارت حیات پیدا ہوتی رہی۔ یورش تاتار سے صرف بغداد بلکہ عالمی اسلامی کے بیشتر حصے میں ایسی قیامت نازل ہوئی جو روما پر وحشی اقوام کے حملوں سے بھی طاری نہ ہوئی تھی۔ کفار، خلافت کے جذبے اور روح کو ٹھکرا کر مسند نشین ہو گئے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا چراغ بجھ گیا ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے یہی آتش تاتار گلزار ابراہیم بن گئی:

آتش تاتاریاں گلزار کیست　　　شعلہ ہائے او گل دستار کیست

تاریخ اسلام میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ مسلمان ایک طرف کمزور اور بے بس ہوئے تو دوسری طرف ان کا غلبہ ہوگیا۔ اندلس میں ان کا دور دورہ ختم ہو گیا تو مشرقی فرنگ میں ترکوں نے اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اُدھر ترک مشرقی یورپ میں سے نکلے تو دورِ حاضر میں ایک طرف پاکستان جیسی عظیم الشان اسلامی مملکت قائم ہوگئی، دوسری طرف مشرقِ اقصیٰ میں انڈونیشیا میں ایک کثیر التعداد اسلامی ملت آزاد ہوگئی:

شعلہ ہائے انقلاب روز گار　　　چوں بباغ ما رسد گردد بہار

تاریخ عالم نے کئی عظیم القوت ملتوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا لیکن:

در جہاں بانگ اذاں بود است و ہست　　　ملت اسلامیاں بود است و ہست
ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　　ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(حافظ)

اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ ملت کی صورت بندی آئین سے ہوتی ہے اور ملت اسلامیہ کا آئین کا مخزن قرآن حکیم ہے:

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے　　　موج کو آزادیاں سامان شیون ہوگئیں

ملتے را رفت چوں آئین ز دست مثل خاک اجزائے او از ہم شکست

قرآن نے اسلام کو دینِ فطرت قرار دے کر لا تبدیل لخلق اللّٰہ کے اُصول کے مطابق جو سرمدی حقائق حیات بیان کیے ہیں وہ زمانے کے تغیرات کی پیداوار نہیں اور نہ مرورِ ایام سے ان میں کہنگی پیدا ہو سکتی ہے اسی آئین کو قرآن حکمت بھی کہتا ہے اور حکمت کے مفہوم میں کلیت اور زمان و مکان سے ماورائیت داخل ہے:

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لا یزال است و قدیم

اس کی تعلیم غلاموں کو احرار بنا دیتی ہے اور ضعیفوں کو قوت بخشتی ہے۔ اس نے ارتقا کی راہیں کشادہ کر دی ہیں۔ اسی کی بدولت ان پڑھ صحرائیوں نے دُنیا میں علوم وفنون کا چراغاں کر دیا۔ موحد بچوں کے سینے بھی اس امانت کے امین ہیں جسے دست وجبل نے زہرہ گداز سمجھ کر قبول نہ کیا تھا۔ تاریخ عالم میں صحرائی اور کوہستانی وحشیوں کے ٹڈی دل کئی مرتبہ متمدن دُنیا پر نازل ہوئے۔ مگر پُرانی تہذیبوں کے تاخت وتاراج کے بعد حیات انسانی میں کوئی وسعت اور ثروت افکار واقدار پیدا نہ کر سکے۔ لیکن ان صحرائیوں نے قرآن سے فیض اور قوت حاصل کر کے قیصر وکسریٰ کے تخت ہی نہیں اُلٹے بلکہ انسانوں کو غلامی کی زنجیروں اور توہمات کے طوق سے آزاد کیا۔ اس وقت جو ملت اسلامیہ میں ضعف نظر آتا ہے تو اس کی وجہ قرآن سے تغافل ہے۔ اب قرآن سے کسی کو وجد نہیں آتا لیکن جامی اور عراقی کی غزلیں قوالی میں چنگ ورباب کے ساتھ گائی جائیں تو ایک جھوٹا جوش اور مستی پیدا ہو جاتی ہے:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش در نمی سازد بقرآن محفلش

خطیب کا کام اب فروعات کی جنگ ہے۔ ضعیف وشاذ ومرسل حدیثوں کی بحث میں قرآن طاق نسیاں پر دھرا رہتا ہے۔ احادیث میں غلو نے یہاں تک نوبت پہنچائی ہے کہ بعض احادیث کو نصوصِ قرآنی کا ناسخ بنا دیا ہے نعوذ باللہ من ذالک:

از خطیب و دیلمی گفتار او با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

قرآن اب یا بے سمجھے طوطے کی طرح رٹا جاتا ہے یا کسی مسلمان کی وفات پر ملا حلوا مانڈا اجرت میں لے کر اس کے دو ایک سپارے بڑی سرعت سے پڑھ جاتا ہے یا پھر فال کے لیے استعمال ہوتا ہے یا تبرکاً بیمار کو اس کے اوراق کی ہوا دی جاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اس کے بعد ایک مضمون ہے جو بظاہر اقبال کی عام تلقین کے منافی معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت اس

میں کوئی تضاد نہیں۔ اقبال نے بالتکرار سینکڑوں اشعار میں تقلید کی مذمت کی ہے اور تحقیق کی رغبت دلائی ہے۔ اجتہاد کے متعلق اقبال کے تصورات خطبات اور اشعار میں ایسے ملتے ہیں جن کو پڑھ کر مقلدوں کو اس کی جرات پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن اقبال جب ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کوئی گروہ ایسا دکھائی نہیں دیتا جو اسلامی روح کے مطابق اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اور جو لوگ اجتہاد کی جرات کرتے ہیں وہ آزاد خیالی میں یا تقلید فرنگ میں اسلام سے سے دور جا پڑتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں ایسے خام مدعان اجتہاد کی بجائے اسلاف کی تقلید بہتر ہے۔ بچوں کی عقل جب تک علم اور تجربے سے پختہ نہیں ہوتی تب تک ان کی تربیت کا مدار تقلید پر ہوتا ہے۔ اس انحطاط کے دور میں بھی اقوام عقل و حکمت کے بارے میں طفل نابالغ بن جاتی ہیں یا پیر فرتوت کی طرح جدت افکار و اعمال کے ناقابل ہو جاتی ہیں۔ جب قوم میں زندگی کے چشمے خشک ہو جائیں تو وہ روایت پرست اور مقلد ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ تقلید اور روایت پرستی میں کسی ہمت اور جرات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مسلمانوں میں اس وقت ایک طبقہ جامد اور کورانہ تقلید اسلاف میں زندگی کی ارتقائی کوششوں کے لیے نااہل ہو گیا ہے اور دوسرا طبقہ مغرب زدہ روشن خیالوں کا ہے، جن کے لیے تہذیب جدید کا ہر نظریہ اور ہر طرز عمل سند ہے۔ یہ آزاد خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ بھی مقلد ہی ہیں۔ جب تک قوم میں نئی زندگی اُبھرنے کے سامان پیدا نہ ہوں تب تک ہر طرف مقلد ہی مقلد نظر آئیں گے۔ اگر تقلید ہی کو شیوہ بنانا ہے تو پھر اپنے اسلاف کی تقلید اغیار کی تقلید سے بہتر ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عہد حاضر کے فتنوں نے ہماری ملت کو اپنے جلووَں سے چندھیا دیا ہے اور ہمارے باطن کی آگ ٹھنڈی ہوگئی ہے:

جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد　　　ساز ما را از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتش دیرینہ برد　　　نور و نار لا الا از سینہ برد
مضحل گردد چو تقویم حیات　　　ملت از تقدیر نمی گیرد ثبات

ماضی کی معتقدانہ تقلید سے جوئے کم آب ہی ملے گی جو ہماری زندگی کو پوری طرح سیراب نہیں کر سکتی لیکن جب دریا ریگستان میں گم ہو گیا تو بچی کھچی چھوٹی سی نہر ہی کی حفاظت کریں:

بحر گم کردی زیاں اندیش باش　　　حافظ جوئے کم آب خویش باش

تقلید کی یہ تلقین ایک مردہ قوم کے لیے ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کو دور حاضر میں مردہ ہی سمجھتا ہے، اگرچہ اس کے احیا سے نا اُمید نہیں۔ اب یہی بہتر ہے کہ اللہ اللہ کرو اور طرز فکر و عمل میں کسی گذشتہ امام کی تقلید ہی کر لو، لیکن یہ تقلید غذائے رُوح نہیں بلکہ مریض میں جو جان کی رمق باقی دکھائی دیتی ہے، اس کو

سنبھالنے کے لیے ایک دوا ہے:

اے پریشان محفل دیرینہ ات　　　　مرد شمع زندگی درسینہ ات

نقش بر دلِ معنی توحید کن　　　　چارہ کار خود از تقلید کن

یہ نصیحت عوام کے لیے ہے جن میں ہماری کم علم اور بے بصیرت علما کا ایک طبقہ بھی داخل ہے۔ الا ماشاءاللہ۔ اس نصیحت کو اقبال اپنے لیے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا اپنا ذوق تو یہ ہے کہ اجتہاد اور جدت و قدرت میں اگر غلطی بھی سرزد ہو تو وہ اس کو مقلدانہ نیکی پر ترجیح دیتا ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش　　　　براہ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دست تو کار نادر آید　　　　گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے　　　　ز بند پاستان آزاد رفتے

اگر تقلید بودے شیوہ خوب　　　　پیمبرؐ ہم رہ اجداد رفتے

اتباعِ آئین کی تلقین پر ایک اور نظم ہے جس میں شریعت اسلام کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شریعت اور عشق دونوں کی ماہیت سے ناواقف لوگوں نے ان کو باہم برسرِ پیکار سمجھ لیا:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

یہ بحث اسلام سے زیادہ قدیم ہے۔ موسوی شریعت رفتہ رفتہ اس قدر پیچ در پیچ اور زندگی کے لیے جنجال بن گئی اس کی تفصیلی پابندیوں میں رُوح دین غائب ہوگئی۔ حضرت مسیحؑ نے اس ظاہر پرستی اور شعائر پرستی کی شدت کے خلاف احتجاج کیا۔ یہودی علما نے ان پر مخالف شرع ہونے کا الزام لگایا اور ان کو مصلوب کرانے کے درپے ہو گئے۔ ہر چند کہ حضرت مسیحؑ کہتے رہے کہ میں شریعت کو منسوخ کرنے نہیں آیا بلکہ اس کی تکمیل کرنے آیا ہوں۔ میں تمھیں شریعت کے ظاہر کی نسبت اس کے باطن کی طرف متوجہ ہونے کی تعلیم دیتا ہوں۔ حضرت مسیحؑ کے بعد پولوس نے شریعت موسوی سے تنگ آ کر یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ مسیحؑ کی آمد سے محبت نے شریعت کو منسوخ کر دیا ہے۔ عیسوی تاریخ میں اس کے اچھے نتائج نہ نکلے۔ کسی نہ کسی شریعت کی ضرورت تو زندگی کے لیے لابدی ہے۔ جب قسطنطین کے عیسائی ہونے سے مملکت غار نشیں راہوں کے ہاتھ آ گئی تو ان کو آئین وقوانین وضع کرنے پڑے اور مسیحؑ کی بجائے کلیسا شریعت گر ہو گیا۔

اسلامی شریعت کی نسبت اقبال کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلامی شریعت کے حقائق سے اچھی طرح آشنا ہو تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہاں شریعت اور محبت میں کوئی تضاد نہیں اور شریعت کے ہر حکم کی تہ میں محبت محبت ہی کا جذبہ ہے:

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

اب ہمارے ہاں شریعت کے علم بردار اور مدعی ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کے فروغی مناقشات میں محبت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ غیر مسلموں اور عام انسانوں سے محبت تو درکنار اپنوں میں تفرقہ اندازی حامیانِ شریعت کا شیوہ بن گیا ہے۔ لعن وطعن اور تشنیع کا بازار گرم رہتا ہے۔ شریعت اسلامی کی اساس حکمت بھی ہے اور محبت بھی اور اس کا مقصد انسانوں کی قوتوں میں اضافہ کرنا ہے:

قدرت اندر علم او پیداستے هم عصا و هم ید بیضاستے

اگر مستحب کی ادائیگی میں کوئی شخص یا گروہ مزاحم ہو تو اس کو ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ دشمن اگر مطمئن اور جنگ کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو بے خبر اور کمزور پا کر اس پر حملہ آور ہونا حرام ہے۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین نے یروشلم پر حملہ کرنے سے بیشتر دشمن کو پیغام بھیجا کہ اگر تم جنگ چاہو تو میں تم کو اپنی قوتوں کو مستحکم اور منظم کرنے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کروں گا، لیکن میں صلح کو اپنے لیے اور تمھارے لیے جنگ کے مقابلے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ کمزور جانوروں کے شکار سے شکاری خود سست اور پست ہمت ہو جاتا ہے۔ دشمن کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا اُصولِ شجاعت کے خلاف ہے:

نیست میشے ناتوانے لاغرے درخور سر پنجہ شیر نرے

باز چوں با صعوہ خوگر می شود از شکار خود زبوں تر می شود

اسلامی شریعت نے رہبانیت کو اس لیے مذموم قرار دیا کہ اسلام سراپا پیغام عمل ہے:

ہست دین مصطفیؐ دین حیات شرع او تفسیر آئین حیات

صیقلش آئینہ سازد سنگ را از دل آہن رباید زنگ را

مسلمانوں جب عجم میں پہنچے تو ذوق قوت نزاکت اور لطافت میں منتقل ہو گیا۔ شیر افگن مسلمان نوائے عندلیب سے بے تاب ہونے لگے، یا رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے لگے:

آ عندلیب مل کر کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پُکار میں چلاؤں ہائے دل

آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند گشت از پامال مورے درد مند

آنکہ از تکبیر او سنگ آب گشت از صفیر بلبلے بے تاب گشت

عجمی تصورات میں لطافت افکار بھی ہے اور پرواز تخیل بھی اور اس کے فن میں ذوق جمال بھی ہے، لیکن اسلام کی شریعت، بصیرت اور قوت سے اس کو لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔ بے چارے مرزا غالب نے صاف طور پر اقبال کیا کہ میں عجمی نہاد ہوں اس لیے دین عربی میرے دل و دماغ میں نہیں گھستا:

رموز دیں نشناسم عجب مدار زمن کہ دین من عربی نہاد من عجمی است

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد رفاعیؒ نے اپنے ایک مرید کو نصیحت کی کہ عجمی افکار سے پرہیز کرنا:

با مریدے گفت اے جان پدر از خیالات عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت از حد دین نبی بیروں گذشت

ایک نظم میں اپنے بچپن کے ایک واقعے کو نظم کیا ہے کہ میں نے ایک سائل کو تنگ آ کر زد و کوب کی۔ والد صاحب کو جب معلوم ہوا تو اُنھوں نے عجب مؤثر انداز میں مجھے تنبیہ کی کہ اسلام تو شفقت بر خلق کا نام ہے اور اس کا نبی رحمۃ للعالمینؐ ہے۔ جب روز محشر میں سب کے سامنے مجھ سے پوچھا جائے گا کہ اپنے بیٹے کی تو نے یہی تربیت کی تھی کہ وہ ایک سائل بے نوا کو مارے پیٹے تو میں کس قدر شرمندہ ہوں گا۔ قرآن و سنت رحمت و شفقت کی تعلیم ہے:

فطرت مسلم سراپا شفقت است در جہاں دست و زبانش رحمت است

اقبال نے شمع و شاعر میں ایک شعر کہا تھا:

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات یہ کبھی شبنم کبھی گوہر کبھی آنسو ہوا

اب اقبال یہ کہتا ہے کہ شبنم اور آنسو بننے سے بہتر ہے کہ قطرہ گوہر بن جائے، لیکن قطرہ آغوش تلاطم میں گوہر بنتا تھا، اس لیے شریعت اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مزاحمتوں اور خطروں پر غالب آ کر انسان اپنے نفس کو قوی بنائے:

قطرہ نیساں کہ مہجور از یم ست نذرِ خاشاکے مثال شبنم است
طینت پاک مسلماں گوہر است آب و تابش از یم پیغمبرؐ است

اس کے بعد ایک نظم میں اس خیال کی توضیح کی ہے کہ حیات ملیہ کے لیے کوئی مرکز محسوس بھی ہونا چاہیے۔ مسلمان کعبے کے سنگ و خشت کی پرستش نہیں کرتا، لیکن یہ مرکز محسوس شرق و غرب اور شمال و جنوب کے لاتعداد مسلمانوں کے لیے ایک نقطہ جاذب ہے جو حیات ملت میں ہم آہنگی اور وحدت کو ترقی دیتا ہے۔

پہلے زندگی کی ماہیت کے متعلق نہایت حکیمانہ اشعار کہے ہیں کہ حیات رم پیہم ہے، مادّہ ہو یا نفس اس میں مسلسل روانی اور تغیر احوال ہے۔ زندگی سراپا پرواز ہے، لیکن نشیمن بھی خود ہی بناتی ہے۔ عارضی طور پر سکون و جمود کی آفرینش کا مقصد بھی یہی ہے کہ ذوق خرام میں فزائش ہو:

پا بگل گردد حیات تیز گام تا دو بالا گرددش ذوق خرام
زندگی دو ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

(میر)

زندگی خود اپنے رشتے میں گرہیں ڈالتی ہے تاکہ گرہ کشائی کی لذت حاصل ہو:

دمبدم مشکل گر و آسان گزار دمبدم نو آفرین و تازہ کار

جس طرح حیات رواں کچھ عرصے کے لیے بدن میں اپنے آپ کو محدود کرتی ہے اسی طرح رُوحِ ملت کے لیے بھی ایک بدن کی ضرورت ہے۔ بیت الحرام اسی رُوح کا ایک مادّی مرکز و مسکن ہے۔ مختلف قومیں اپنے جھنڈوں کو اقتدار و وقار کا مرئی مرکز بنا لیتی ہے اور جنگ و صلح میں جھنڈے کے وقار کو قومی وقار کی علامت سمجھتی ہیں، حالانکہ مادّی حیثیت میں جھنڈا محض ایک لکڑی کا ٹکڑا اور دو چار گز کپڑا ہوتا ہے۔ بیت الحرام اپنی روایات کے لحاظ سے ان جھنڈوں سے بہتر مرکزِ عقیدت ہے:

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے
رازدار و راز ما بیت الحرام سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

امتیں جمعیت ہی سے قائم واُستوار رہتی ہیں۔ بیت الحرام جمعیت میں ایک قومی معاون ہے۔ اُمت موسوی کی جمعیت اس لیے پریشان ہوئی کہ اس کا مرکز اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کا معبد منہدم ہو گیا جس کی باقی ماندہ ایک دیوار پر اس تمام دُنیا کے زائر یہودی سر ٹکرا کر گریہ وزاری کرتے ہیں۔ یہودیوں کی تاریخ سے ملت مسلمہ کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اپنی جان سے زیادہ اس مرکز کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔ ایک روز علامہ مجھ سے فرمانے لگے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے علاوہ معبد کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآن جو صلوٰۃ وسطیٰ کی خاص حفاظت پر زور دیتا ہے میرے نزدیک اس کے معنی بیت الحرام کی حفاظت ہیں۔ وہ معلوم نہیں کہ دیگر مفسرین کہاں تک علامہ کی اس تاویل سے متفق الرائے ہوں گے۔

لیکن کعبہ مسلمانوں کی نظر گاہ نہیں۔ مسلمانوں کا حقیقی نصب العین حفظ ونشر توحید ہے۔ تمام دین توحید کی تشریح ہے اور تمام عبادات وشعائر اسی کو قائم رکھنے کے ذرائع ہیں۔ توحید ہی ملت اسلامیہ کا امتیازی جوہر ہے اور توحید ہی اس کی جمعیت کی شیرازہ بند ہو سکتی ہے۔

زندگی کی حقیقت مقصد کوشی ہے۔ توحید و وحدت آفرینی سے زیادہ بلند اور کوئی مقصود نہیں ہو سکتا۔ تمام مقاصد اسی کے زیرنگیں ہونے چاہئیں۔ ادنیٰ مقاصد ادنیٰ وحدتیں پیدا کرتے ہیں، اعلیٰ ترین مقصد وسیع ترین وحدت حیات پیدا کر سکتا ہے:

چوں حیات از مقصدے محرم شود ضابط اسباب ایں عالم شود

راہ پیمائی کسی منزل ہی کی طرف ہو سکتی ہے۔ اگر منزل معین نہ ہو تو دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان جامد و ساکن ہو کر رہ جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ہرزہ گرد ہو جائے۔ ''بسکہ دراز او فتد جادہ زگمرا ہیم'' (غالب)۔ قیس صحرا میں آوارہ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ محمل لیلیٰ کی تلاش میں گرم رو ہے۔ جسم

انسانی کے اندر بھی بے انتہا اور گونا گوں اعمال و وظائف بقائے حیات کے واحد مقصود سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں:

گردش خونے کہ در رگ ہائے ماست تیز از سعی حصول مدعا ست

جس قدر کسی کا مقصد بلند ہوتا ہے، اسی قدر اس کی ہمت اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بقول شاعر:

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

جب کسی قوم میں شدید جدوجہد دکھائی دیتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی شاہد مقصود کی طرف دیوانہ وار بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مقصود کو ہر دم پیش رکھنا چاہیے۔ ایک قدیم صوفیانہ محاورہ ہے کہ جو دم غافل سو دم کافر۔ پاؤں کا کانٹا نکالنے کے لیے ایک مسافر کارواں سے ذرا الگ ہوا اتنے میں محمل نظر سے اوجھل ہو گیا اور وہ سو سال تک صحرا میں اس کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہا:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

زندگی مقصد کی جستجو اور تگ و دو میں قرنہا سے تجربے کرتی چلی آ رہی ہے۔ کئی معبودان باطل بنائے اور پھر ان کو توڑ ڈالا، آخر کار اس پیکار حیات نے ارتقاء کی آخری منزل میں انسان کو توحید سے آشنا کیا جو منتہائے حیات ہے والیٰ ربك المنتهیٰ:

مدتے پیکار با احرار داشت با خداوندان باطل کار داشت

تخم ایماں آخر اندر گل نشاند با زبانت کلمہ توحید خواند

توحید کے عرفان ہی سے زندگی میں تمام جمال و جلال پیدا ہوتا ہے۔ اس سرچشمہ حیات کی حفاظت مقصود حیات ہے۔ جب تک تمام عالم پر یہ راز افشانہ ہو تب تک مسلمان کو دم نہ لینا چاہیے:

زانکہ در تکبیر راز بود تست حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست

تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے

اسی عقیدے نے انسانوں کو توہمات سے پاک کیا ہے اور ہر قسم کے خوف کو اس کے دل سے دور کیا ہے۔ فکر انسانی بار بار بت گری اور بت پرستی کی طرف عود کرتا ہے۔ پہلے اصنام کو توڑتا ہے تو دوسرے اصنام تراش لیتا ہے۔ عصر حاضر میں فرنگ کی بدولت رنگ و ملک ونسب کی پرستش ہو رہی ہے اور خدا پر عقیدہ توہم پرستی شمار ہوتا ہے۔ ان بتوں کو توڑنے کے لیے پھر ایمان ابراہیمی اور توحیدِ محمدؐ کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان نے یہ کام نہ کیا تو اور کون کرے گا؟ اس عرفان کا جائزہ وارث تو وہی ہے، لیکن میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔ علامہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس خیال سے لرزہ آتا ہے کہ روز شمار میں جب خدا تم سے پوچھے گا کہ تمھیں پیغامِ حق دیا تھا کہ اسے دوسروں تک پہنچا دو، یہ کام تم لوگوں نے یوں نہ کیا، تو مسلمان کس قدر

شرمندہ اور ذلیل ہوگا۔ دوسروں تک پہنچانا تو درکنار یہاں اپنے اندر ہی سے توحید غائب ہوگئی ہے، کلمہ لا الٰہ زبان پر رہ گیا ہے، باقی سب کچھ یا شرک جلی ہے یا شرک خفی:

او خویشتن گم است کرا رہبری کنہ

اس کے بعد اقبال کا خاص موضوع آتا ہے کہ عالم کی قوتوں کی تسخیر کے بغیر حیات ملی میں وسعت اور قوت پیدا نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے آدم کو مسجود ملائک اور مسخر کائنات بنایا تاکہ تمام ارضی اور سماوی، مادی اور روحانی قوتوں کی تسخیر سے وہ نائب الٰہی بن سکے۔ رہبانیت نفسی احوال میں مبتلا ہوگئی اور حکمت فرنگ نے تمام قوتیں تسخیر عالم محسوس میں صرف کردیں۔ دونوں طریقوں سے زندگی کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ہستی کا ظاہر اور باطن دونوں حیاتِ الٰہی کا انکشاف ہیں۔ ھو الظاھر ھو الباطن حاضر کو غیب کے حقائق کے مطابق ڈھالنا اور دُنیا کو دین بنانا مقصود اسلام اور غایت حیات ہے۔ 'با آسمان پر داختن' کے ساتھ ساتھ 'کار زمین رانکو ساختن' کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔ فقط با نادیدہ پیمان بستن سے حیات گریز رہبانیت ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ ہندومت، بدھ مت اور عیسائیت کی ابتدا میں ایسا ہی ہوا۔ اسلام نے حاضر کا پیوند غیب سے لگایا اور انفس و آفاق کو ہم آغوش کرنے کی تلقین کی۔ ماسوا نہ فریب ادراک ہے اور نہ حقیقت ابدی ہے۔ اس کی آفرینش کا مقصود ہی یہی ہے کہ اس کی تسخیر سے نفس ترقی کریں:

اے کہ با نادیدہ پیمان بستہ ای　　　ہمچو سیل از قید ساحل رستہ ای
چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز　　　دل بغائب بند و با حاضر ستیز
ہستی حاضر کند تفسیر غیب　　　می شود دیباچہ تسخیر غیب
ماسوا از بہر تسخیر است و بس　　　سینہ او عرضہ تیر است و بس

ملت اسلامیہ کے انحطاط کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ فرنگ تسخیر آفاق میں لگا رہا اور اس کی بدولت غیر معمولی قوتیں پیدا کرلیں، مگر مسلمان فقط بے حضور نمازیں پڑھتے رہے یا ظواہر و شعائر کی پابندی میں لگے رہے۔ قرآن نے مشاہدہ کائنات کو عبادت قرار دیا تھا، مسلمان قرآنی آیات کی تلاوت کرتے رہے لیکن عمل دوسروں نے کیا۔ جن قوموں نے خارجی فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا اُنھوں نے مسلمانوں کو بھی آ دبوچا۔ مسلمان بے بس اور مغلوب ہوکر خدا سے شکوہ کرنے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ دوسری امتیں تیرا نام بھی نہیں لیتیں اور باوقار ہیں۔ توحید کی امانت ہمارے سینوں میں ہے لیکن ہم ہی ذلیل ہیں:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
(غالب)

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں　　　عجز والے بھی ہیں مست مے پندار بھی ہیں

ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں　　سینکڑوں ہیں جو ترے نام سے بیزار بھی ہے
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر　　برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اس کا جواب خدا نے یہی دیا کہ تمھاری شکایت بے بنیاد ہے۔ کافر کو جو کچھ ملا وہ کفر کا اجر نہیں بلکہ کافر کی زندگی میں اسلامی عناصر کی جزا ہے:

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

ابھی تک کثرت سے مسلمان اس وہم میں مبتلا ہیں کہ فرنگ مادّہ پرست ہے اور اس کی تمام ترقی مادّی ہے۔ روحانیت اور نجات کے اجارہ دار ہم ہی ہیں۔ یہ چندروزہ دُنیا کا عیش کافروں کے لیے ہے، ابدالا باد تک رہنے والی جنت کے ہم حقدار ہیں۔ قرآن نے کیا خوب کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ بھی روحانی اور اخلاقی تنگ نظری سے اسی قسم کے دعوے کیا کرتے تھے:

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد　　عالمے از ذرۂ تعمیر کرد
عقدہ محسوس را اوّل کشود　　ہمت از تسخیر موجود آزمود
کوہ و صحرا دست و دریا بحر و بر　　تختۂ تعلیم ارباب نظر

لیکن مسلمانوں کے لیے مذہب افیون بن گیا، دُنیا اعتنا کے قابل نہ رہی۔ خدا نے فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة کی دُعا سکھائی تھی اور اس دُعا میں دُنیا کو درست کرنا آخرت پر مقدم رکھا تھا اس لیے کہ دُنیا ہی مزرعہ آخرت ہے۔ اگر کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہے تو اس کی فردا میں نا کردہ کار کو کیا ثمر ملے گا؟ مسلمان نے آخرت پر نظر جمائے ہوئے دُنیا کو کفار کے حوالے کر دیا:

اے کہ از تاثیر افیون خفتہ　　عالم اسباب را دوں گفتہ
خیز و واکن دیدہ مخمور را　　دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیع ذات مسلم است　　امتحان ممکنات مسلم است

اگر ملت اسلامیہ آفاقی قوتوں کو مسخر نہ کر سکے گی تو آفاقی قوتوں کی تسخیر سے غیر مسلم اقوام اس کو مغلوب کر لیں گی:

گیر اور را تا نہ او گیرد ترا　　ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

زندگی میں حاجات اندیشہ و عمل کے توسن کے لیے تازیانہ ہیں۔ آدم کو عناصر پر حاکم بنایا گیا تھا۔ اگر وہ عناصر کی ماہیت سے آشنا نہ ہو اور ان سے کام نہ لے سکے، تو وہ نیابت الٰہی کا کیا حق ادا کرے گا:

تا ز تسخیر قوائے ایں نظام　　ذو فنونیہائے تو گردد تمام
نائب حق در جہاں آدم شود　　بر عناصر حکم او محکم شود

اسی ظاہری فضا میں کئی عالم پوشیدہ ہیں۔ ہر ذرّے کے اندر ایک خورشید کی قوت پنہاں ہے۔ اسرار موجودات کی گرہ کشائی سے بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے اور قوت بھی۔ باد و باراں اور برق و رعد مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں۔ سیلابوں میں بجلیاں ظہور کے لیے بے تاب ہیں۔ اقوام کہن ستاروں کی پرستش کرتی تھیں لیکن حکمت کی ترقی نے انسان کے ادراک کو ان پر محیط کر دیا:

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن

عرفان و حکمت اشیا کی بدولت ناتواں قومیں غیر معمولی قوت حاصل کر کے بڑی بڑی جابر قوموں کی گردن مروڑ دیتی ہیں۔ شجاعت بے حکمت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور اقوام حکیم کی باج گزار ہو جاتی ہیں:

تا نصیب از حکمت اشیا برد ناتواں باج از توانایاں خورد

خدا نے مجھے بار بار تاکید کی کہ فطرت کو غور سے دیکھ۔ نباتات، حیوانات، جمادات سب سے آئین الٰہی تلاش کر۔ تو فقط "انظر" والی آیات ہی دہراتا رہا۔ دیکھا دکھایا کچھ نہیں۔ قرآن حکیم فقط تلاوت کے لیے تو نہ تھا، اس کا اصل مقصود صحیفہ فطرت کے مطالعے سے حقائق الٰہیہ کا اخذ کرنا تھا۔ تو نے مشاہدہ کائنات کو کوئی عبادت ہی نہ سمجھا اور اسے دُنیائے دوں کا ایک شغل قرار دیا ہے۔ اب اس کی سزا بھگت رہا ہے:

تو کہ مقصود خطاب "انظری" پس چرا ایں راہ چوں کوران بری

سیّد احمد خان اور مرزا غالب، جن کے انداز فکر، طرز زندگی اور مقصود حیات میں بے حد تفاوت نظر آتا ہے، ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کو محض ایک عسکری کامیابی کا نتیجہ نہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں کی بالغ نظری پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ یہ نئی حکمران قوم محض تاجر اور کشور کشا نہیں بلکہ طبعی سائنس کی بدولت فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے بے بصر اقوام پر غالب آ گئی ہے۔ اب مشرقیوں کو ان سے کچھ سیکھنا ہے۔ سیّد احمد خان کو لوگ قابل اعتراض حد تک مداح و مقلد فرنگ سمجھتے تھے لیکن مرزا غالب کی ترقی پسندی کی یہ کیفیت تھی کہ جب سیّد صاحب نے آئین اکبری کو تصحیح اور حواشی کے ساتھ پسندیدہ انداز میں شائع کیا اور مرزا غالب کو تقریظ کے لیے یہ کتاب بھیجی تو مرزا صاحب اس قدر برہم ہوئے کہ سیّد صاحب سے قدیم دوستی بھی مخالفانہ تنقید پر غالب نہ آ سکی۔ تعریف کی بجائے اس تقریظ میں، جو غالب کے کلیات فارسی میں شامل ہے، وہ سیّد صاحب کے اس کارنامے پر افسوس کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ 'مردہ پروری' تو عقلمندوں کا کام نہیں۔ یہ پُرانے آئین اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ 'زمانہ دگر گونہ آئین نہاد' اب اس حکمت اور اس قانون پر غور کرو جو حکمت پسند ملت فرنگ اپنے ساتھ لائی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس قوم نے فہم فطرت سے تسخیر فطرت کا کام کیا ہے۔ الفاظ ہوا میں اُڑا کر دور دراز مقامات تک پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ اس قوم نے حروف

کو پیامبر کبوتر بنا دیا ہے اور ان کے ساز دیکھو کہ بے زخمہ مضراب بجتے ہیں تسخیر فطرت کے مضمون میں علامہ اقبال نے مرزا غالب کے حوالے سے دو چار اشعار لکھے ہیں۔ غالب کے اشعار میں ایک یہ شعر تھا:

حرف چوں طائر بہ پرواز آورند نغمہ را بے زخمہ از ساز آورند

علامہ فرماتے ہیں:

آنکہ بر اشیا کمند انداخت است مرکب از برق و حرارت ساخت است
حرف چوں طائر بہ پرواز آورد نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد

سیّد صاحب جب اپنے دو بیٹوں حامد و محمود کو لے کر انگلستان گئے تو وہاں ہر طبقے میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز نے بھی ان کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا جس میں زیادہ تر ماہر انجینئر ز ہی مدعو تھے۔ سیّد صاحب کو وہاں کچھ تقریر کرنا پڑی اس تقریر میں سیّد صاحب نے کہا کہ تمہاری قوم کو اپلائڈ سائنس اور انجینئر نگ کی بدولت عروج اور غلبہ حاصل ہوا ہے۔ برق اور بھاپ سے کام لینے والے اور ریلیں، تلغراف اور پل بنانے والوں نے تمہاری سلطنت کو قوت بخشی ہے۔ اپنے وطن میں سیّد صاحب کی کوششوں کا محور بھی یہی تصور تھا کہ اسلام بھی مسلمانوں سے یہی تقاضا کرتا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ اس سے غافل ہر کر ضعیف اور مغلوب ہو گئے۔ عقائد و اخلاق کو مغرب سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا قیمتی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، لیکن تسخیر فطرت سے روگردانی کی وجہ سے یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ہم لنگڑے بن گئے ہیں۔ حکمت آشنا سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے ہم اس آدم کے وارث نہیں رہے جس کی نسبت قرآن نے علم آدم الاسما کہا تھا۔ یہ اسما محض نام اور الفاظ نہ تھے بلکہ صفات اشیا و حوادث کا علم تھے۔ جن اقوام نے اس حقیقت کو پا لیا وہ ہم سے آگے نکل گئیں اور ہم پسماندہ قوم رہ گئے:

اے خرت لنگ از رہ دشوار زیست غافل از ہنگامۂ پیکار زیست
ہمر ہانت پے بہ منزل بردہ اند لیلیٰ معنی ز محمل بردہ اند
تو بصحرا مثل قیس آوارہ خستہ واماندہ بیچارہ
علم اسما اعتبار آدم است حکمت اشیا حصار آدم است

اقبال فرنگ کی سائنس اور اس سے پیدا شدہ تسخیر فطرت کا مخالف نہیں، وہ جس حکمت فرنگ کے خلاف احتجاج کرتا ہے وہ مادّیت کا نظریہ حیات ہے جو خارجی فطرت کے ایک غلط تصور سے پیدا ہوا۔ خود فرنگ کے اکابر حکماء اور سائنس دان اس فلسفے پر ویسی ہی تقلید کرتے ہیں جو اقبال کے کلام میں ملتی ہے اور اپنے انگریزی خطبات میں اقبال نے زیادہ تر انھیں حکمائے فرنگ کی بالگ نظر کے نمونے پیش کیے ہیں۔

اس کے بعد رموزِ بیخودی میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جس طرح تکمیل ذاتِ کے لیے فرد کو احساس

خودی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح ملت کی بھی ایک خودی ہے جو افراد کی خودی سے وسیع تر اور قوی تر ہے۔ اس کی تکمیل بھی لازمی ہے اور یہ تکمیل تسخیرِ فطرت کے علاوہ ضبط روایات ملیہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ پہلے کچھ اشعار میں یہ بتایا ہے کہ فرد کی خودی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ بچہ اپنی حقیقت سے کچھ واقف نہیں ہوتا، اس کا کام کھانا سونا اور بات کرنا سیکھنے کے بعد ہر چیز کے متعلق سوالات کرنا ہے، یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ اور یہ کیسے ہے؟ ان سوالات کی کثرت سے ماں باپ زچ آجاتے ہیں۔ زندگی کا یہی آئین ہے۔ پہلے تمام توجہ خود پر مبذول ہوتی ہے اور اپنے 'من' کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ کسی قدر فہم ماسوا کے بعد بچے میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں 'میں' ہوں تمام دیگر نفوس اور اشیا سے الگ ایک ہستی رکھتا ہوں، ماضی حال اور مستقبل سب اس 'میں' کی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ مسلسل جسمانی تغیرات اور بدنی نشوونما کے باوجود وہ اپنی خودی کو ایک غیر متغیر اور مستقل چیز سمجھتا ہے:

یاد او با خود شناسایش کند حفظ ربط دوش و فردایش کند
گرچہ ہر دم کاہد افزاید گلش من ہمانستم کہ بودم در دلش
این 'من' نوزادہ آغاز حیات نغمہ بیداری ساز حیات

ملت نوزائیدہ بھی کمسن بچے کی طرح ہوتی ہے، اس کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے اور نہ اسے مستقبل کا کوئی واضح احساس ہوتا ہے۔ دیروز و امروز و فردا کا شیرازہ بند 'انا' ابھی اس میں نہیں ہوتا، 'بستہ با امروز او فرداش نیست'، اس کی ہستی جسمانی آنکھ کے مماثل ہوتی ہے جو ہر شے کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی:

چشم ہستی را مثال مردم است غیر را بینندہ و او خود گم است

جب کوئی ملت حوادث و افکار کی پیکار میں کچھ عرصہ بسر کر چکتی ہے تو اس کے اندر ایک 'ملی انا' کا شعور ترقی کرتا ہے۔ قوم اپنی سرگزشت سے افکار و تاثرات کی ثروت حاصل کرتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے ماضی کو فراموش کر دے یا کوتاہ بینی سے عملاً اپنا رشتہ اس سے منقطع کر لے تو وہ نابود ہو جاتی ہے:

سرگزشت او گر از یادش رود باز اندر نیستی گم می شود

حفظ روایت کی سوزن سے ربط ایام کا پیرہن تیار ہوتا ہے جو ناموس ملت کا محافظ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے باعث تزئین بھی۔ نافہم لوگ تاریخ کو محض پرانی داستانیں سمجھتے ہیں اور ھذا اساطیر الاوّلین کہہ کر اس کی حقیقت سے غافل رہتے ہیں۔ تاریخ تو ایک ملت کا حافظہ ہے، فردمید سے حافظہ غائب ہو جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ قوم بھی اگر اپنی تاریخ سے غافل ہو جائے تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔

تاریخ ایک ساز ہے جس کے تاروں میں تمام نغمہ ہائے رفتہ اسیر ہوتے ہیں۔ صدیوں کی پرانی شراب اس کے خم و مینا میں ہوتی ہے، اس کی کہنگی مستی میں اضافہ کرتی ہے:

بادۂ صد سالہ در مینائے او　　مستی پارینہ در صہبائے او

زندہ قوموں کو دیکھو کہ کمال جدت پسندی کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کے متعلق کس قدر قدامت پرست ہوتی ہیں۔ دوش و امروز کا پیوند نفس ملت میں لذت اور قوت پیدا کرتا ہے۔ ہر قوم کا حال اس کے ماضی کی پیداوار ہے اور اس کا مستقبل اس کے ماضی و حال کا نتیجہ ہوگا۔ یہ وسعت زمانی اور ہزار سالہ حوادث کی حافظے میں یکجائی حیات ملی کی کفیل ہوتی ہے:

سر زند از ماضی تو حال تو　　خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن ار خواہی حیات لازوال　　رشتہ ماضی ز استقبال و حال

لیکن قومی روایات کی حفاظت اس انداز کی نہیں ہونی چاہیے کہ ملت ماضی پرست ہو کہ جامد ہو جائے اور زندگی کے ہر نئے اقدام کو یہ کہہ کر ٹھکرا دے کہ ہمارے قدیم عقائد و اعمال ہمارے لیے کافی ہیں۔ ماوجدنا علیه آبائنا ہر نبی کے مخالفوں نے یہی راگ الاپا۔ قرآن نے اس روایت پرستی کی شدید مذمت کی ہے اور تاریخ سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ اقبال جیسے جدت پسند اور انقلاب آفریں انسان کے ہاں حفظ روایات کا کوئی جامد مفہوم نہیں ہے۔ زندگی اپنے کسی انداز کو جوں کا توں نہیں دہراتی۔ ماضی سے صحت مندانہ ربط حیات آفرین ہوتا ہے لیکن ماضی کی مقلدانہ پرستش حیات ملی کو جامد کر دیتی ہے۔

غیر مسلم اور متعصب مخالفین اسلام نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسلام نے عورت کو بہت ادنیٰ مرتبہ دیا ہے۔ اس اعتراض کا نشانہ مسلمان اس لیے بنے کہ اُنھوں نے اپنی معاشرت میں اسلام سے بیگانہ ہوتے ہوئے عورتوں کو رسوم و رواج اور مردانہ خود غرضی کے پیدا کردہ غلط آئین کی بدولت بہت کچھ بے بس بنا دیا۔ اسلام نے جو حقوق عورتوں کو عطا کیے تھے۔ مسلمانوں نے رفتہ رفتہ ان کو سلب کر لیا اور ان نادانوں اور ہوس پرستوں کی وجہ سے اسلام بدنام ہو گیا۔ اسلام میں عورت اور ماں کا جو رتبہ ہے اس پر اقبال نے رموزِ بیخودی میں ایک بلیغ نظم لکھی ہے۔

خدا نے مرد و زن کو ایک دوسرے کا لباس بنایا، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر اقدار حیات کے لباس سے عریاں ہو جاتا ہے۔ عشق حق کا آغاز ماں کی محبت سے ہوتا ہے:

عشق حق پروردہ آغوش او

رسول کریم ﷺ نے خوشبو، نماز اور عورت کی مثلث مقدس کو اس دُنیا کی پسندیدہ چیزیں قرار دیا ہے۔ یہ تینوں جسمانی اور روحانی لطافتوں کا جوہر ہیں۔ جس مسلمان نے عورت کو محض اپنا پرستار اور اپنے ادنیٰ اغراض کا تختۂ مشق سمجھ لیا وہ قرآن کی حکمت سے بے بہرہ رہا:

بہرہ از حکمت قرآن نہ برد　　مسلمے کو را پرستارے شمرد

اسلام نے جنت کا مقام ماں کے قدموں کے نیچے قرار دیا۔ اُمت اور امومت میں گہرا معنوی ربط ہے۔ نبی کی شفقت اپنی اُمت پر بھی مادرانہ شفقت ہوتی ہے۔ سیرت اقوام انبیا کی تعلیم اور مثال سے بنی ہے یا اچھی ماؤں کی شفقت اور تربیت سے:

سیرت اقوام را صورتگر است　　شفقت او شفقت پیغمبر است

حرف اُمت رازہا دارد بسے　　ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے

انسانی روابط میں محبت کا رشتہ قائم کرنے کے لیے قرآن تکریم ارحام کی تعلیم دیتا ہے۔ انسانی زندگی میں امومت کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی بے علم ماں جو ظاہری حسن و جمال نہ رکھتی ہو، سادہ اور کم زبان ہو لیکن ایک غیور مسلمان حق پرست اس کے بطن سے پیدا ہو اور اس کی آغوش میں پرورش پائے تو بقاو احیائے ملت کے لیے ایک اتنا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ بڑے بڑے تعمیری کام اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں جن پر مرد فخر کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی نازک اندام، پری وبعض مغربی عورتوں کی تقلید میں تہی آغوش رہے اور بار امومت کو اپنے لیے بار خاطر سمجھے تو اسے عورت نہیں کہنا چاہیے۔ ایسی عورت انسانیت کے لیے باعث شرم ہے حیانا آشنا آزادی ملت کشی کا سامان ہے۔ بے شمار ارواح جو وجود پذیر ہونے کے لیے مضطرب ہیں وہ امہات کی بدولت عالم ممکنات سے عالم وجود میں آتی ہیں۔ کسی قوم کا سرمایۂ نقد وقماس وسیم وزر نہیں بلکہ اچھے انسان ہیں جو خیابان ریاض مادر سے گل ولالہ کی طرح چمن افروز ہستی ہوتے ہیں۔

جس قوم میں عورتوں کی زندگی احترام سے محروم ہے وہاں مردوں کو بھی حیات صالح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ کسی قوم کی تہذیب کو جانچنے کا صحیح معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس میں عورت کا کیا مقام ہے، اگر عورت ذلیل ہے تو قوم بھی ذلیل اور تہذیب سے عاری ہے:

از خیابان ریاض امہات　　بردمد ایں لالہ زار ممکنات

نیست از نقد و قماش وسیم و زر　　قوم را سرمایہ اے صاحب

تر دماغ وسخت کوش و چاق و چست　　مال او فرزند ہائے تندرست

قوت قرآن و ملت مادراں　　حافظ رمز اخوت مادراں

مسلمان عورتوں کے لیے اسوہ کاملہ سیّدہ النسا فاطمۃ الزہرا ؓ ہیں۔ عیسوی دُنیا مریم طاہرہ وصدیقہ کی پرستش کرتی ہے، مسلمانوں کے دلوں میں بھی حضرت مریم کا بڑا احترام ہے اور یہ فقط اس نسبت سے ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہیں اور ان کی عفت کا خدا شاہد ہے۔ لیکن فاطمۃ الزہرا تین بلند پایہ نسبتوں کا مرکز ہیں، ایک عظیم المرتبت نبیؐ کی بیٹی، علیؓ جیسے جلیل القدر انسان کی بیوی اور امام الشہدا حضرت امام

حسینؓ کی ماں۔ تمام دُنیا کی تاریخ کوٹٹولیے اور قسم کی تین نسبتیں ایک عورت میں کبھی جمع نہ پاؤ گے۔ حضرت امام حسینؓ کی حریت آموز سیرت کا سرچشمہ اخلاق پدر بھی ہے اور اخلاق مادر بھی لیکن ماں کی سیرت فرزند میں زیادہ موثر ہوتی ہے اس لیے کہ بیداری شعور سے پہلے اس کے اثرات تحت الشعور میں مرتسم ہو جاتے ہیں:

سیرت فرزند ہا از امہات　　جوہر صدق و صفا از امہات

فاطمۃ الزہرا ایک یہودی محتاج کی مدد کے لیے اپنی چادر فروخت کر ڈالتی ہیں، عرب کے بادشاہ کی بیٹی ہیں لیکن کوئی خدمت گار نہیں۔ قرآن کی آیات دہرائی ہوئی چکی پیستی رہتی ہیں:

آں ادب پروردہ صبر و رضا　　آسیا گردان و لب قرآن سرا

رشتہ آئین حق زنجیر پاست　　پاس فرمان جناب مصطفیٰؐ ست

ورنہ گرد تربتش گردیدمے　　سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

اس کے بعد مسلمان عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال ان کو دور حاضر کے فتنوں سے آگاہ کرتا ہے جو عورت کی طینت پاک کی تخریب کے در پے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تقلید فرنگ پر مسلمان عورت دین و اخلاق سے کنارہ کش ہو کر جھوٹی آزادی کے چسکے میں اپنی پاکیزہ فطرت کو خیر باد کہہ دے:

دور حاضر تر فروش و پر فن است　　کاروانش نقد دیں را رہزن است

کور و یزداں ناشناس ادراک او　　ناکساں زنجیری پیچاک او

ہوشیار از دستبرد روزگار　　گیر فرزندان خود را در کنار

نسوانی فطرت میں خدا نے بلند جذبات رکھے ہیں، ان کی حفاظت فاطمۃ الزہرا کے نمونے پر زندگی بسر کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگر اس فطرت کو پاک رکھا گیا تو حسینؓ من انسان آغوش مادر میں تربیت حاصل کر سکتے ہیں:

تا حسینے شاخ تو بار آورد　　موسم پیشیں بگلزار آورد

سورۂ اخلاص توحید کی تعلیم کا لب لباب ہے۔ قرآنی فصاحت کا کمال ہے کہ چار مختصر جملوں نے توحید کے قلزم ذخار کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ تمام قرآن توحید ہی کی تشریح ہے اور تمام حکمت بھی توحید ہی کے اندر پنہاں ہے۔ دین کی اصل توحید ہے باقی جو کچھ ہے وہ اس کی فرع ہے اس لیے مثنوی رموزِ بیخودی کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے سورۂ اخلاص ہی کی مختصر مگر بلیغ شرح لکھی ہے۔

فرماتے ہیں کہ مجھے خواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دیدار نصیب ہوا، میں نے عرض کیا کہ آپ نے اسلام کی اساس کو پختہ کرنے میں غیر معمولی بصیرت و ہمت و ایثار سے کام لیا، اب اس ملت کی بنیادیں

متزلزل ہو رہی ہیں، اس تعمیر کو سنبھالنے کے لیے کوئی علاج تجویز فرمایے:

پختہ از دستت اساس کار ما　　چارۂ فرما پے آزارِ ما

اس کا جواب یہ ملا کہ مسلمان اس توحید سے بیگانہ ہو گئے جو وحدت آفرین تھی۔ اسلام نے نسلی اور قبائلی امتیازات کو مٹا کر ایک ملت بنائی تھی لیکن اب تمہارا یہ حال ہے کہ تم پھر قبائل پرستی پر اُتر آئے ہو۔ گویا اسلام سے قبل کے زمانہ جاہلیت کی طرف عود کر آئے ہو جس میں سب سے زیادہ مؤثر جذبہ قبیلوی عصبیت تھا:

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ　　وائے بر تو آنچہ بودی ماندہ
بایکی ساز از دوئی بردار رخت　　وحدت خود را مگرداں لخت لخت

زبان سے وحدت کا کلمہ پڑھتے ہو اور عمل سے ملتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہو۔ توحید اگر وحدت ملت میں مشہود نہ ہوئی تو وہ محض ایک لفظ بے معنی رہ گئی۔ جو ایمان عمل میں منعکس نہ ہو وہ ایمان ہی مردہ ہے:

صد ملل از ملتے انگیختی　　بر حصار خود شبخون ریختی
یک شو و توحید را مشہود کن　　غائبش را از عمل موجود کن
لذت ایمان فزاید در عمل　　مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

اللّٰہ الصمد

صمد کے معنی ہیں وہ ہستی جو کسی غیر اور ماسوا کی محتاج نہ ہو مگر تمام مخلوقات و موجودات اپنے وجود کے لیے اس کے محتاج ہوں۔ تخلقوا باخلاق اللہ کی تعلیم کے مطابق مسلمان کو بھی اپنے اندر یہ بے نیازی کی صفت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انسان کو حاجات کا شکار نہیں ہونا چاہیے، احتیاج انسان کے نفس کو کمزور کر دیتی ہے اور تمام قوت و محبت اور ایثار کو سلب کر لیتی ہے۔ بے نیازی مال و جاہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ ''آنانکہ غنی تر اند محتاج تر اند'' یہ طبیعت کا ایک انداز ہے جو نادار کو قارون پر فضیلت بخشتا ہے۔ اسی بے نیازی کی بدولت انسان راست باز ہوتا ہے، خوددار ہوتا ہے اور نشتر 'لا و نعم' اس کے سینے میں نہیں چبھتا۔ دُنیا عالم اسباب ہے لیکن انسان کو بندہ اسباب نہیں بننا چاہیے:

بندہ حق بندۂ اسباب نیست　　زندگانی گردش دولاب نیست
مسلم استی بے نیاز از غیر شو　　اہل عالم را سراپا خیر شو

رزق کے لیے دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنا خودی کو سوخت کر دیتا ہے۔ دانا مسافر کو جب دشوار گزار راستوں سے دور دراز کا سفر درپیش ہوتا ہے تو اشد ضروری چیزوں کے علاوہ فالتو سامان اپنے اُوپر

نہیں لادتا۔ سفر زندگی میں بھی فروانی سامان سے آسائش کی کوشش نہ کرو، یہ سامان تمہارے لیے گلے کا طوق اور زنجیر پا ہو جائے گا۔ فراوانی کی کوشش تم کو حقیر انسانوں کے سامنے نیاز مند بنا دے گی:

گرچہ باشی مور و ہم بے بال و پر　　حاجتے پیش سلیمانے مبر
راہ دشوار است سامان کم بگیر　　در جہاں آزاد زی آزاد میر

حکیم سقراط کا بھی ایک قول مشہور ہے کہ کم احتیاج انسان الوہیت کے صفات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے کیوں کہ خدا بھی بے احتیاج ہونے کی وجہ سے بے نیاز ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی یہی نصیحت فرماتے تھے اور اس کا بہترین نمونہ خود تھے: اقلل من الدنیا تعش حرا۔ دُنیاوی حاجتوں کو کم سے کم کرو، آزادی اور حریت کی زندگی اسی طرز عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ مردِ حُر کو فقط اتنے ہی مال کی ضرورت ہے جو اس کو سائل اور گداگر ہونے سے محفوظ رکھے۔ مال کا مصرف یا خدمت خلق ہے یا اپنی خود داری کی حفاظت مگر مال کی محبت کے بغیر منعم ہونا سائل ہونے سے بہتر ہے:

تا توانی کیمیا شو گل مشو　　در جہاں منعم شو و سائل مشو

بے نیازوں کی جائز ضرورتیں پورا کرنے کا مشیت الٰہی میں ایک پنہاں قانون موجود ہے:

خود بخود گردد درمیخانہ باز　　برتہی پیمانگان بے نیاز

رسول کریم ﷺ سے زیادہ مال سے بے نیاز شخص کون ہو گا لیکن خدا نے ان کی ہر ضرورت بڑی ہو یا چھوٹی، بے منت غیرے ہمیشہ پوری کی۔ جو شخص چاہے کاہلانہ بے پروائی نہیں بلکہ عارفانہ بے نیازی کو شیوہ بنا کر اس کو اپنی زندگی میں آزما کر دیکھ لے۔ یہاں بوعلی قلندر کا ایک شعر علامہ اقبال نے نقل کیا ہے:

پشت پا زن تخت کیکاؤس را　　سر بدہ از کف مدہ ناموس را
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خلیفہ ہارون الرشید کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اس نے امام مالک سے درخواست کی کہ دارالخلافت بغداد میں آ کر اپنی مسند بچھایے، یہاں بڑی رونق اور زندگی کی گہما گہمی ہے۔ یہاں ہر قسم کی قدردانی ہو گی۔ اس مرد خوددار اور عاشق رسولؐ نے مدینے سے ہلنا گوارا نہ کیا۔ فرمایا کہ میں یہاں بندۂ آزاد ہوں اور میرا سر آستانہ رسولؐ پر ہے۔ عشق خدا اور رسولؐ مجھے کہتا ہے کہ تو بادشاہوں کو اپنا خدمت گزار بھی نہ بنا، چہ جائیکہ میں بادشاہوں کا ملازم ہو جاؤں۔ اگر علم دین کا شوق ہے تو یہی مدینے میں تشریف لایئے، پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا:

تو ہمی خواہی مرا آقا شوی　　بندہ آزاد را مولا شوی
بہر تعلیم تو آیم بر درت　　خادم ملت نگردد چاکرت

بہرہ خواہی اگر از علم دین　　درمیان حلقہ درسم نشین
بے نیازی رنگ حق پوشیدن است　　رنگ غیر از پیرہن شوئیدن است

اے مسلمان تیری ذلت کا سبب یہی ہے کہ تجھ میں خودداری کا فقدان ہے۔ اغیار کے علوم پڑھتے ہو اور مقلدانہ فطرت کی وجہ سے ہر خیال کو بے چون و چرا قبول کر لیتے ہو۔ اغیار کے شعار سے ارجمند ہونا چاہتے ہو۔ تمہاری عقل افکار غیر سے پا بہ زنجیر ہے تمہاری زبان پر جو باتیں ہیں وہ تمہارے اپنے دل و دماغ کی پیداوار نہیں، تمہاری آرزوئیں بھی دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہیں:

بر زبانت گفتگوہا مستعار　　در دل تو آرزو ہا مستعار

اے مسلمان تو اپنے نبیؐ کا فرمان بھول گیا ہے جو شخص دوسری اقوام سے مشابہت پیدا کرتا ہے وہ انہیں میں سے ہو جاتا ہے اور ملت اسلامیہ کا فرد نہیں رہتا:

لست منی گویدت مولائے ما　　خاک بردی کیمیا درباختی
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت　　قوم قوم آمد کہ جز با خود نساخت

لم یلد و لم یولد

خدا کے ہاں صلبی پیدائش کا کوئی سوال نہیں، علامہ فرماتے ہیں کہ مرد موحد خدا کی اس صفت سے بھی ایک سبق حاصل کر سکتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے تو ہر انسان کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ ہے لیکن یہ جسمانی ولدیت بہت ثانوی چیز ہے۔ حضرت سلمان فارسی سے لوگوں نے ان کا شجرہ نسب پوچھا تو اُنھوں نے جواب دیا ''سلمان ابن اسلام''۔ مسلمان کی اصل نسبت اسلام سے ہے، اب وام سے نہیں۔ توحید پر ایمان لانے سے ایمان کی کیفیت شہید کی سی ہو جاتی ہے جس میں ہزاروں پھولوں کا رس اس طرح آمیختہ ہے کہ کوئی قطرہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری اصل لالہ ہے یا گلاب یا نرگس۔ لم یلد و لم یولد کا پرتو اگر مومن کی زندگی پر پڑے تو اس کے احساس ملی میں نسب کوئی مقام نہ ہو:

قوم تو از رنگ و خوں بالا تر است　　قیمت یک اسودش صد احمر است
قطرہ آب وضوے قنبرے　　در بہا بر تر ز خون قیصرے
گر نسب را جزو ملت کردہ　　رخنہ درکار اخوت کردہ

مسلمان کا نہ کوئی وطن ہے اور نہ کوئی رشتہ نسب اس کے لیے کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا وطن بھی اسلام اور اس کا نسب بھی اسلام۔ عشق محمدؐ اس تمام ملت کا شیرازہ بند ہے جو اطراف و اکناف عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں عقائد اور فقہ میں بہت سے اختلاف پائے جاتے ہیں اور ہر

فرقہ وجہ اختلاف کو اس قدر اساس تصور کر لیتا ہے کہ اس کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیتا ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے متعلق بھی تصورات میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی شخص اسلام دُنیا میں ایسا مل سکے جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہو اور محبت رسولؐ سے اس کا دل بالکل خالی ہو۔ راقم الحروف کو ایسے مسلمانوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا ہے جو جدید الحادی تعلیم کی بدولت دین کے بنیادی عقائد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے لیکن ناموس رسولؐ پر جان قربان کرنے کو تیار تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نفسیات اس بارے میں کیا کہتی ہے کہ بے دین ہونے کے باوجود ذکر رسولؐ پر میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ عقائد سے معرا ہونے کے باوجود یہ شخص ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے سراپا ایثار تھا۔ مسلمان کی اسی نفسیات کو، جسے الحاد بھی بدل نہ سکا، اقبال نے ان اشعار میں پیش کیا ہے:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم زین جہت با یک دگر پیوستہ ایم
عشق او سرمایۂ جمعیت است ہمچو خون اندر عروق ملت است

ترک فرنگ آلودہ ہو جائے یا چینی اشتراکیت کی لپیٹ میں آ جائے لیکن جب کبھی نسل و نسب میں مختلف کسی مسلمان سے ملتا ہے تو اس کے سینے میں اخوت کے جذبے کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب اس رشتے کی بدولت ہے جو عشق محمدیؐ نے پیدا کیا:

با شیر اندرون شد و با جاں بدر شود

(حافظ)

عشق در جان و نسب در پیکر است رشتۂ عشق از نسبت محکم تر است
عشق درزی از نسب باید گذشت ہم ز ایران و عرب باید گزشت
ہر کہ پا در بند اقلیم و جد است بے خبر از لم یلد و لم یولد است

ولم یکن لہ کفواً احد

تمام موجودات میں خدا کا کوئی ہمسر نہیں۔ یہ صفت بھی مرد مومن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لالہ سر کوہسار کی طرح وہ کسی گلچیں کے دامن میں نہیں پڑتا۔ وہ جہاں کے اندر ہے لیکن جہاں سے الگ اور بالاتر ہے۔ مومنوں کی ملت اسی طرح بے ہمتا ہو سکتی ہے کہ اس انداز کی کوئی اور ملت نہ ہو:

رشتہ با 'لم یکن' باید قوی تا تو در اقوام بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است ولاشریک بندہ اش ہم در نسازد با شریک

مومنوں کے متعلق جو انتم الاعلون کی بشارت دی گئی ہے، اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ نہ صرف دوسری ملتوں بلکہ فطرت کی تمام قوتوں سے بالاتر ہے۔ جس مومن اور جس ملت کے یہ صفات بیان کیے گئے ہیں وہ

اس وقت تو پردۂ عالم پر کہیں نظر نہیں آ رہی۔ مردمومن کی پرواز تو ایسی فلک رس ہونی چاہیے کہ اس کا طائر رُوح ستاروں میں دانہ چینی کرے بلکہ اپنی بلند پروازی میں افلاک کو پیچھے چھوڑ جائے۔ لیکن اس وقت مسلمان کا یہ حال ہے جیسے مٹی کے اندر بسنے والا کیڑا ہو جو فضائے ارضی سے بھی نا آشنا ہے۔ اپنے آپ کو پسماندہ اور ذلیل پا کر گردش ایام کا شکوہ کرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے اس کی یہ گت بنی ہے۔ مردمومن کی پرواز کا تو یہ حال ہے کہ:

طائرش منقار بر اختر زند   آنسوئے ایں کہنہ چیز پر زند

تو بہ پروازے پرے نکشودۂ   کرمک استی زیر خاک آسودہ

خوار از مہجوری قرآں شدی   شکوہ سنج گردش دوراں شدی

مثنوی کے اختتام میں بحضور سرور کائناتؐ مصنف کی عرض حال ہے۔

ویسے تو اقبال کا تمام کلام خلوص سے لبریز ہے اور اس کی دلدوز تاثیر اسی خلوص کی بدولت ہے۔ محض فن اور صناعی سے یہ دل رسی پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اس عرض حال میں خلوص اور عشق رسولؐ کا ایک ایسا ولولہ ہے کہ پڑھنے والے حساس انسان کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہے۔ اقبال کی صحبت سے فیض یاب احباب سب نے یہ دیکھا کہ شباب غفلت انگیز کے دور سے لے کر شیب عرفان اندوز تک اس عاشق رسولؐ کی یہی کیفیت رہی کہ رسولؐ کا نام سنتے ہی طبیعت پر رقت طاری ہو گئی، خواہ اقبال اس وقت رندوں کی محفل ہی میں ان کا ہم مشرب بن کر بیٹھا ہو۔ اس عرض نیاز میں پہلے عشق سے لبریز کچھ اشعار کہے ہیں، اس کے بعد اپنی داستان درد بیان کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اقبال کے معتقدین اس کو عارف باللہ اور مجدد عصر سمجھنے لگے تھے اور اس کی خامیوں کا ذکر اس کی توہین شمار ہوتا تھا لیکن لوگوں کی عقیدت سے ناجائز فائدہ اُٹھانا کبھی اقبال کا شیوہ نہ تھا، دم واپسیں میں وہ اپنی تمام حالت کو طشت از بام کرتا ہے اور اپنی تمام عمر پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ اپنا نامہ اعمال اس ہستی کے سامنے رکھتا ہے جو ناگفتہ بھی اس کے حال سے آشنا ہے۔ اپنی حالت کے ساتھ ساتھ ملت کی خدستہ حالی کو بھی پیش کرتا ہے۔ نہ اپنے متعلق کسی غلط تفاخر سے کام لیتا ہے اور نہ ملت اسلامیہ کو اس کی موجودہ حالت میں وہ اسلام پر عمل پیرا سمجھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ملت کا حال اس زمانے میں ایک جسد بے رُوح کی طرح ہے۔

شروع یہاں سے کرتا ہے کہ جب سے میری نظر کے سامنے رسول اللہؐ کی ہستی آئی تب سے میری یہی کیفیت ہے کہ رسولؐ مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گئے:

عشق در من آتشے افروخت است   فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

میری یہ کیفیت اس زمانے میں بھی تھی جب میں حسینوں سے عشق بازی کرتا تھا، ان کی صحبت میں

شراب پیتا تھا:

مدتے با لالہ رویاں ساختم　　عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم　　بر چراغ عافیت داماں زدم

شباب کی ان ہوس رانیوں کے ساتھ ساتھ میرے تفکر اور عقائد کی یہ حالت تھی کہ عقل صنم تراش نے مجھے پجاری بنا لیا تھا۔مگر خالی عقل وظن انسان کو کسی یقین تک تو نہیں پہنچاتے، چنانچہ میں بھی یقین و ایمان سے خالی حقائق حیات کے بارے میں شک میں گرفتار تھا اور یہ تشکیک میرے تفکر کا جزو لاینفک بن گئی تھی۔ ظن وگمان کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ایک طرف حسینوں کا عشق ہوس پرور اور دوسری طرف عقل آزر پیشہ، ان دو بجلیوں نے میرا حاصل سوخت کر دیا تھا، میرا متاع خیال و دماغ ان دو ڈاکوؤں کی دست برد سے نہ بچا:

برقہا رقصید گردِ حاصلم　　رہزناں بردند کالائے دلم
عقل آزر پیشہ ام زنار بست　　نقش او در کشورِ جانم نشست
سالہا بودم گرفتارِ شکے　　از دماغِ خشک من لاینفکے
حرفے از علم الیقین ناخواندۂ　　در گماں آباد حکمت ماندۂ

ایک عرصے تک اس ظلمت عقل و ہوس میں گمراہ رہنے کے بعد مجھے توفیق الٰہی سے ایمان و یقین حاصل ہوا اور اسرار قرآن مجھ پر منکشف ہونے لگے۔ مجھے جو بصیرت حاصل ہوئی میں نے اسے آب حیات سمجھ کر اس مردہ قوم کے حق میں ٹپکایا، مبدءِ فیاض نے نواگری عطا کی تھی، میں نے شمع نوا سے محفل میں روشنی پیدا کی:

مردہ بود، از آب حیواں گفتمش　　سرے از اسرار قراں گفتمش
محفل از شمع نوا افروختم　　قوم را رمز حیات آموختم

لیکن افسوس کہ اس مردہ قوم کو زندہ نہ کر سکا، اب اس کی نعش کو میں حضورؐ کے سامنے لایا ہوں کہ آپؐ ہی اس کے احیا کا کوئی سامان پیدا کریں۔ مجھے اسرار قرآنی پیش کرنے کا اس مردہ قوم سے یہ صلہ ملا کہ لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص فرنگستان سے کچھ باتیں سیکھ آیا ہے، اپنی شاعری سے وہی جادو ہم پر کرنا چاہتا ہے۔اس کے ساز میں سے جو آواز نکلتی ہے وہ حکمت قرآنی نہیں بلکہ ساز فرنگ کی غوغا آرائی ہے:

گفت برما بندد افسون فرنگ　　ہست غوغایش بہ قانون فرنگ

جس قوم کا یہ حال ہو اس کو میرے جیسا نواگر بے عمل کیا زندگی بخشے گا۔ مسلمان توحید و نبوت کے اسرار سے بیگانہ ہو گیا ہے۔اس نے بیت الحرام کو بت خانہ بنا دیا ہے۔اپنے آپ کو موحد اور برہمن کو مشرک

اور بت پرست کہتا ہے لیکن ہمارا شیخ، برہمن سے زیادہ کافر ہے۔ ایک پورا سومنات اس کے مغز کے اندر موجود ہے۔ کچھ عجمی تصورات کو اسلام سمجھ کر اپنے فکر و عمل انھیں کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس کے اندر قلب زندہ نہیں رہا، وہ کافر کی طرح موت سے ترساں ولرزاں ہے۔ یہ کافر مسلم نما مجھ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قرآن کی تعلیم کا ثمرہ نہیں ہے۔ اگر اس بارے میں میں نے اپنے آپ کو اور قوم کو دھوکا دیا ہے تو اے محبوب خداؐ اس کی سزا یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت میں سب کے سامنے رسوا کیا جاؤں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است　　در بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن　　ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوا و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

ملت کی اس خستہ حالت کو بیان کرنے کے ساتھ ہی اپنی اس کوتاہی کو بھی حضور سرور کائنات میں پیش کیا ہے کہ میری زندگی میں میرا عمل اس عشق و عرفان کا مظہر نہیں جو مجھے عطا ہوا اور جس سے میں نے دوسروں کو بھی زندہ کرنے کی کوشش کی۔ میری یہ عرض خدائے عزجل کے سامنے پیش کر دیجیے کہ عشق اور علم کی دولت دی ہے تو عمل کی توفیق بھی عطا ہو:

عرض کن پیش خدائے عزوجل　　عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جان حزیں بخشندہ ای　　بہرہ از علم دیں بخشندہ ای
در عمل پایندہ تر گرداں مرا　　آب نیسانم گہر گرداں مرا

ایک آرزو میرے دل میں ہمیشہ چٹکی لیتی رہی، لیکن میں شرم کے مارے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے اعمال میرے علم و عشق کے مقابلے میں نہایت پست تھے:

زندگی را از عمل ساماں نبود　　پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہار او آید مرا　　شفقت تو جرأت افزاید مرا

آرزو یہ تھی اور ہے کہ میری موت حجاز میں واقع ہو۔ تیرے دیار کے باہر تو مجھے دیر ہی نظر آتا ہے۔ بہت افسوس ہوگا کہ اگر میرے جسم کو بت خانے میں گاڑا جائے۔ اگر میں جو روضہ رسولؐ میں مدفون ہوں اور قیامت کے روز میرا حشر وہیں سے ہو تو میں اسے کمال سعادت سمجھوں گا:

حیف چوں او را سرآید روزگار　　پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من　　وائے امروزم خوشافردائے من
کو کبم را دیدۂ بیدار بخش　　مرقدے در سایہ دیوار بخش

افسوس ہے کہ اقبال کی اس آرزو کا اس انداز میں پورا ہونا تقدیرالٰہی میں نہ تھا، لیکن اس ہیچمدان کے

نزدیک اس کی آرزو پوری ہوئی۔ اقبال کی تعلیم یہ تھی کہ مومن کا پیوند کسی خاک سے نہیں ہوتا۔ مومن کے تمام روابط رُوحانی ہوتے ہیں۔ اقبال کو عالم گیر کی عظیم الشان شاہی مسجد کے سایہ دیوار میں مرقد نصیب ہوا۔ ہر مسجد خدا اور رسولؐ کا گھر ہے۔ یہ مسجد لاتعداد مسلمانوں کے درود وسجود کا محل ہے۔ رُوحانی لحاظ سے یہ بھی روضہ رسولؐ کا قرب ہے۔

اقبال جو اپنی بے عملی کا مسلسل اعلان کرتے رہے راقم الحروف اس سے متفق نہیں۔ کیا انسانوں کی بصیرت افروزی، ملت کی ہمت افزائی، عشق کی فراوانی اور ارزانی، تفکر کی وسعت اور ثروت، اعمال صالحہ میں داخل نہیں؟ میرے نزدیک یہ عمل ہزار عالموں، عابدوں، زاہدوں اور صوفیہ کی ریاضتوں سے زیادہ باقیمت ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ اقبال اس کو کیوں عمل شمار نہ کرتے تھے۔ میرے نزدیک اقبال کے عارفانہ اور عاشقانہ کلام کا ہر شعر عبادت میں داخل ہے۔ اس سے زیادہ خدمت خلق اور کیا ہوسکتی ہے کہ رہتی دُنیا تک لوگ اس کے کلام سے بلند ترین افکار اور تاثرات حاصل کرتے رہیں گے۔ یہ صدقۂ جاریہ ہے مومن کی زندگی کا نصب العین علامہ اقبال کے نزدیک اتنا بلند تھا کہ وہ اس عرش بوس بلندی کے مقابلے میں اپنے تیئں پستی میں محسوس کرتے تھے۔ مقصود کی بلندی کسی اعلیٰ درجے کے محسن انسان کو بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں رہنے دیتی۔ خوب تر کے مقابلے میں خوب بھی ناخوب دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کے کلام سے بعض افراد کی زندگی میں ایک انقلاب آفریں ہیجان پیدا ہوا۔ آئندہ بھی ملت اسلامیہ کے ہر انقلاب میں اقبال موجود ہو گا۔ جس شخص کا پیغام سراپا پیغام عمل ہو، کیا وہ سرچشمہ عمل خود عمل سے محروم ہے؟ لوگوں نے جس چیز کو عمل سمجھ رکھا ہے وہ اس حیات افزا پیغام وتلقین کے مقابلے میں اکثر پست ہی ہوتا ہے۔ اقبال کو اپنی بے عملی پر جو افسوس ہے وہ اس کی علو ہمت اور رفعت مقاصد کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں کے مقاصد پست ہوتے ہیں وہ ان مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور جو کچھ حاصل ہو جائے اس سے مطمئن بھی ہو جاتے ہیں لیکن گناہوں سے پاک اور اگلی پچھلی خطائیں بخشا ہوا نبی اپنی رُوحانی ترقی میں کسی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہوتا اور گنہگاروں سے زیادہ استغفار اس کا صبح وشام کا وظیفہ ہوتا ہے۔ عمل میں کوتاہی کا احساس ایمان کی قوت اور مقصد کی بلندی کا شاہد ہے، ادنیٰ درجے کے لوگ جن اعمال کو حسنات شمار کرتے ہیں، بلند مقصد اور بلند حوصلہ انسانوں کو ان میں سیئات کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

❁...❁...❁

استحکام خودی اور اس کا ہشت گانہ دستور العمل☆

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اقبال نے اپنا پیغام، جو استحکام خودی سے عبارت ہے، اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی میں مجملاً پیش کر دیا ہے۔ یہ کتابیں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد وہ تا دم وفات، اسی پیغام استحکام خودی کی توضیح وتشریح کرتے رہے جو اُنھوں نے ان دو بنیادی کتابوں میں پیش کیا تھا۔

اسرارِ خودی میں انفرادی خودی اور رموزِ بیخودی میں اجتماعی خودی کی تربیت کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔

رموزِ بیخودی کے خاتمے پر اُنھوں نے ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' کے ذیل میں آنحضرتﷺ کو یوں مخاطب کیا ہے:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

نیز زبورِ عجم میں اپنے پیغام کی بنیاد کی وضاحت بایں الفاظ کی ہے:

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام تا درخشی مثل تیغ بے نیام

اقبال نے اپنی ہر کتاب میں اس قسم کے اشعار لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام اور پیغام دونوں کا ماخذ اور منبع قرآن ہے جس کے بارے میں اُنھوں نے بڑے تحکمانہ انداز میں یہ کہا ہے کہ:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

☆ جناب یوسف سلیم چشتی نے اقبال اکادمی کے زیر اہتمام ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء کو ایک خصوصی لیکچر دیا تھا۔ یہ مضمون اس لیکچر کے اہم اقتباسات پر مشتمل ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　　جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

نوع انسان را پیام آخریں

حامل او، رحمۃ للعالمین

اس حقیقت کو، کہ اُن کے پیغام کا ماخذ، قرآن ہے، ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ جو شخص بھی اقبال کو قرآنی عینک کے بغیر پڑھے گا وہ حقیقی اقبال سے کبھی آشنا نہ ہو سکے گا۔ چونکہ مسلمانوں نے اقبال کو ترجمان القرآن کے بجائے محض ایک شاعر یا قومی شاعر یا فلسفی شاعر سمجھا اس لیے اُنھوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے بارگاہ رسالت میں یوں عرض کیا تھا:

ازاں رمزے کہ گفتم پے نہ بردند　　　ز شاخ نخل خرما بر نخوردند

من اے میر امم داد از تو خواہم　　　مرا یاراں غزلخوانے شمردند

کتنی عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۳ء میں بھی انھیں اپنی قوم سے یہی شکایت تھی۔ چنانچہ اسرار کے دیباچے میں کہتے ہیں:

آشنائے من ز من بیگانہ رفت　　　از خمستانم تہی پیمانہ رفت

من شکوہ خسروی او را دہم　　　تخت کسریٰ زیر پائے اور نہم

او حدیث دلبری خواہد زمن　　　آب و رنگ شاعری خواہد زمن

۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے پیامِ مشرق کے دیباچے میں اپنا موازنہ گوئٹے سے کیا ہے:

او چمن زادے چمن پروردۂ　　　من دمیدم از زمین مردۂ

اس ایک مصرع میں اُنھوں نے اپنے کرب باطنی اور احساس ناکامی کی مکمل داستان قلمبند کر دی ہے۔

بہر حال میرا مقصد اس تلخ حقیقت کے اظہار سے صرف یہ ہے کہ اقبال نے قوم کے سامنے استحکام خودی کا ایک دستور العمل پیش کیا تھا جسے قوم نے نہ اُن کی زندگی میں درخور اعتنا سمجھا اور نہ وفات کے بعد اس کی طرف توجہ کی۔ اسی لیے اُنھوں نے وفات سے ایک ماہ پہلے اپنے جذبات کا اظہار بایں الفاظ کیا:

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک　　　ہمہ گفتند با ما آشنا بود

ولیکن کسی ندانست ایں مسافر　　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

یعنی کسی نے نہ جانا کہ:

۱- میں نے کیا پیغام دیا　۲- کس کو پیغام دیا　۳- میرے پیغام کا ماخذ کیا تھا۔

اقبال یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی خودی کو مستحکم کر کے محض حکمرانی اور جہاں بانی پر اکتفا نہ کریں بلکہ نیابت وخلافت الٰہیہ کے مقام پر بھی فائز ہو جائیں جس کا وعدہ اللہ نے اُن سے بایں الفاظ کیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (۲۴:۵۵)

میں نے ایک مرتبہ اقبال سے پوچھا کہ آپ کے اس بنیادی پیغام (استحکام خودی) کی قرآنی بنیاد کیا ہے؟ تو اُنھوں نے فوراً جواب دیا ''کیا تم نے سورۂ مائدہ میں یہ آیت نہیں پڑھی؟ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵:۱۰۵)

دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے مومن کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ محبت میں اشد ہوتا ہے۔

والذین آمنوا اشد حباً للّٰہ۔

تیسری بات: قرآن کی رُو سے اللہ سے محبت کا طریقہ اتباع رسول ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

چوتھی بات: قرآن کی رُو سے اتباع رسول کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ (اُس) متبع رسول سے محبت کرنے لگتا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ دراصل مومن وہ ہے جو اللہ کو اپنا محبوب بناتا ہے۔مومنانہ زندگی کی روح محبت الٰہی ہے۔اسی لیے اقبال نے یہ چونکا دینے والی بات کہی:

طبع مسلم از محبت قاہر است مسلم ار عاشق نباشد، کافر است

میری رائے میں، موجودہ زمانے میں مذکورہ بالا حقیقت کو واضح کرنا، سب سے بڑی دینی اورقومی خدمت ہے۔

اقبال کے پیغام کی قرآنی بنیادوں کو واضح کر دینے کے بعد، اب میں انھی کے الفاظ میں استحکام خودی کا دستورالعمل پیش کرتا ہوں۔فرماتے ہیں:

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار تا کمند تو کند یزداں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں ترک خود کن، سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو، سوئے خود گام زن لات و عزائے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا

ثمرہ:

شرح انی جاعلٌ سازد ترا

اس پروگرام کا پہلا شعر بطور تمہید ہے اور قرآن کی مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ ہے۔ ان کنتم تحبون الله، فاتبعونی یحببکم الله۔ اس آیت میں تین واضح جملے ہیں: آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ:

۱- اگر تم اللہ سے محبت کی آرزومند ہو
۲- تو میری (ذات رسالت) اتباع یعنی تقلید کرو
۳- ثمرہ اس تقلید کا یہ ہوگا کہ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا

اب اس شعر کو ملاحظہ کیجیے۔ اس میں بھی تین باتیں یا تین جملے ہیں:

۱- کیا تو عاشق ہے؟ اگر ہے
۲- تو اپنی خود کو اتباع رسول یا تقلید یار کی بدولت مستحکم یا محکم کر لے
۳- ثمرہ اس استحکام خودی کا یہ ہوگا کہ تو خود یزداں کو اپنی کمند محبت میں گرفتار کر لے گا یعنی یزداں تجھ سے محبت کرنے لگے گا۔

آئندہ تین شعروں میں ''تقلید یار'' کو بالتفصیل بیان کیا ہے اور اس تفصیل ہی میں استحکام خودی کا طریق ہشت گانہ (The eightfold Programme of Self-fortification) مندرج ہے۔

آخری شعر میں استحکام خودی کے اقتضا پر عمل کا منطقی نتیجہ واضح کر دیا ہے یعنی یہ کہ مقلد رسول خلافت الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو جائے گا۔

اب میں ان تین اشعار کی شرح کیے دیتا ہوں جن میں استحکام خودی کا طریق ہشت گانہ بیان کیا گیا ہے۔ استحکام خودی کی

پہلی منزل: اندر کے اندر حرائے دل نشیں

جس طرح آنحضرت ﷺ نے کچھ عرصہ غار حرا میں خلوت اختیار کی تھی تو بھی اسی طرح خلوت اختیار کر اور اس کے لیے تو اپنے ''دل'' کو غار حرا بنا لے تا کہ تجھے اس طویل سفر کی زحمت لاحق نہ ہو اور اس خلوت میں وہی کام کر جو آنحضرت ﷺ نے کیا تھا۔ اگر تجھے یہ بات معلوم نہ ہو تو کسی واقف کار یار درویش بے گلیم سے پوچھ لے۔

حدیث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

دوسری منزل: ''ترک خود کن'' اپنی خودی کو ترک کر دے۔

یہاں اقبال وہی تعلیم دے رہے ہیں جو "پاکان امت" ابتدا سے دیتے چلے آرہے ہیں۔ وہ خود اپنی آخری تصنیف ارمغان حجاز میں آخری بات یہی کہتے ہیں: غور سے سنیے

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم   حدیث عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکان امت   ترا باشوخیِ رندانہ گفتم

پاکان امت نے ترک خودی سے ترک خواہشات نفس مراد لی ہے نہ کہ نفیِ خود یا نفیِ ذات جیسا کہ بعض لوگ اپنی نادانی کی بنا پر سمجھتے ہیں اور ان کے بارے میں سوءِظن سے کام لیتے ہیں۔

قصہ کوتاہ اقبال بھی ترک خودی سے ترک خواہشات نفس مراد لیتے ہیں۔

تیسری منزل: سوئے حق ہجرت گزیں یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی کے بجائے حق کے احکام کی پیروی کرو۔ جب تک ترک خودی کی منزل طے نہیں ہوگی، ہجرت الی الحق محال ہے۔

چوتھی منزل: محکم از حق شو یعنی اطاعت احکام ایزدی سے اپنی خودی کو مستحکم کرلو۔

پانچویں منزل: "سوئے خود گام زن" اب اپنی خودی کی طرف واپس آجاؤ یعنی اب تمھاری خودی وہ شیطانی خودی نہیں ہے جو تمہیں برائی کی طرف آمادہ کیا کرتی تھی جس پر اِن النفس لا مارة بالسوء شاہد ہے۔ بلکہ اب تمھاری خودی اطاعت احکام الٰہی سے مسلمان ہو چکی ہے۔ اس لیے اب اس کے احکام پر عمل کرسکتے ہو۔

چھٹی منزل: لات وعزائے ہوس را سرشکن

چنانچہ اب تمھاری خودی جو محکم از حق ہونے سے پہلے تمہیں لات وعزائے ہوس کی عبادت کی تعلیم دیا کرتی تھی، اپنی قلب ماہیت کی وجہ سے اس قدر مستحکم ہو چکی ہے کہ اب وہی خودی ان بتوں کو پاش پاش کر سکتی ہے لہٰذا اب تم اللہ کا نام لے کر کعبۂ دل کو اسی طرح بتوں سے پاک کردو جس طرح آنحضرتؐ نے کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک کیا تھا۔ اگر صحابہ کرامؓ اتباعِ رسول کی بدولت، اپنی اجتماعی خودی کو مستحکم نہ کر لیتے تو وہ لاکھ آرزوؤں کے باوجود خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک نہیں کر سکتے تھے۔

اگر پاکستان کے مسلمان اس سرزمین کو پاک کرنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی اجتماعی خودی کو اتباع رسول کی بدولت مستحکم کرنا لازمی ہے۔

ساتویں منزل: لشکرے پیدا کن از سلطان عشق

اب تم اس قابل ہو کہ عشق کی برہان کی مدد سے ایک لشکر مجاہدین تیار کرو جس کے ہر مجاہد نے اتباعِ رسول سے اپنی انفرادی خودی کو مستحکم کرلیا ہو۔

آٹھویں منزل: جلوہ گر شو بر سر فاران عشق

اب فارانِ عشق یعنی مقامِ عشقِ الٰہی پر فائز ہونے کے بعد، باطل کو چیلنج دو اور اللہ کا نام لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑو۔ جس طرح صحابہ کرام اللہ کا نام لے کر بدر کے میدان میں کود پڑے تھے۔

اسی دستور العمل ہشت گانہ کا خلاصہ اقبال نے دو مرحلوں میں بیان کر دیا ہے۔ مرحلہِ اوّل: اطاعت الٰہی۔ مرحلہِ دوم: ضبطِ نفش اور اس کا ثمرہ نیابت الٰہی ہے۔ دراصل یہ استحکام خودی یا ضبط نفس (Self Control) کا پروگرام قرآن سے ماخوذ ہے مگر مسلمانوں نے چونکہ ایک عرصہِ دراز سے قرآن کو ضابطہِ حیات کے بجائے ''تبرک'' سمجھ رکھا ہے جیسا کہ اقبال کے اس شعر سے واضح ہے:

با یاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از یٰسین او آساں بمیری

اس لیے انھیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ پہلی وحی جس میں احکام نازل ہوئے سورۂ مزمل کی ابتدائی گیارہ آیات پر مشتمل ہے جن میں ضبطِ نفس، تزکیۂ نفس یا تربیت خودی (استحکام خودی) کا ہشت گانہ پروگرام مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

غور کیجیے:

۱-	قم اللیل الا قلیلا	۵-	فاتخذہ وکیلا
۲-	رتل القرآن ترتیلا	۶-	وصبر علی ما یقولون
۳-	واذکر اسم ربك	۷-	واھجرھم ھجراً جمیلا
۴-	وتبتل الیه تبتیلا	۸-	وذرنی المکذبین ومھلھم قلیلاً

افسوس کہ ان آیات کی تشریح میرے موضوع سے خارج ہے۔ یہ آیات میں نے محض اس لیے لکھ دی ہیں کہ میرا دعویٰ ثابت ہو سکے۔ اقبال کی ساری تعلیمات قرآن و حدیث یا ارشادات پاکان امت پر مبنی اور انھی سے ماخوذ ہیں۔

اب رہا تزکیۂ نفس یا ضبطِ نفس کا پروگرام تو یہ اقبال یا اسلام سے مختص نہیں ہے۔ تمام بڑے مذاہب نے ضبطِ نفس یا استحکام خودی کا ضابطہ انسانوں کو دیا ہے مثلاً بودھ دھرم میں تزکیۂ نفس کے لیے اشٹنگ مارگ یا طریق ہشت گانہ متعین کیا گیا ہے۔

جین دھرم میں اسی مقصد کے لیے طریق دہ گانہ اور ہندو دھرم میں طریق ہشت گانہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ چونکہ ان مذاہب کے دساتیر العمل کی تفصیل میرے موضوع سے خارج ہے اس لیے اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔ بس اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ استحکام خودی کی تعلیم دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہے کیونکہ ضبطِ نفس کے بغیر کوئی شخص نہ روحانی ترقی کر سکتا ہے نہ اخلاقی۔ یعنی شخصیت کی تشکیل اسی تزکیۂ نفس پر موقوف ہے۔

اسی لیے سرکارِ دو عالم ﷺ نے مکہ میں پورے بارہ سال تک صحابہ کے نفوس کا تزکیہ فرمایا تھا۔ جسے اقبال نے استحکام خودی سے تعبیر کیا ہے۔ یوں سمجھو جسے قرآن تزکیۂ نفس کہتا ہے اقبال اسی چیز کو استحکام خودی یا تربیت خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہر حال استحکام خودی کا نتیجہ ۲ھ میں جنگِ بدر میں کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے اس حقیقت عظمیٰ کو یوں بیان کیا:

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھکو بدر سے غار حرا پہلے

یعنی اگر آنحضرتؐ سب سے پہلے صحابہ کی خودی کو مستحکم نہ کرتے تو جنگِ بدر میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔

ٹھیک اسی طرح اقبال یہ چاہتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنی خودی کو مستحکم کر لیں تا کہ باطل سے پنجہ آزما ہو سکیں اور کامیابی کے بعد جب اللہ انھیں حکومت عطا فرمائے تو وہ صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کے نقوش قدم پر چل سکیں۔ اور اس حقیقت کے واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جو قوم اپنی خودی کو مستحکم نہیں کرتی وہ اگر برسرِ حکومت آ جاتی ہے تو ہر قدم پر غلطیاں کرتی ہے اور اس طرح ضلوا واضلوا کا مصداق بن جاتی ہے۔ (شرح رموزِ بیخودی از یوسف سلیم چشتی)

رموزِ بیخودی۔۔ تبصرہ

پروفیسر اے۔ جے۔ آربری
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مستقبل کا مؤرخ جب ہمارے دور کے اہم واقعات کا جائزہ لے گا تو بلاشبہ ان میں دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد تقریباً دس کروڑ افراد کی ایک ایسی قوم کے اچانک اور حیران کن ظہور کو انتہائی اہم واقعہ قرار دے گا جس کی قومیت کا دعویٰ مذہب کی بنیاد پر تھا اور افراد کی بہت بری اکثریت اسی مذہب سے وابستہ تھی۔ ہم ابھی ظہورِ پاکستان کے اتنے قریب ہیں کہ پوری طرح ہندوستان کے مسئلے کے اس ڈرامائی حل کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں، جس نے ہمارے آباء واجداد کے ذہنوں کو پریشان کیے رکھا تھا۔ تاہم اخباروں کا سرسری مطالعہ کرنے والا قاری بھی اب قیامِ پاکستان اور دنیا کی سیاست کے اہم رجحانات پر اس کے اثرات کو کسی قدر سمجھنے لگا ہوگا۔ اقوامِ متحدہ کے مباحثوں میں پاکستانی مندوب نے اس قدر توجہ اور عزت حاصل کی ہے کہ خواہ وہ مسئلہ کشمیر کی بات ہو یا مراکش اور تیونس کے احساسات کی ترجمانی، بین الاقوامی سیاسی منظر کا کوئی انتہائی کند ذہن مبصر ہی ہوگا جو اب بھی محسوس نہ کرتا ہو کہ یہ نیا ملک دنیا کی تاریخ کے آئندہ ڈرامے میں ایک نہایت اہم کردار ادا کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔

جب مستقبل کا مؤرخ ان اسباب کا تجزیہ کرے گا جو ظہورِ پاکستان کا سبب بنے تو وہ لازماً ایک ایسی شخصیت کی تحریروں کو بھی مدِنظر رکھے گا جو بعض لوگوں کے بقول اس عظیم مملکت کی خالق اور بعض لوگوں کے بقول خالقوں میں سے ایک تھی ـــــ سر محمد اقبال (۱۹۳۸ء تا ۱۸۷۷ء) جسے ولفرڈ اینٹول سمتھ نے اپنی اہم کتاب ہندوستان میں جدید اسلام میں اس صدی کا ممتاز مسلمان شاعر اور مفکر قرار دیا ہے اور جس کی عظمت کا پیمانہ اسے حاصل ہونے والی بین الاقوامی توجہ اور عزت قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستانی صوبوں کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے اُنھوں نے ایک خواب دیکھا تھا مگر اس کی خلاف توقع فوری تعبیر سے پہلے ہی وہ وفات پا گئے۔ ان کی زندگی کے آخری چند سال ذہنی اور جسمانی کرب میں بسر ہوئے مگر انھیں یہ سکونِ

قلب نصیب نہ ہو سکا کہ جس مقصد کے لیے میں نے اس قدر جدوجہد کی ہے، وہ حاصل ہونے ہی والا ہے۔ لیکن آزادیِ پاکستان کے ساتھ ہی مطبوعات کی ایک لہر آئی جس میں انھیں دنیا کی اس متمول ترین اور سب سے زیادہ آباد مسلم مملکت کے روحانی بانی کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس سند کو آج بھی اسی قدر اہمیت دی جاتی ہے۔

اقبال شاعر ہونے کے علاوہ ایک فلسفی بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنا فلسفہ نثر کی بجائے شاعری میں پیش کرنے کو ترجیح دی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ مغرب میں مقابلتاً کم مشہور ہیں اور ان کے بارے میں غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ نثری تحریریں زیادہ تر انگریزی میں ہیں جب کہ شاعری اُردو اور فارسی میں ہے جو اُن زبانوں کے ادبیات کی روایتی تصویروں سے بھری پڑی ہے۔ جب اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو لامحالہ یہ کس قدر دور از کار اور اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کا اسلوب با محاورہ ہے اور کم ہی اتفاق ہوتا ہے کہ ان کی فکر پیچیدہ نہ ہو۔ ان کا اظہار اپنی زبان کی نوعیت کے اعتبار سے بے حد نازک ہوتا ہے۔ جب کہ ان کے ہاں شعری متصورہ کی بہتات اُس قاری کو بوکھلا دیتی ہے جو اس کی فوری تبدیلیوں اور خطابیہ تنوع کی سطح کے نیچے پائی جانے والی فکری ہم آہنگی سے آگاہ نہیں ہوتا۔ میرے علم میں ایسا کوئی اور مشرقی شاعر نہیں ہے جو مترجم کے لیے ایسی مختلف النوع اور کڑی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

اقبال کی عظمت پہلی مرتبہ اسرار خودی کی اشاعت سے آشکار ہوئی۔ یہ فارسی میں فلسفیانہ حماسہ ہے جس کا ترجمہ آنجہانی آر۔ اے۔ نکلسن نے سیکرٹس آف دی سیلف کے عنوان سے کیا ہے (میکملن: ۱۹۲۰ء)۔ اس نظم میں اُنھوں نے معاشرے میں فرد کی حیثیت کے بارے میں اپنے نظریات کا پہلا حصہ بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے نکلسن کو لکھا تھا: ''زمین پر خدا کی حکمرانی کا مطلب ہے کم و بیش منفرد اشخاص کی جمہوریت جس کی امارت دنیا کے ممکنہ حد تک سب سے زیادہ منفرد شخص کے پاس ہو۔ خودی یا انفرادیت اسرارِ خودی کا بنیادی نظریہ ہے۔ انسان کا اخلاقی اور مذہبی نظریہ نفیِ خودی نہیں، اثباتِ خودی ہے۔ اور یہ نظریہ زیادہ سے زیادہ منفرد اور زیادہ سے زیادہ یکتا ہو کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' اقبال کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ کسی حقیقی اسلامی معاشرے ہی میں ممکن ہے کہ فرد مکمل طور پر اثباتِ ذات کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔

ان کے نظریے کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی میں بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ میں مسٹریز آف سیلف لیس نس کے عنوان سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کا نظریۂ خودی اگر معاشرے سے الگ تھلگ رہ کر ارتقا پذیر ہو تو وہ غیر معتدل انائیت اور نراجیت پر منتج ہوتا ہے۔ تاہم وہ محض فرد اور اس کے انکشافِ ذات تک اپنی دلچسپیوں کو محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک نظریاتی معاشرے کے قیام کے بھی خواہش

مند ہیں، جسے وہ ملت کے لفظ سے یاد کرنا پسند کرتے ہیں۔ فرد ایک معاشرے کے رکن کی حیثیت سے تصادم اور ہم آہنگی کے توام اُصول کے ذریعے اپنے آپ کو بھرپور طریقے سے ظاہر کر سکتا ہے۔ اثباتِ ذات کرنے والے افراد ہی کے ذریعے ملت وجود میں آئی ہے اور تکمیل پاتی ہے۔ اسی طرح اقبال فرد کی آزادیوں پر پابندی لگا کر اسے مادر پدر آزاد آزادی سے بچاتے ہیں اور اسے ایک ہم آہنگ معاشرے کا فرد بناتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے کے اختیارات کو کم کر کے فرد کی خود شناسی کے راستے میں اسے نا قابلِ تسخیر رکاوٹ کی بجائے چیلنج بنا کر اسے آمریت سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ان دونوں نظموں میں مختصراً اور سادہ لفظوں میں یہی بنیادی خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ خیالات تو اتنے نئے نہیں ہیں، نہ ہی یہ دعویٰ نیا ہے کہ اسلام یک آدرشی معاشرہ ہے، تاہم نئی بات یہ ہے کہ اقبال نے فرد اور معاشرے کے اس نظریے کا اطلاق اسلام پر کیا ہے اور اسے اس حیثیت سے دنیا کے تمام مذہبوں اور نظاموں سے برتر قرار دیا ہے۔ اسلامی اتحاد کے لیے موجودہ زمانے میں پروپیگنڈا جمال الدین افغانی (۹۷-۱۸۳۸ء) کے دور سے اب تک مسلسل جاری ہے۔ اقبال اسی نقطۂ نظر کا جدید ترین بلکہ قابل ترین اور موثر ترین وکیل تھا۔ اس نے ایک ایسی تحریک کے لیے، جو عقلی سے زیادہ جذباتی ہے، ایک عقلی بنیاد مہیا کی۔

رموزِ بیخودی میں اقبال نے بین الاقوامی اسلام کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی، اقبال ایسی خلافت کے احیا کے بارے میں شدت سے سوچ رہے تھے جو دنیا بھر کے تیس کروڑ مسلمانوں کو ہی مذہبی ریاست کے ماتحت لے آئے۔ مگر اسی زمانے میں مملکتِ عثمانیہ کے خاتمے اور خلافت کے مٹنے اور ترکی کے لادین قرار دیے جانے اور متعدد خود مختار یا نیم آزاد عرب ریاستوں کے قیام نے انھیں واقعات میں رجائیت کا رنگ بھرنے سے اجتناب پر آمادہ کیا۔ اُنھوں نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (۱۹۳۴ء) میں لکھا ہے:

> ہر مسلمان مملکت کو موجودہ حالات میں اپنی ذات کے باطن میں غوطہ زن ہونا چاہیے۔ عارضی طور پر اپنے نقطۂ نظر کو اپنی ذات پر مرکوز کر لینا چاہیے، حتیٰ کہ یہ مملکتیں اتنی مضبوط ہو جائیں کہ زندہ جمہوریتوں کا ایک کنبہ وجود میں لا سکیں۔ قومی مفکرین کے خیال میں ایک سچا اور زندہ اتحاد محض علامتی سربراہ کے ذریعے وجود میں لانا آسان کام نہیں ہے۔ اس کا حقیقی وجود آزاد اور خود مختار اکائیوں کو ضرب دینے اور ان کے نسلی امتیازات کو ہم آہنگ کرنے اور انھیں ایک مشترکہ احساساتی پابندی میں مدغم کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا ہمیں رفتہ رفتہ اس صداقت کا احساس دلا رہا ہے کہ اسلام نہ قومیت ہے اور نہ سامراج بلکہ ایک انجمنِ اقوام ہے جو مصنوعی سرحدوں اور نسلی امتیازات کو محض حوالے میں آسانی کے لیے تسلیم کرتی ہے، لیکن

اپنے اراکین کے معاشرتی افق کو محدود نہیں کرتی۔''

اسی ذہنی کیفیت کے ماتحت اقبال نے مسلمانوں کی ہندوستان سے علیحدگی اور پاکستان کے قیام کا پُرزور مطالبہ کیا۔ اگر چہ بہشتِ ارضی کی تاریخ ملتوی کر دی گئی لیکن اس عرصے میں اہم کام کرنا ابھی باقی تھا۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء کو قاہرہ کے ہفتۂ سیاہ کے واقعات نے بہت سے لوگوں کو، جو ابھی تک اسلام اور مغرب کے تصادم کو غیر اہم سمجھتے تھے، یہ باور کرا دیا ہے کہ ایسی صورتِ حال میں موجود ہے جو انتہائی خطرناک ہے۔ تعجب ہے کہ اس کو اتنی آسانی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ خطرے کی گھنٹیاں بہت دیر سے بج رہی ہیں۔ جب اقبال نے لکھا تھا ''یقین کیجیے یورپ اس وقت انسان کی اخلاقی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے'' تو وہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے تھے جو اُنھوں نے اس سے قبل نہیں کہی تھی۔ اور وہ ایسا محض اکسانے یا صدمہ پہنچانے کے لیے بھی نہیں کہہ رہے تھے، نہ ہی وہ ویرانے میں ابھرنے والی تنہا آواز تھے۔ دنیا کے امن اور تحفظ کے راستے میں موجودہ خطرات یقیناً اتنے ہی کم نہیں ہیں۔ ان خطرات میں سے کوئی خطرہ صلیبی جنگوں کی فضا کے موجودہ احیا سے بڑھ کر نہیں۔

پیچیدہ مسائل کو انتہائی سادہ بنا کر پیش کرنا شاید بیسویں صدی کا بے حد پریشان کن گناہ ہے۔ وہ دنیا جو تعلیم بالغاں کو مقبولِ عام ذرائعِ ابلاغ کی مدد سے رائج کر رہی ہے اور سنجیدہ ادب سے اجتناب کرتی ہے، اخبارات کی سرخیوں کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ ذہنی طور پر کسی دیانت دارانہ اور بنا بریں حجاب آمیز تجزیے کو قبول نہیں کر سکتی۔ فلسفی ہونے کی وجہ سے اقبال موجودہ دنیا کے رواج کے مطابق بلند آہنگی کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''یورپ کی عینیت پسندی کبھی ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں معکوس انانیت کی شکار اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے والی جمہوریتیں وجود میں آئی ہیں جن کا واحد مقصد دولت مندوں کے مفادات کے لیے غریبوں کا استحصال کرنا ہے۔'' اس قسم کے خیالات واضح کرتے رہے ہیں کہ کمیونسٹوں کو کیوں اس بات میں دقت پیش نہیں آتی کہ وہ اقبال کو اپنا ساتھی قرار دے دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی اور مغربی سیاست دانوں کو اس بات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو دو رنگوں یعنی سیاہ و سفید میں پیش کریں۔ لیکن جب ایک سیاست دان اپنے آپ کو پیغمبر کے طور پر پیش کرے اور پیغمبر مانا جائے تو اس کے لیے موزوں نہیں ہے کہ وہ بچگانہ انداز سے صابن کے بکس کے کھیل میں اُلجھا رہے، جب تک کہ وہ ہٹلر کی طرح تخیلاتی تاخت و تاراج کرنے کا خواہش مند نہ ہو۔

موجودہ زمانے میں یورپ کے متعلق مشرق کی نفرت میرے خیال میں ہمعصر سیاست کا سب سے زیادہ خوفناک اور پریشان کن پہلو ہے اور اسے محض شکست خوردہ سامراجیت کے خلاف فاتحانہ ردِعمل کہہ کر

نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے لیکن اصل اسباب زیادہ گہرے ہیں۔ اس کو محض ان کمتر درجے کے ذہنوں کے صدماتی ردِعمل سے منسوب نہیں کیا جاسکتا جو اس صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں دنیا بھر میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ یورپی تہذیب جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔ اور وہ اس گھونسلے کو تباہ کرنا چاہتے تھے جس سے وہ اپنے خیال میں آگے نکل چکے تھے۔ اگرچہ جو بیج اُنھوں نے بے خیالی میں بوئے تھے وہ زبردست فصل لے آئے ہیں۔ اس کا سبب جنگِ عظیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت بھی نہیں ہے، تاہم ذاتی اصلاح کی ایک کوشش کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ تمام عناصر موجود ہیں اور متحرک ہیں۔ لیکن اس سبب کے نیچے وہ چیلنج پنہاں ہے جو تیرہ صدیاں پہلے صحرائے عرب سے دیا گیا تھا اور جسے بار بار اقبال اس کے پیش روؤں اور پیروکاروں نے بیان کیا ہے۔ اسلام خصوصی طور پر خدا کا آخری پیغام ہونے کا دعوے دار ہے اور تمام مذاہب کو ختم کرنے کا مدعی ہے۔

یورپ صدیوں تک اسلام کے ساتھ بایں معنی بے انصافی کرتا رہا ہے کہ اس کے مثبت اضافوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ سبب یہ ہے کہ علمیت مذہبی فرقہ واریت کی لونڈی رہی ہے۔ اس بے انصافی کے خلاف امیرعلی اور اس کے دبستان نے بجا طور پر احتجاج کیا تھا۔ اور چونکہ اس قسم کا مجادلہ یورپ کا منتخب ہتھیار رہا ہے اس لیے یورپ کے پاس شکایت کا کوئی جواز نہیں ہے اگر اسلام نے اس ہتھیار کو اُسی فنکاری سے یورپ ہی کے خلاف استعمال کیا ہے۔ گزشتہ صدی کی اعتدال پسند تحریک نے اسلام کی عالمی خدمات کا زیادہ حقیقت پسندانہ طریقے سے اعتراف کیا ہے۔ یورپ کے علما نے، جبکہ امیرعلی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، کریمانہ لیکن ضرورت سے زیادہ سادہ انداز اختیار کرتے ہوئے ریاضی، ادویات، سائنس، فنون، ادبیات، قانون، فلسفہ اور سیاسیات میں اسلامی ترقیات کا بہ مسرت اعتراف کر لیا تھا۔ اس انداز کے ورثوں سے خوشہ چینی کا تذکرہ فیشن بن گیا اور دورِ وسطیٰ کے اسلامی ورثے سے یورپ کے استفادے کا بھرپور اعتراف کیا جانے لگا۔ اپنے ماضی کے متعلق زیادہ یقین اور اعتماد سے غیرمتعصب عالموں کے ان علمی سندات کو ذوق و شوق سے پیش کرتے ہوئے مسلم معترضین نے یہ الزام لگانا شروع کر دیا کہ موجودہ یورپی تہذیب میں جو کچھ اچھا ہے وہ تو اسلام کی وجہ سے ہے اور جو برائیاں ہیں وہ دوسری قوتوں کے سبب سے ہیں۔ ایک ہندوستانی مصنف ایف۔ کے۔ درانی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''علم، تہذیب اور تمدن میں ساتویں صدی سے موجودہ صدی تک ساری ترقیات براہِ راست یا بالواسطہ بانیِ اسلام کے ذہن سے استفادہ کر کے وجود میں آئی ہیں۔'' اقبال قدرے کم جذباتی کیفیت میں لکھتے ہیں: ''یقین کیجیے انسان کے اخلاقی ارتقا کے راستے میں اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے قبضے میں وہ امر حقائق ہیں جن کی بنیاد وحی پر ہے۔ یہ حقائق اس کی خارجی ہیئت کو زندگی کی گہرائیوں کے حوالے سے داخلیت میں بدل

دیتے ہیں۔ ہمارے روحانی حقائق جزوِایمان ہیں جن کے لیے ہمارا سب سے کم آ گاہ آدمی بھی جان قربان کرسکتا ہے۔ اسلام کے اس بنیادی عقیدے کے بعد کہ اس کے بعد کوئی شریعت نہیں آ سکتی، ہم روحانی طور پر دنیا کے سب سے زیادہ وسیع المشرب لوگ ہیں۔ آج مسلمانوں کو اپنی اس صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے، اپنی زندگی کو امرِ اُصولوں کے مطابق ڈھالنا چاہیے اور اسلام کے جزوی طور پر حاصل کردہ مقصد کی مدد سے ایسی روحانی جمہوریت وجود میں لانی چاہیے جو اسلام کا آخری مقصد ہے۔'' یقیناً بات اُلٹ گئی ہے۔ عیسائی یورپ کو، جو ایشیا میں اپنی خودساختہ تہذیب سکھانے کے مقصد کے دعوے دار تھا، اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ خود سے نئے سرے سے مشرقی تہذیب کی مدد سے مہذب بننے کی ضرورت ہے۔

یہ تمام باتیں کتنی پریشان کن ہیں۔ لندن، پیرس یا نیویارک میں کسی آرام کرسی پر بیٹھ کر اس تمام مناقشے کو لفظی جنگ قرار دے دینا آسان ہے لیکن موجودہ اسلامی دنیا سے گزرنے والا کوئی سیاح بھی فوراً اس کی تصدیق کرے گا کہ یہ خطرناک استخراج نتائج ہوگا۔ قاہرہ کے ہفتۂ سیاہ کی آگ اور خون سے قطع نظر، جسے اگر کچھ لوگ چاہیں تو برطانوی سامراجیت کے خلاف ردِعمل قرار دے سکتے ہیں یا کمیونسٹوں کے ہنگامہ کرانے کی کوشش کہہ سکتے ہیں یا مشرقی ہجوم کی روایتی لاقانونیت کا مظاہرہ قرار دے سکتے ہیں، دنیا کے اس وسیع علاقے میں بھی، جو مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے، اگر بیدار مغزی سے دیکھا جائے تو ممکن نہیں کہ اس بات کا غیراطمینان بخش ادارک نہ ہو کہ اسلام اور یورپ ایک دوسرے کے خلاف تلے کھڑے ہیں اور جنگ یا امن کے درمیان انتخاب زیادہ دور نہیں ہے۔ خواہ ہم اس پسند کریں یا نہ کریں، خواہ ہم ایشیائی ہوں یا یورپی یا افریقی، ہم ایک پُر از خطر دور میں زندگی گزار رہے ہیں اور صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ کی جنگوں کے بعد سے اب تک ایک شدید ترین تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کیا ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حقائق اس سے مختلف ہیں؟ اگر ہم اس خوفناک اور غیرضروری تصادم سے بچنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے کی ازسرِ نو اور ان تھک کوشش کریں اور دیکھیں کہ کیا امکانات ہیں: اوّل کشیدگی کو کم کرنے کے اور اس کے بعد ایک عقلی تعاون کے۔ اور بالآخر ایک مشترکہ مقصد کی طرف ایک ساتھ بڑھنے لگیں۔ رموزِ بیخودی کا ترجمہ کرتے وقت میں نے مسلمانوں کے مقدمے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جسے پُرزور طریقے سے ایک مفکر اور اہم شاعر نے پیش کیا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ایک عیسائی ہوں جسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کوئی مسلمان میرے آبائی مذہب میں شامل ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان موجودہ بدآہنگی اگر بالکل ہم آہنگ نہیں ہوسکتی تب بھی اسے موجودہ جذباتی بحثوں کے منطقے سے نکال کر زیادہ خنک خطے میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ان مباحثوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں مذاہب میں اتفاقات کا دائرہ

اختلافات سے وسیع تر ہے اور اس سے یہ توقع پیدا ہو جائے گی کہ اختلاف کسی دن تعاون میں بدل جائے گا۔ اور یہ بات اور بھی جلدی ہو سکتی ہے اگر عیسائی اور مسلمان واضح اور صاف طور پر جان لیں کہ ان کا سامنا ایک مشترکہ دشمن سے ہے جو ان دونوں کو ختم کرنے کے درپے ہے جب تک دونوں مل کر اس کا مقابلہ نہ کریں۔

نکلسن نے اسرارِ خودی کے ترجمے کی بابت لکھا تھا کہ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ہر جگہ اس کے مفہوم کو درست سمجھا ہے یا درست طور پر منتقل کیا ہے۔'' اور میں نے اس کتاب کا ایک ایسا نسخہ بھی دیکھا ہے جس کے حاشیے پر اقبال کی اپنی اصلاحیں ہیں جو اس بات کی نمایاں شہادت فراہم کرتی ہیں کہ نکلسن جیسے عالم کو بھی اقبال کے اسلوب کے ابہامات کو واضح کرنے میں کسی قدر دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ میں تو محض نکلسن کی رائے کو اپنی بابت دہرا سکتا ہوں، مگر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ میرا ترجمہ اور زیادہ ناتسلی بخش ہوتا اگر خوش قسمتی سے پاکستان کے مشہور عالموں اور اقبال اکیڈمی کے اراکین نے، جو اقبال کے ذاتی دوست رہے ہیں، اس پر نظر ثانی نہ کی ہوتی۔ یہ حضرات مجھ سے کہیں زیادہ اقبال کے خیالات اور اسالیب کے سمجھنے والے ہیں۔ اس موقع پر ان کا شکریہ ادا کر کے مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ترجمے کو بے قافیہ نظم میں ڈھالا گیا ہے۔۔۔ اصل نظم مقفیٰ ابیات میں لکھی گئی ہے۔۔۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں مفہوم سختی سے اصل کے قریب رہے وہیں فارسیت کی شعری خوشبو بھی کسی قدر منتقل ہو جائے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر۔۔ اقبال ممدوح عالم)

رموزِ بیخودی کے مضامین کا ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالشکور احسن

اسرارِ خودی کی طباعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اس کے تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں رموزِ بیخودی چھپی۔ ۲۷ دسمبر کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کتابیں چھپنے سے پہلے سنسر ہوتی تھیں۔ فرماتے ہیں:

مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آ گئی ہے۔[۱]

یہ مثنوی نومبر ۱۹۱۷ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ کیوں کہ ۷ انومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں مرقوم فرماتے ہیں:

مثنوی ختم ہوگئی ہے۔۔۔ چند روز کے بعد پریس میں دے دی جائے گی۔[۲]

خودی کے نئے تصور نے پڑھنے والوں کے اندر ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ فارسی زبان و ادب میں اس کا نیا مفہوم مستعمل نہ تھا۔ جب علامہ نے فرد کی بے پناہ اہمیت اور اس کے جوہر ذات کی لامحدود استعداد پر اظہار فکر کیا تو اس سے انسانی انا یا خودی کی حقیقت تو ایک نئے خیال انگیز اور انقلابی رنگ میں سامنے آئی، لیکن اس میں فرد اور ملت کے باہمی ربط اور حقوق و وظائف پر روشنی نہ پڑتی تھی اور انسان کی انفرادی عظمت اور خودی کی قوت تخلیق و تسخیر پر جو زور دیا گیا تھا، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ انفرادی خودی پر یہ اصرار اجتماعی زندگی کے تار و پود بکھیر دے گا۔ رموزِ بیخودی میں یہ غلط فہمی قطعی طور پر دور کر دی گئی ہے۔ اس میں علامہ نے فرد اور ملت کے باہمی ربط کی جس منطقی انداز میں صراحت کی اس سے فلسفۂ خودی و بے خودی کے درمیان مکمل ہم آہنگی کی حقیقت آشکار ہوگئی۔

جس طرح علامہ نے خودی کے لفظ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے، بعینہٖ بے خودی کو بھی بالکل نئے معنی پہنائے ہیں۔ اگر خودی سے علامہ کی مراد اثبات و تعین زات ہے تو بے خودی سے مراد فرد کا جماعت میں انضمام ہے۔ فرد جماعت کی محبت میں اپنے اختیار سے خود دست بردار ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ:

در جماعت خود شکن گردد خودی

کتاب کا آغاز رومی کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب

یہاں علامہ نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو اپنے فلسفہ کے ساتھ تطبیق دیا ہے۔ اس کے بعد ''پیش کش بحضور ملت اسلامیہ'' کے عنوان کے تحت اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جہاں ان کے ہمنواؤں نے بت ترسا کے گیسو و رخسار کے گرد تخیل کے ہالے بنے ہیں اور ساقی مہ رو کے در پر جبیں فرسائی کی ہے، وہ ملت کی تیغ ابرو کے شہید ہیں اور اس کے در پر سوز و گداز کا ہدیہ لائے ہیں۔ نیلگوں آسمان ان پر افکار کے بادل برساتا ہے۔ وہ جوئے بار نغمہ خواں کی شکل میں ان سے ملت کے گلشن کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وہ پھول کی طرح ملت کے سامنے عشق سے سرشار سینے کو چاک کر رہے ہیں۔ اور اس نیت سے اس آئینے کو اس کے سامنے عیاں کر رہے ہیں کہ وہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ سکے۔ شاید کہ اسے اس میں اپنا اصلی رنگ روپ نظر آجائے۔

تمہید کے تحت علامہ نے فرد و ملت کے باہمی ربط کو موضوع بحیثیت بنایا ہے اور دونوں پر ایک دوسرے کی اہمیت واضح کی ہے۔

فرد کے لیے ربط جماعت رحمت ہے اور اس کے جوہر خودی کی تکمیل ملت ہی کے حوالے سے ہوتی ہے۔ فرد و جماعت ایک دوسرے کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر فرد کا وقار اور ذوق نمو ملت کا رہین منت ہے تو ملت بھی اپنے نظم باہمی کے لیے افراد کی محتاج ہے۔ فرد کا جماعت میں گم ہونا قطرے کا سمندر ہو جانا ہے۔ اس کا کہا ملت کا قول ہو جاتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں خود ملت بن جاتا ہے۔ اگر فرد تنہا ہے تو وہ اپنے مقاصد کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا اور اس کی انفرادی قوت کے آشفتہ ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ لیکن جماعت کے تقاضے اسے ربط و ضبط باہمی سے آشنا کرتے ہیں، اس کے اندر نرمی اور ہمدلی کی خو پیدا کرتے ہیں اور اسے رسم آئین کا پابند کر کے حقیقی آزادی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

اگلے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ ملت افراد کے اختلاط و آمیزش سے پیدا ہوتی ہے اور ان کی تربیت کی تکمیل نبوت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔

اگرچہ فرد کی فطرت مائل بہ یکتائی ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی ہی سے ممکن ہے۔ افراد تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں اور رزمگاہ حیات میں ایک دوسرے کے رفیق و ہمدم ہیں۔ ان کی مثال ستاروں کی ہے کہ ان کی انجمن کا راز جذب باہمی میں پوشیدہ ہے۔ ملت کے فکر و عمل میں پختگی و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے خدا اس میں کوئی صاحب دل پیدا کرتا ہے جس کی بات کے ہر

حرف میں جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ جس کے نغمے خاک راہ کو نئی زندگی بخشتے ہیں اور جس کی ذات سے ذرۂ بے مایہ میں تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ فرد کو خداوندانِ باطل کی غلامی سے آزادی بخشتا ہے اور ایک مقصد کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اسے نکتۂ توحید کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے اور اس کے اندر نیازمندی کی راہ و رسم کی طرح ڈالتا ہے۔

اگلا عنوان ''ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ'' ہے یہاں علامہ نے توحید اور رسالت پر مشتمل وہ عوامل گنوائے ہیں جو مسلمان قوموں کے درمیان ایک بنیادی وحدت کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ علامہ کی نظر میں دین، حکمت اور آئین کا سرچشمہ توحید ہے۔ قوت و سطوت اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید بیم و شک کی کیفیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ زندگی عمل کی راہوں پر گامزن ہوتی ہے اور ضمیر کائنات آنکھوں کے سامنے عیاں نظر آتا ہے۔ جب انسان میں احساس بندگی پختہ تر ہو جائے تو کاسۂ گدائی میں جام جم کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ملت اسلامی جسم ہے تو لا الہ اس کے لیے جان کا حکم رکھتا ہے۔ یہی عقیدہ ملت اسلامی کے اسرار کا سرمایہ اور اس کے افکار کا شیرازہ ہے۔ یہ عقیدہ اسود و احمر کی تمیز اٹھا دیتا ہے اور ایک ایسی ملت کی تعمیر کرتا ہے جس کے قلب و ذہن اور فکر و جذبہ میں کامل یک رنگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ سازِ فکر ہے جس میں سوزِ حق سے ارتعاش کی لہریں اٹھتی ہیں۔ اس کے بعد علامہ نے وطنیت اور نسب پرستی کی مذمت کی ہے، اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دوسری قوموں کے ہاں ملت کی اساس احساس وطنیت یا نسل پرستی کے جذبے پر ہے لیکن ملت اسلامی کی بنیاد خدا پرستی پر ہے جسے دل اور جذبے کے رشتوں نے استوار کیا ہے۔ اس رشتہ محبت نے ملت اسلامی کے مدعا و مقصد اور طرزِ فکر و نظر میں ایک اساسی وحدت و ہمدلی پیدا کر دی ہے۔ پھر علامہ اس ملت کو 'یک نما'، 'یک بین' 'یک اندیش' کے نام سے یاد کرتے ہیں جسے عقیدۂ توحید نے یک زبان، یک دل اور یکجان بنا دیا ہے۔

علامہ عقیدۂ توحید کو انسانی نفسیات کی اصلاح و صحت مندی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں غم اور خوف اُم الخبائث ہیں، ان سے زندگی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ جب دل آرزو سے محروم ہو جائے تو زندگی کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس آرزوؤں کا پیہم سلسلہ امید کو جنم دیتا ہے جس سے زندگی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ یاس زندگی کی جولانیوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ غم رگ جاں کے لیے نشتر بنتا ہے۔ مگر عقیدۂ توحید 'لاتقنطوا، اور 'لاتحزن' کا سبق دیتا ہے۔ رضا مسلمان کو ستارے کی درخشانی عطا کرتی ہے اور راہِ زندگی میں اس کے لبوں پر تبسم کے پھول کھلاتی ہے۔ اسی طرح قوت ایمان مومن کو خوف سے نجات دیتی ہے اور اس کی زندگی میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ جب کلیم سوئے فرعون جاتا ہے تو اس کا قلب وجگر 'لاتخف' کے احساس سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خوف عزم و ہمت پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ افکار و

کردار کی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے۔ ہر شر کی جڑ خوف کے احساس میں پیوست ہے۔ اس سے تعلق و چاپلوسی، تزویر و ریا، مکر و فریب اور دروغ و کینہ فروغ پاتے ہیں۔ ان تمام امراض خبیثہ کا علاج توحید کا عقیدہ ہے۔ خوف ہی میں شرک کی جڑیں بھی پیوست ہیں اور جو دین اسلام کی روح سے واقف ہے وہ اس حقیقت سے خوب آشنا ہے:

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس کے بعد علامہ نے اسرارِ خودی کی طرح اپنے افکار کو تیر و شمشیر کے مکالمے میں اورنگ زیب عالمگیر کے ایک تاریخی واقعہ سے مزید واضح کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ شہنشاہ اورنگ زیب (۱۰۶۸/۱۶۵۸-۱۱۱۸/۱۷۰۷) نے نماز کے دوران ایک شیر کو خنجر سے ہلاک کر دیا تھا، اور اس کے بعد وہ پہلے سے زیادہ استغراق کے ساتھ نماز میں محو رہا تھا۔ رسالت کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں کہ قوم حرفِ بےصوت کی مانند ہے جسے رسالت ایک موزوں مصرع کی شکل عطا کرتی ہے۔

فرد کی بقا ذات خداوندی سے اور ملت کی زندگی رسالت سے وابستہ ہے۔ رسالت نے ہمیں دین و آئین دیا۔ قوت قلب و جگر بخشی اور کتاب عطا کی۔ ہمیں شیر و شکر کیا اور ہم نوا، ہم نفس اور ہم مدعا بنایا۔ ہم مقصد افراد کی کثرت وحدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، اور جب وحدت فکر و آرزو پختہ ہوتی ہے تو وہ ملت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وحدت اسلامی کا سرچشمہ دین فطرت ہے اور یہ دین ہم نے نبی اکرمؐ سے حاصل کیا ہے قوم کی قوت اور وحدت کا سرچشمہ وہ ذات اقدس ہے۔ اور یہ قوم ابد تک زندہ و پائندہ ہے۔ مسلمان غیر اللہ سے رشتہ توڑ کر ''لا قوم بعدی'' کا نعرہ لگاتا ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چون وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت زبندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم

رسالت کا مقصد دنیا میں حریت و مساوات و اخوت کا قیام تھا علامہ نے یہاں تاریخ اسلامی سے ایسے

واقعات نقل کیے ہیں جن سے اسلامی معاشرے میں ان عظیم اقدار کی بنیادی حیثیت اور ان کی عملی تفسیر کا ثبوت ملتا ہے۔

اخوت کے سلسلے میں ایک ایسا واقعہ پیش کیا ہے جو ایران پر مسلمانوں کے حملے دوران میں پیش آیا۔ ایک مسلمان نے ایرانی شاہنشاہ یزدگرد سوم کا ایک سپہ سالار گرفتار کر لیا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ایرانی فوج کا ایک بہت بڑا سردار ہے۔ سپہ سالار نے اس سے جان بخشی کی التجا کی۔ سپاہی نے تلوار نیام میں ڈال لی اور اس کی جان بخش دی۔ بعد میں جب اسلامی لشکر کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ایرانی افواج کا سپہ سالار جابان ہے تو امیر لشکر حضرت ابوعبیدہؓ سے اس کے قتل کی درخواست کی گئی، مگر اُنھوں یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم میں سے ہر شخص ملت کا امین ہے۔ اس کی صلح ملت کی صلح اور اس کا انتقام ملت کا انتقام ہے۔ جب ملت فرد کی زندگی کی بنیاد بنتی ہے تو فرد کا قول ملت کا قول ہوجاتا ہے۔ جابان ہمارا دشمن ضرور تھا، لیکن ایک مسلم نے اسے امان بخشی ہے، اس لیے اب اس کا خون تیغ مسلم پر حرام ہے:

گفت اے یاران مسلمانیم ما
تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
ہر یکے از ما امینِ ملت است
صلح و کینش صلح وکینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد
عہدِ ملت میشود پیمانِ فرد
نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است

مساوات کے تحت خاندان عثمانی کے سلطان مراد کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ سلطان نے ایک مشہور معمار کو ایک مسجد کی تعمیر کی دعوت دی۔ مگر مسجد بنی تو سلطان کو پسند نہ آئی، اور آپے سے باہر ہو کر اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ معمار قاضی کے پاس پہنچا اور از روئے قرآن بادشاہ کے ظلم کے خلاف داد رسی چاہی۔ قاضی نے فوراً بادشاہ کو طلب کیا۔ سلطان قرآن مجید کی ہیبت سے لرز اٹھا، اور ایک عام ملزم کی طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ قاضی نے شہنشاہ سے کہا کہ قرآن 'قصاص' کا حکم دیتا ہے اور یہی زندگی کا اٹل قانون ہے۔ مسلمان سب برابر ہیں اور بادشاہ کا خون معمار کے خون سے رنگین تو نہیں ہے:

گفت قاضی فی القصاص آمد حیٰوۃ
زندگی گیرد بایں قانون ثبات

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست

سلطان نے جب یہ آیت سنی تو سرِ خم تسلیم کرتے ہوئے چپکے سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کے اس رویے کو دیکھ کر مدعی نے بے اختیار ہو کر قرآن مجید وہ آیت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے، اور ساتھ ہی یہ کہہ اٹھا کہ میں نے تجھے بہر خدا و مصطفیٰؐ معاف کیا۔ اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں:

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبرؐ نگر
پیشِ قرآن بندہ و مولا یکیست
بوریا و مسند و دیبا یکیست

حریت کی حقیقت واقعۂ کربلا کی روشنی میں واضح کی گئی ہے۔ یہ واقعہ عقل سفاک پر عشق کی کامرانی کی زندہ دلیل ہے۔ عشق کو آرام جاں آزادی میں ملتا ہے۔ اسی آزادی کی خاطر عشق نے میدانِ کربلا میں عقل ہوس پرور سے ٹکر لی، اور حریت کے مظہر جاوداں حضرت امام حسینؓ نے اپنے خون سے عشق غیور کو سرخ رو کیا۔ حق و صداقت شبیری ہی سے زندہ ہے اور اسی سے ظلم و استبداد کی جڑ کٹتی ہے:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید
چون خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آن سر جلوۂ خیر الامم
چون سحابِ قبلہ باران در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

اس درخشاں تاریخی کارنامے کے بعد علامہ نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ چونکہ ملت محمدیہؐ کی بنیاد توحید و رسالت کے عقیدے پر ہے اس لیے یہ ملت حدود و مکان سے بے نیاز ہے:

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز بومِ او بجز اسلام نیست

رموز کا اگلا موضوع یہ ہے کہ مسلمان مرز و بوم میں نہیں رہ سکتا، اور جغرافیائی اور وطنی حدود اس کے

شعورِ ملی کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کا مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا واقعہ مسلمان کے لیے عقیدۂ قومیت کو سلجھانے کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ حکمت نبویؐ نے ایک وسیع بین الاقوامی برادری، جسے علامہ نے ''ملت گیتی نورد'' کے نام سے یاد کیا ہے، کی بنیاد کلمہ پر اٹھائی ہے اور تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا ہے۔ ہجرت کا راز اسی اہم نکتے میں پنہاں ہے۔ یہ مسلمان کی زندگی کا آئین ہے۔ مسلمان قیدِ جہات سے آزاد ہے۔ اور بوئے گل کی طرح، جو پھول کو چھوڑ کر سارے چمن کو مہکا دیتی ہے، وہ ایک مقام سے وابستہ نہیں بلکہ پورا عالم شش جہت اس کی جولانگاہ ہے۔

اسلام کے بین الاقوامی تصور کو پیش کرنے کے بعد علامہ کا ارشاد ہے کہ ملت اسلامی کی بنیاد وطن نہیں ہے۔ وطن اخوت کے رشتے کو توڑ دیتا ہے اور نوعِ انسانی کو قبیلوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وطن کی بنیاد پر قومیں ابھرتی ہیں لیکن انسانیت ختم ہو جاتی ہے:

آدمیت گم شد و اقوام ماند

علامہ کی رائے میں جب یورپ میں سیاست نے مذہب کی جگہ لی تو وطنیت کا موجودہ تصور پیدا ہوا اور میکیاولی نے بادشاہوں کے لیے ایک کتاب لکھ کر رزم و پیکار کا میدان گرم کیا[۲۶]۔ جس طرح ملت اسلامیہ حدود و ثغورِ مکانی سے بے نیاز ہے، اسی طرح وہ قیدِ زمان سے بھی آزاد ہے۔ امت کا تسلسل برقرار ہے اور رہے گا۔ فرد اور قوم میں فرق ہے۔ فرد اپنی راہ لیتا ہے مگر ملت قائم و دائم ہے۔ فرد کی تخلیق مٹی سے ہوتی ہے، لیکن قوم کسی صاحب دل کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہے۔ فرد کی زندگی کا دار و مدار جان و تن کے رشتے پر ہے مگر قوم روایات کے بل بوتے پر زندہ و تابندہ ہے۔ ہاں اگر قوم مقصدِ حیات کو ترک کر دے تو یہ اس کے لیے موت کا پیغام ہے۔ یہاں علامہ ملت اسلامی کو ایک عام قوم سے ممیز کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ امت مسلمہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ قوم اجل کے خوف سے بے پرواہ ہے۔ یہ وہ چراغ ہے جسے پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا۔ اس پر بڑی آفتیں گزریں اور بڑی مصیبتیں ٹوٹیں۔ اسے فتنۂ تاتار نے پامال کیا لیکن اسی آتش تاتار نے اس کے لیے گلزار کا سامان پیدا کر دیا، اس لیے کہ اس قوم کی فطرت ابراہیمیؑ ہے اور یہ آتش نمرود کو گلستان بنا سکتی ہے۔ انقلاب روزگار کے شعلے جب اس قوم کے گلشن پر لپکتے ہیں تو بہار کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ آج نہ رومی باقی ہیں نہ یونانی، نہ جلال فراعنہ باقی رہا اور نہ شوکت ساسانی، مگر کوہ و دشت میں آج بھی اذان کی صدا گونجتی ہے۔ ملت اسلامی کا وجود باقی ہے اور رہے گا۔ عشق زندگی کا قانون ہے اور سالمات عالم میں اسی سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عشق ہمارے سوز دل کی بدولت آج بھی زندہ ہے اور لا الٰہ کے شرر سے آج بھی تابناک ہے۔

رموز کا اگلا موضوع یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک آئین ہوتا ہے یہ آئین نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جاتا

ہے۔ آئین قانون زندگی ہے۔ پتا آئین کا پابند ہو کر پھول بن جاتا ہے۔ آواز ضبط و نظم سے نغمے میں ڈھل جاتی ہے۔ مسلمان کا آئین قرآن ہے جس کی حکمت ابدی ہے اور جو نوع انسانی کے لیے آخری پیغام ہے۔ اس کتاب نے رہزنوں کو رہنما بنایا ہے۔ اس کی ایک کرن نے دشت پیماؤں کے دماغ میں علوم کی شمعیں روشن کی ہیں۔ اس نے غلاموں کو آقا بنایا ہے۔ جہانباتی کے نئے نغمے بکھیرے ہیں اور اس کے ادنیٰ غلام مسند جم پر متمکن ہوئے ہیں۔ علامہ مسلمان کو جھنجھوڑتے ہیں کہ اس کا ایمان گرفتار رسوم ہے، اور اس انداز کافرانہ کا علاج ہے تو فقط قرآن میں:

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو
شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

رموز کا اگلا موضوع حیات ملی کے مرکز محسوس کی اہمیت پر ہے۔ یہ مرکز محسوس بیت الحرم ہے۔ کوئی قوم ہو اس کی اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مرکز پر سمٹ آئے۔ مرکز ہی سے قوم میں ربط و نظام پیدا ہوتا ہے، اور اسی سے زندگی کو دوام میسر آتا ہے۔ ملت اسلامی کا راز اور اس کا سوز و ساز بیت الحرام سے وابستہ ہے۔ یہ ملت اس کے طواف میں ہم نفسی کی دولت سے سرشار ہوتی ہے۔ اسی آستان سے رشتہ و پیونداس کی زندگی اور دوام کا ضامن ہے۔ یہاں علامہ نے قوم موسیٰ کی مثال دی ہے کہ جب وہ مرکز سے کٹ گئی تو اس کا ملی شیرازہ پراگندہ ہو گیا۔ وہ زمانے میں رسوا ہوئی اور زندگی خون بن بن کے اس کی آنکھوں سے ٹپکی۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیرہن کو جامۂ احرام بنائے اور سجدوں میں گم ہو جائے کہ اس کے آبا کا یہی نیاز ''ناز عالم آشوب'' بن کر افق زمانہ پر طلوع ہوا تھا۔

اس کے بعد علامہ ملی زندگی کا نصب العین مضبوطی سے تھام لینے کو جمعیت حقیقی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں جس طرح فرد کی زندگی میں مدعا و مقصد کی تخلیق و تسلسل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح ملی زندگی بھی اس کے بغیر تشنۂ تکمیل ہے۔ مقصد عمل میں اسی طرح پنہاں ہے جس طرح جسم میں جان۔ مقصد ہی سے عمل کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ ملت اسلامی کا مقصد حفظ و نشر 'لا الہٰ' ہے اور اسی کی تکمیل میں اسے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ نکتہ سنجان عالم کو صلائے عام دے اور نبی امیؐ کا پیغام ان تک پہنچائے۔

فکر انسان بت گر اور بت پرست ہے۔ اب اس نے ایک تازہ تر پروردگار تراشا ہے جس کا نام رنگ، ملک یا نسب ہے۔ اس بت ناارجمند کے سامنے آدمیت کو بھیڑ کی طرح ذبح کیا گیا ہے۔ شاعر مسلمان کو

دعوت عمل دیتا ہے کہ بڑھ کر اس حق نما باطل پر لا الہ کی تیغ کا وار کرے۔ وہ تکمیل حیات کا مظہر ہے اس کا فرض ہے تاریکی حیات میں روشنی کا پیغامبر ثابت ہو۔ اس کے بعد علامہ نے تسخیر عالم کے مضمون کو لیا ہے جو ان کی نظر میں حیات ملی کی توسیع کا ذریعہ ہے۔ مشکلات سے نبرد آزمائی جس طرح فرد کی زندگی میں جلا پیدا کرتی ہے، اسی طرح قوم کی زندگی میں نکھار کا باعث بنتی ہے۔ شاعر کی نظر میں ما سوا صرف تسخیر کے لیے ہے۔ یہ ملی عزائم کی جولانگاہ ہے اور اس میں الجھنیں جتنی زیادہ ہوں گی اتنا ہی ان کے سلجھانے میں کیف ہو گا۔ اگر ملت اپنے آپ کو مثال غنچہ پاتی ہے تو اسے اپنی صلاحیتوں سے چمن آباد کرنا ہے۔ اگر وہ شبنم ہے تو اسے خورشید کو مسخر کرنا ہے۔ جو عالم محسوسات پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ذرے سے دنیائیں آباد کرتا ہے۔ عالم اسباب کو حقیر سمجھنا حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کی غرض و غایت مسلمان کی خودی کی توسیع اور اس کی استعداد ممکنہ کا امتحان ہے۔ آدم کو نائب حق بنایا گیا ہے، اور عناصر حیات اس کی حکمرانی ایک مسلم حقیقت ہے۔ وہ ستارے جنھیں اقوام کہن نے دیوتا بنا رکھا تھا انسان کے غلام حلقہ بگوش ہیں:

ثابت و سیارۂ گردون وطن
آن خداوندانِ اقوامِ کہن
این ہمہ اے خواجہ آغوشِ تو اند
پیش خیز و حلقہ در گوشِ تو اند

علامہ ذوق جستجو کو علم و ہنر سے محکم کرنے اور انفس و آفاق پر چھا جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ حقائق اشیا کو سمجھنے کی کوشش پر زور دیتے ہیں، کہ جو حکمت اشیا سے بہرہ ور رہے وہی توانا ہے۔

انفرادی خودی کی مانند ملی خودی کا اپنا وجود ہے۔ اس احساس خودی کی تولید و تکمیل ملی روایات کے تحفظ سے ہوتی ہے۔ ملی روایات کی یاد قوم میں خود شناسی کا جوہر پیدا کرتی ہے۔ اس یاد سے غافل ہونا قوم کے لیے ہلاکت آفریں ہے۔ ملی بقا اور تکمیل خودی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے حال کو ماضی کے ساتھ مربوط رکھیں، اور ایسا قدیم روایات کے تحفظ ہی سے ممکن ہے۔ تاریخ کا مقصد بھی یہی ہے۔ تاریخ داستان یا افسانے کا نام نہیں یہ قوم میں اپنی ذات کا شعور پیدا کرتی ہے اور اس کی استعداد کو اجاگر کرتی ہے۔ تاریخ کی شمع ملتوں کے لیے ایک درخشاں رہنما ستارہ ہے جس سے آج کی رات ہی روشن نہیں گزرے ہوئے کل کی رات کی جبیں بھی تابندہ ہے۔ تاریخ کے تحفظ سے دوش و امروز ہی آپ میں پیوست نہیں بلکہ امروز سے فردا کا چراغ بھی جلتا ہے۔ اگر ملت حیات جاوداں چاہتی ہے تو وہ ماضی کا رشتہ حال اور مستقبل سے نہیں توڑ سکتی۔ زندگی مسلسل ادراک وفہم کی ایک موج ہے۔ ماضی سے حال پیدا ہوتا ہے اور حال سے مستقبل جنم لیتا ہے۔

اس کے بعد علامہ نے شعائرِ اسلامی کی تقلید کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تقلید اجتہاد سے افضل تر ہو جاتی ہے۔ علامہ کی نظر میں جب زندگی میں اضمحلال پیدا ہو جائے تو تقلید قوم میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ روایات کی پابندی ربط و ضبط ملی کا باعث بنتی ہے۔ خزاں کے دور میں درخت سے امید بہار کا سہارا ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ روایت ملی کا تحفظ عظمت رفتہ کا باعث بن سکتا ہے۔ یہاں علامہ نے احوال اسرائیل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسے کن مصائب میں سے گزرنا پڑا۔ صدیوں کے طولانی عرصے میں اس پر کیا کیا بیتی۔ پنجۂ فلک نے کس طرح انگور کی مانند اس قوم رس نچوڑ لیا۔ لیکن اس جان ناتواں کی سختی ملاحظہ ہو کہ اس نے آج بھی راہ رفتگاں کو نہیں چھوڑا، اور آج بھی اس کے سینے میں دم موجود ہے ان اشعار میں یہود کے لیے اسرائیل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

پیکرت دارد اگر جانِ بصیر
عبرت از احوالِ اسرائیل گیر

آج یہ قوم جسے علامہ نے مثال کے طور پر پیش کیا تھا واقعی مملکت اسرائیل کی تشکیل سے اپنی سخت جانی اور عزم و ثبات کا ثبوت فراہم کر چکی ہے۔ جب علامہ نے یہ شعر کہے تھے یہود کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ مسئلہ فلسطین ابھی معرض وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اس دانائے راز نے اس قوم کی پافشاری اور قوت مقاومت کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا، اور اس کے اسباب کا صحیح تجزیہ کر کے اسے امت مسلمہ کے لیے مثال کے طور پر پیش بھی کر دیا تھا۔

ملت اسلامی کے اس دور میں جب کہ اس کے سینے میں شمع زندگی بجھ چکی ہے، علامہ نے اجتہاد کو انتہائی خطرناک کہا ہے۔ اور ''عالمان کم نظر'' کے اجتہاد پر بھروسہ کرنے کی بجائے آباد و اجداد کی حکمت پر تکیہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور امت مسلمہ کو خبردار کیا ہے کہ اگر اس نے قرآن کا دامن چھوڑ دیا تو وہ غبار کے مانند بکھر کے رہ جائے گی۔ اگر وہ ایک مضبوط نظام کی بنیاد پر دوام حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے آئین الٰہی کی پابندی کے بغیر چارہ نہیں۔ آئین اسلامی قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہاں علامہ نے آئین الٰہی سے ایک مثال دے کر بتایا ہے کہ اسلام کس طرح خطرات میں زندگی بسر کرنے کو صحیح زندگی قرار دیتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر سرچشمہ صلح کی توقع پر اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے دفاعی انتظامات سے دست بردار ہو جائے تو مسلمان کے لیے اس پر اس وقت تک حملہ حرام ہے جب تک وہ اپنے اندر پھر کس بل پیدا نہ کر لے۔ بقول علامہ شرع اسلامی مسلمان کی قوت بازو کو آزماتی ہے اور اس کے سامنے خطرات کے پہاڑ کھڑے کرتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے۔ جب شارع آئین نے مسلمان کے لیے طاقت کا نسخہ لکھ دیا تو اس کا مقصد ہے کہ مسلمان اپنے عمل سے اپنے اعصاب کو

فولاد میں ڈھال لے۔ یہ آئین زمین کو آسان میں بدلنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہاں علامہ اس حقیقت پر رنجیدہ ہیں کہ مسلمان شعارِ مصطفیٰؐ کو ترک کے رمز بقا سے نا آشنا اور بیگانہ ہو چکا ہے۔ وہ جس کا عزم پہاڑ کو تنکا سمجھتا تھا توکل کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ وہ جس کے قدم سینکڑوں ہنگامہ آرائیوں کی تخلیق کرتے رہے، قناعت کے کونے میں دبک کر رہ گیا۔ وہ جس کے در پر سکندر و دارا سر جھکاتے تھے، کشکولِ گدائی پر ناز کرنے لگا۔ اب اگر اس کے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کا سودا پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے آئین الٰہی کی پابندی ناگزیر ہے۔ اس کے بعد علامہ قوم کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر حسن سیرت پیدا کرنے کے لیے آدابِ پیغمبرؐ کو اپنے لیے مشعل راہ بنائے۔ نبی اکرمؐ کی ذات سراپا شفقت و رحمت تھی۔ صاحب خلق عظیم کے اتباع میں اسے شفقت و رحمت کا نمونہ بننا چاہیے۔ اسے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مسلمان کی طینت پاک ایک ایسا گوہر ہے جس کی آب و تاب پیغمبرؐ کی رہین منت ہے۔

ان تمام حقائق کے بعد شاعر نے انسانی معاشرے میں صنف لطیف کی زبردست اہمیت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عورت وہ مضراب ہے جس سے مرد کی شخصیت نغمہ زن ہوتی ہے۔ وہ مرد کا لباس اور زیور ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے نماز اور خوشبو کے ساتھ عورت کی اہمیت کا ذکر فرمایا ہے۔ علامہ کی نظر میں جو مسلمان عورت کو خدمت گزار تصور کرتا ہے وہ قرآن کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امومت رحمت ہے، کیوں کہ اسے نبوت سے نسبت ہے۔ امومت سے ہماری شخصیت کی تعمیر پختہ تو ہوتی ہے۔ اس کی جبین کے نقوش میں ہماری تقدیر لکھی ہے۔ امومت سے رفتارِ زندگی میں حرارت ہے، اور اسی سے زندگی کا راز عیاں ہوتا ہے۔ وہ آئندہ نسل کی محافظ و رہبر ہے۔ اس کے بعد علامہ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے اسوۂ حسنہ اور آپ کے عظیم مرتبے کا ذکر کیا ہے، کہ آپ رحمۃ اللعالمینؐ کی نور چشم تھیں، حضرت علی مرتضیٰؓ کی ہمسر اور حضرت حسینؓ کی والدہ تھیں۔ علامہ نے آپ کی ذات کو مثالی بتاتے ہوئے مسلمان عورت کو تلقین کی ہے کہ وہ بھی آپ کی طرح کسی حسین ایسے سالار کاروان عشق کی پرورش کرے۔

رموز کے آخر میں علامہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی مثنوی کے افکار کا خلاصہ مجمل شکل میں اس تفسیر میں ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک رات اُنھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور اُن سے ملت کے دکھ درد کے چارے کے لیے التجا کی آپ نے فرمایا کہ ملت کی آب و تاب کا راز سورۂ اخلاص میں مضمر ہے۔ اس کے بعد آپ نے شاعر کو اس سورۂ کی آیات کا الگ الگ مطلب سمجھایا۔ علامہ نے یہی مطالب یہاں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

خدائے واحد بے نیاز (الصمد) ہے۔ بندۂ حق بھی بندۂ اسباب نہیں اور وہ بھی غیر سے بے نیاز ہے۔ بے نیازی میں بڑے ناز ہیں اور ہر ناز میں ایک نیا انداز ہے۔ یہاں علامہ نے مردِ مومن کی بے نیازی کی

ایک مثال دی ہے۔ ہارون الرشید نے امام مالکؒ کو کہلا بھیجا کہ ایک دنیا آپ سے درس حدیث کا فیض حاصل کرتی ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں بھی آپ سے اسرار حدیث سمجھوں۔ آیا ممکن نہیں کہ آپ بغداد تشریف لے آئیں۔ جناب امام نے جواب دیا کہ میں مصطفیٰؐ کا خادم ہوں اور میرا قلب و ذہن آپ ہی کے عشق سے سرشار ہے۔ آپ کے دام محبت میں اسیر ہونے کے باعث میں کسی قیمت پر آپ کے حریم پاک کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میری نظر میں یثرب کی رات عراق کے دن سے روشن تر ہے۔ تو تعلیم کی خاطر مجھے اپنے در پر بلا کر ایک بندۂ آزاد کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ میں ملت کا خادم ہوں اور ملت کا خادم کبھی تیرا چاکر نہیں ہو سکتا۔ اگر تو علمِ دین سے بہرمند ہونا چاہتا ہے تو یہاں آ اور میرے حلقۂ درس میں بیٹھ۔ اس کے بعد علامہ ارشاد فرماتے ہیں:

بے نیازی ناز ہا دارد بسے
ناز او انداز ہا دارد بسے

بے نیاز ہونے سے بندۂ مومن حق کے رنگ میں رنگ جاتا ہے بے نیازی کا تقاضا ہے کہ انسان کا فہم دوسرے کے افکار کا غلام نہ ہو۔ اس کی باتیں اور اس کی تمنائیں دوسروں سے مستعار نہ لی گئی ہوں۔ مرد مومن کی حیثیت ستارے کی نہیں، آفتاب کی ہے۔ جو خود اپنی روشنی سے تاباں ہے۔ فرد وہ ہے جو اپنی خودی کو پہچانتا ہے اور قوم وہ ہے جو اپنی خودی سے سرشار ہے اور دوسروں سے جھوٹی مصالحت پر آمادہ نہیں۔

جس طرح خدائے بے نیاز کی شان ''لم یلد ولم یولد'' ہے اسی طرح ملت اسلامی رنگ وخون سے بالا تر اور حسب ونسب کے تقاضوں سے بے نیاز ہے۔ سلمان فارسیؓ کی طرح اس کی شان یہی ہے کہ وہ ''زادۂ اسلام'' ہے۔ مسلمان روم وعرب سے وابستہ نہیں۔ اس نے محبوب حجازی ﷺ کو دل دیا ہے اور یہی جذبۂ عشق اسے دوسرے مسلمان سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ رشتۂ عشق نسب سے ماورا اور عرب وعجم سے بالا تر ہے۔ جو مسلمان وطن اور نسب کا پرستار ہے وہ ''لم یلد ولم یولد'' کی معنویت سے ناآشنائے مطلق ہے۔

علامہ مسلمان کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ "لم یکن" سے اپنا رشتہ استوار رکھے تا کہ جیسے خدائے قدوس لاشریک ہے وہ بھی اقوام جہاں میں بے نظیر ہو۔ بندۂ مومن باطل کے مقابلے میں شمشیر آبدار اور حضور حق میں سپر ہے۔ اس کے اوامر ونواہی خیر و شر کی کسوٹی ہیں۔ زندگی اس سے تکمیل کا سبق لیتی ہے۔ اس کا ''عفو وعدل و بذل واحسان''، عظیم ہے۔ وہ قہاری میں بھی کرم گستر ہے، وہ شمع بزم بھی ہے اور رونق کارزار بھی۔ اگر بزم میں اس کے نغمے دلنواز ہیں تو رزمگاہ میں اس کا سوز آئین گداز ہے۔ آخر میں علامہ نے مسلمان کو تنبیہ کی ہے کہ وہ قرآن کو چھوڑ کو خوار و زار ہوا ہے۔ آج وہ شبنم کی طرح عاجز اور سرنگوں ہے حالانکہ اس کی منزل ماہ وانجم سے پرے ہے۔

رموزِ بیخودی رحمۃ اللعالمین ﷺ کے حضور میں عرض حال کے ساتھ ختم ہوتی ہے جو عشق بیتاب کی زندہ داستان ہی نہیں شاعر کے مقصد و آرزو کی آینہ دار بھی ہے۔ ہر شعر سوز و ساز اور عشق و نیاز کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں شاعر نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کے حضور اپنے اشعار کے غیر قرآن سے پاک ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح نہ ہو تو اس کے پردۂ ناموس فکر کو چاک کر دیا جائے اور روز محشر حضور اکرم ﷺ اسے اپنے پائے مبارک کے بوسہ سے محروم رکھیں۔ لیکن اگر اس نے اسرار قرآن کی تفسیر کی ہے تو اس کی تمنا ہے کہ خدائے عزوجل اس کے عشق کو عمل کے ساتھ ہمکنار کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ وفور شوق و محبت کا اظہار اس دیرینہ تمنا کے ساتھ کیا ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ حجاز مقدس میں ہوتا کہ اس کا دل بیتاب آسودگی سے ہمکنار ہو اور فلک اس کی قسمت پر رشک کرے۔ یہ عرض حال ان الہام انگیز اشعار سے شروع ہوتی ہے:

اے ظہورِ تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمین از بار گاہت ارجمند
آسمان از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تاب روئے تو
ترک و تاجیک و عرب و ہندوئے تو
از تو بالا پایہ این کائنات
فقرِ تو سرمایہ این کائنات

عرض حال میں شاعر وارفتہ ملت کی تعمیر میں اپنے کردار اور اپنی تمناؤں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

داستانے گفتم از یارانِ نجد
نکہتے آوردم از بستانِ نجد
عقل از شمعِ نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم
گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم جز بہ قرآن مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دھور
چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
این خیابان را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر درِ اسرارِ قرآن سفتہ ام
با مسلمانان اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزوجل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اس کتاب پر علامہ کو بہت ناز تھا۔ ۲۷/جون ۱۹۱۷ء کو ایک خط میں اس موضوع پر رقم طراز ہیں:

جہاں تک مجھے معلوم ہے ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔[۴]

کتاب کی طباعت سے پہلے ۴/نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک خط میں ارشاد ہوتا ہے:

اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔[۵]

رموزِ بیخودی میں علامہ نے جو فلسفہ پیش کیا اس کی اساس ملت اسلامی کے روحانی وفکری عقائد اور تمدن واخلاق پر تھی۔ البتہ اسے ایک نہایت اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس پر مغربی ردعمل کے بارے میں اُنھوں نے ایک خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا:

رموزِ بیخودی کے ترجمے کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں مگر اُمید نہیں کہ اس کا ترجمہ یورپ میں ہو کہ اس کے مضمون سے یورپ والوں کو چنداں دلچسپی نہیں ہے۔ مسلمان ہی اس کا مفہوم سمجھ جائیں تو غنیمت ہے۔[۶]

(ڈاکٹر عبدالشکور احسن ــ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ)

حوالہ جات وحواشی

۱- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، ص۱۱۔
۲- ایضاً۔
۳- میکیاولی (۱۵۳۲ء) فلارنس (اٹلی) کا رہنے والا تھا۔ اس کی متذکرہ کتاب کا انگریزی عنوان The Prince ہے۔
۴- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، ص۱۰۔
۵- ایضاً۔
۶- ایضاً۔

رموزِ بیخودی—اجتماعی خودی کی تشکیل

ڈاکٹر عبدالمغنی

اسرارِ خودی میں فرد کی خودی کے بیانات کے ساتھ ساتھ جماعت کی خودی کے اشارات بھی پائے جاتے ہیں سب سے بڑھ کر انفرادی خودی کے بیان میں جو گہرائی اور توازن نیز سنجیدگی اور بلندی ہے اس سے اجتماعی خودی کا ایک بلیغ اشارہ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اقبال کا نظریہ خودی ان کے تصورِ خدا پر مبنی ہے، یہ عقیدۂ توحید ہی ہے جو انسان کی حریت و اخوت دونوں کا ضامن ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے جس طرح افراد کی تخلیق و تعلیم کی ہے اسی طرح ملت کی تشکیل و تربیت بھی اور اس وسیع پیانے پر تعمیرِ حیات کے لیے خدا نے جس اُصول کو پسند کیا ہے وہ اسلام ہے یعنی خدا کی بندگی کا قانونِ فطرت جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس آفاقی نقطۂ نظر سے فرد جماعت کی خودی و بےخودی باہم دگر پیوستہ ہیں اور دنیا میں زندگی کا سارا نغمہ ان کی ہم آہنگی سے پھوٹا ہے۔ لہٰذا اسرارِ خودی کے صرف تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں اقبال نے رموزِ بیخودی تصنیف کی۔ دوسری کتاب پہلی کتاب کا تتمہ یا تکملہ ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ اس معاملے میں اقبال کے عقیدۂ توحید کے ساتھ ہی ان کا عشقِ رسولؐ بھی ایک فیصلہ کن امر ہے۔ ان کے مومن قلب و دماغ کی ترکیب توحید و رسالت کے مشترک تصورات سے ہوئی ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول دونوں نظریہ خودی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ چنانچہ انسان کی خودی کے اثبات و اظہار کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے، جو خدا کے آخری پیغام کی حامل اور ختم الرسل کی شریعت کی علم بردار ہے۔ نہ صرف ملت کے ذریعے بلکہ ملت کے لیے بھی خودی کارفرما ہوتی اور اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ اقبال کے فلسفیانہ افکار کا مقصد ہی ملت کی شیرازہ بندی اور ترقی ہے، جسے وہ عام انسانیت کی وحدت و نہضت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ فرد جس طرح اپنی شخصیت کے فروغ کے لیے اسرارِ خودی کا عرفان حاصل کرسکتا ہے اسی طرح ملت کے ارتقا کے لیے اسے رموزِ بیخودی کا شعور حاصل کرنا چاہیے۔ فرد کی خودی کائنات کے مقابلے میں ہے، جب کہ اس کی بےخودی ملت کے مقابلے میں ہے، وہ کائنات

کی تسخیر کرتا ہے اور ملت کی خدمت۔

رموزِ بیخودی کا دیباچہ ''پیش کش بحضور ملتِ اسلامیہ'' ہے۔ اس میں ملت کو اپنی حقیقت سے بیگانہ وشی پر تنبیہ کی گئی ہے اور قائدِ ملتؐ کے ساتھ وفائے عہد کی تلقین:

اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ　　اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش　　تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش

اے ملت اسلامیہ! تیری نگاہیں مسیحیت کے چہرے پر بھٹک رہی ہیں اور تو راہِ کعبہ سے دور جا پڑی ہے، اپنی روح کے اندر جذبۂ عشق پیدا کر اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے کیے ہوئے پیمانِ وفا کی تجدید کر۔''

اس کے بعد شاعر خود اپنے عشق کا ذکر کرتا ہے، جو خدا اور رسول اور ملت اسلامیہ تینوں کے لیے ہے۔ وہ اپنی ملت کے دل میں اپنے اسی عشق کی آگ ڈال دینا چاہتا ہے یعنی اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لیے وقف کرتا ہے:

من ہمیں یک گل بہ دستارت زنم　　محشرے بر خوابِ سرشارت زنم
تاز خاکت لالہ زار آید پدید　　از دمت بادِ بہار آید پدید

میں اپنے اسی عشق کے شعلے کا پھول تیری دستار میں لگاتا ہوں، تاکہ تو اپنے خواب شیریں سے بیدار ہو اور تیری خاک سے دنیا میں ایک لالہ زار اُگے، جس میں تیرے دم سے بادِ نو بہار چلے۔

کتاب کی ''تمہید'' میں ''ربطِ فرد وملت'' کا معنی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ربطِ جماعت کو فرد کے لیے ایک رحمت قرار دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ فرد کی خودی کا جوہر ملت ہی کے ساتھ مربوط ہو کر اپنے کمال کو پہنچتا ہے، پھر فرد وملت کی باہمی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں خوبصورت شاعرانہ تصویروں کے علاوہ فکر انگیز فلسفیانہ نکتے پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں خودی وخدا کے رشتے واضح کر کے ملت کی خودی کا ایک آفاقی وعملی تناظر قائم کیا گیا ہے:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است　　جوہر او را کمال از ملت است
فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند　　سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام　　ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
وصلِ استقبال و ماضی ذاتِ او　　چوں ابد لا انتہا اوقاتِ او
فرد تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گردانَدش　　نرم رو مثل صبا گردانَدش

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گل برگِ چمن گردد خودی

فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، ان کا رشتہ سلک و گوہر اور کہکشاں و اختر کا ہے، فرد کی عزت ملت کے تعلق سے ہے اور ملت کا نظام افراد پر قائم ہے، فرد جب جماعت سے پیوستہ ہوتا ہے تو گویا قطرہ پھیل کر سمندر بن جاتا ہے، حال کے ساتھ ہی ماضی و مستقبل بھی فرد کی شخصیت کے حصے ہیں اور اسی جامعیت کے باعث اس کے اوقات لامتناہی ہیں، فرد تنہا ہو کر مقاصد سے غافل ہو سکتا ہے اور پراگندگی کی طرف مائل، مگر قوم اسے ضبط و نظم سے آشنا کرتی اور نتیجتاً اس کے اندر نسیم و صبا جیسی لطافت پیدا کرتی ہے، خودی جماعت کے اندر رہ کر خود شکن ہوتی ہے اور ایک برگِ گل سے پورا گلستان پیدا کرتی ہے۔

ملت و نبوت

فرد و ملت کے ربط باہمی کی اہمیت واضح ہے، فرد کی نمود جماعت کی سطح پر ہی ہوتی ہے، وہ کسی ملت کے باغ کا ہی ایک پھول ہوتا ہے، گرچہ اس کے مزاج میں یکتائی کا جوش ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی سے ہوتا ہے، ستاروں کی محفل باہمی کشش سے ہی قائم ہے:

در جماعت فرد را بینیم ما از چمن او را چو گل چینیم ما
فطرتش وارفتۂ یکتائی است حفظِ او از انجمن آرائی است
محفلِ انجم زجذبِ باہم است ہستی کوکب ز کوکب محکم است

لیکن کبھی ملت بھی بے جان ہو جاتی ہے، اس کے اندر تن آسانی، بزدلی اور بے سمتی پیدا ہو جاتی ہے، وہ عزم و آرزو سے محروم نظر آتی ہے، محنت سے جی چراتی ہے، اوہام میں مبتلا ہوتی ہے، اس کی خودی مجروح بلکہ غائب ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خدا پیغمبر کو بھیجتا ہے جو ملت کو ایک کتاب دیتا اور حیاتِ تازہ بخشتا ہے، اسے ایک نیا زاویہ نظر عطا کرتا ہے اور ہستی کے ایک نئے گلستاں کی طرح ڈالتا ہے:

سست و بے جاں تار و پودِ کارِ او ناکشودہ غنچۂ پندارِ او
گوشمالِ جستجو ناخوردۂ زخمہ ہائے آرزو ناخوردۂ
بیم جاں سرمایہ آب و گلش ہم ز باد تند می لرزد دلش
منزل دیو و پری اندیشہ اش از گمانِ خود رمیدن پیشہ اش
جانِ او از سخت کوشی رم زند پنجہ در دامانِ فطرت کم زند
تا خدا صاحب دلے پیدا کند کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پروازے کہ از آوازۂ خاک را بخشد حیات تازۂ

گلستان در دشت و در پیدا کند تازہ اندازِ نظر پیدا کند

اللہ کا رسول انسان کو غیر اللہ کی پرستش سے آزادی دلاتا ہے، تاکہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات پائے اور اپنی ذات کی اہمیت کا شعور حاصل کرے، پھر ایک نصب العین پر اپنی توجہ مرکوز کر کے ایک آئین کی پابندی کرے۔ اس پابندیِ قانون سے انسان کے اندر غرور ونخوت کے بجائے حلم و تحمل کا مادہ پیدا ہوگا اور وہ نکتہ توحید کے فوائد سے فیض یاب ہو سکے گا:

از خداونداں رباید بندہ را بندہا از پاکشاید بندہ را
زین بتانِ بے زباں کمتر نہٖ گویدش تو بندہِ دیگر نہٖ
حلقہِ آئیں بہ پایش می کشد تاسوے یک مدعایش فی کشد
رسم و آئینِ نیاز آموزدش نکتہ توحید باز اموزدش

ملتِ اسلامی کے اساسی ارکان

اوّل: توحید

امت کی بنیادی وحدتِ الہٰ کے عقیدے پر قائم ہے، یہی وہ محور ہے جس کے گرد سیّارے اُصولِ اجتماعیت مجتمع ہیں، تصورِ توحید مرکزِ ملت ہے، اس سے ایک آفاقی ترکیب اور عالمی تنظیم پیدا ہوتی ہے، ایک بین الاقوامی برادری بنتی ہے، جو یک سوئی کے ساتھ مشترک مقاصد کے لیے کام کرتی ہے، ایک نصب العین کی خدمت کرتی ہے، ایک مطمحِ نظر کے مطابق حرکت میں آتی ہے، اس کی سرگرمیوں کی ایک جہت ہوتی ہے، اس کا سفر ایک منزل کی طرف ہوتا ہے، دلوں میں یقین ایک خدا پر ایمان سے محکم ہوتا ہے، اسی یقین سے یک رنگی وہم آہنگی اور اخوت و مساوات پیدا ہوتی ہے، حق و باطل کے درمیان امتیاز کا ایک معیار نصیب ہوتا ہے، ایمان بالغیب رنگ وخوں، نسل و وطن، زبان وتہذیب اور دولت ومرتبت کے بے جا امتیازات ختم کر کے ایک متحد ومتفق ملت کا قیام عمل میں لاتا اور اسے مضبوط بنیادوں پر مستحکم کرتا ہے، ملت کے اندر حکمت وبصیرت اور سعی وعمل کے سارے سوتے توحید ہی سے پھوٹتے ہیں، ایمان باللہ سے ہی نظام و آئین اور قوت وتمکین سب کچھ میسّر آتے ہیں:

دیں ازاو حکمت ازو، آئیں ازو زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
پست اندر سایہ اش گردد بلند خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیرِ کائنات
ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ سازِ مارا پردہ گراں لا الٰہ

حرفش از لب چوں بدل آید ہمی ‌ ‌ ‌ ‌ زندگی را قوت افزاید ہمی
ملت از یک رنگیِ دل ہاستے ‌ ‌ ‌ ‌ روشن از یک جلوہ این سینا ستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے ‌ ‌ ‌ ‌ در ضمیرش مدعا باید یکے
جذبہ باید در سرشتِ او یکے ‌ ‌ ‌ ‌ ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے
گر نہ باشد سوزِ حق در سازِ فکر ‌ ‌ ‌ ‌ نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ؟ ‌ ‌ ‌ ‌ بادو آب و گل پرستیدن کہ چہ؟
برنسب نازاں شدن نادانی است ‌ ‌ ‌ ‌ حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملتِ مارا اساسِ دیگر است ‌ ‌ ‌ ‌ ایں اساس اندر دلِ ما مضمراست
حاضریم و دل بہ غائب بستہ ایم ‌ ‌ ‌ ‌ پس زبندِ این وآں وارستہ ایم
مدعائے ما، مآلِ ما یکے ست ‌ ‌ ‌ ‌ طرز و اندازِ خیال ما یکے ست

ماز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان ویک دل ویک جان شدیم

نا اُمیدی اور ڈر انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جس شخص کا دل خوف خدا سے خالی ہوتا ہے وہ بزدل ہو جاتا ہے، جب کہ خدا ترس انسان کے دل میں کبھی کسی قسم کے خوف کا گزر نہیں ہوتا اور اس کی ہمت ہمیشہ بلند رہتی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر زندگی میں کوئی اُمید باقی نہیں رہ جاتی، جب کہ خدا کی رحمت کا امیدوار ہمیشہ پر اُمید رہتا ہے اور اس کا قلب آرزوؤں سے سرشار ہوتا ہے، توحید انسان کو غم والم سے نجات دے کر اس کے اندر رجائیت اور نشاطِ کار پیدا کرتی ہے، غیر اللہ کا خوف ہر برائی کی جڑ ہے اور اس سے ہر قسم کی رذیل خصلتیں کردار میں سرایت کر جاتی ہیں، دنیا کا خوف شرک ہے، جس کا ازالہ صرف توحید سے ہوسکتا ہے:

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست ‌ ‌ ‌ ‌ زندگانی محکم از لا تقنطواست
اے کہ درد زندانِ غم باشی اسیر ‌ ‌ ‌ ‌ از نبیؐ تعلیم لاتحزن بگیر
قوتِ ایماں حیات افزایدت ‌ ‌ ‌ ‌ وردِ لا خوف علیہم بایدت
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است ‌ ‌ ‌ ‌ کاروانِ زندگی را رہزن است
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست ‌ ‌ ‌ ‌ اصل او ہم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری وکین ودروغ ‌ ‌ ‌ ‌ ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

ہرکہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

ایک بار تیر و شمشیر کے درمیان مکالمہ ہوا تو تیر نے شمشیر کی بہت تعریف کرنے کے بعد بتایا کہ تیر کی اپنی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کمان سے چھوٹتا ہے تو صرف اس قلب کو چھید ڈالتا ہے جو سلیم نہیں ہوتا، لیکن مومن کے قلب سلیم سے ٹکرا کر تیر ایک قطرۂ شبنم کی طرح ٹپک پڑتا ہے۔

اکبر کی کوشش الحاد کے بعد ہندوستان میں تخت شاہی سے توحید اور شرع اسلامی کا علم بلند کرنے والے اورنگ زیب عالم گیرؒ کی خدا پرست سیرت کا ایک واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ ایک بار وہ بندۂ خدا صبح کی سیر کے دوران محوِ نماز تھا کہ ایک شیر ببر نے اس پر حملہ کر دیا، بادشاہ ذرا بھی نہیں گھبرایا اور میان سے تلوار نکال کر اس نے شیر کا کام تمام کر دیا، پھر عبادت میں مشغول ہو گیا۔ یہ صرف اورنگ زیبؒ کا خوفِ خدا تھا جس نے شیر تک کے خوف سے اس کے قلب کو محفوظ کر دیا تھا، اس کی بے پناہ شجاعت کا راز اس کا ایمانِ محکم تھا، خدا کی محبت اور اس کے ڈرنے ہی بادشاہ کو مہیب سے مہیب خطرات کی طرف سے بے فکر اور ان کے مقابلے میں دلیر بنا دیا تھا، صحیح معنے میں اس کا دل شرک سے بالکل خالی اور توحید سے پُر تھا، اسی لیے اس کی خودی بلند تھی اور اس کا کردار خدا شناسی اور خود آ گہی کی بنا پر استوار تھا:

خویش را در بازو خودرا بازگیر　　دام گستر از نیاز و ناز گیر
عشق را آتش زنِ اندیشہ کن　　روبہ حق باش و شیری پیشہ کن

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس
خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس

دوم: رسالت

رسالت توحید کا جزوِ لازم ہے۔ خدا کی وحی رسول پر نازل ہوئی اور ان کے ہی ذریعے ملت کو خدا کا پیغام اور نظام ملا۔ اس طرح رسالت کا تصورِ جسم ملت میں روح کی طرح جا گزیں ہے۔ اسی تصور سے دین بھی ہے، آئین بھی۔ فردِ خدا کی مخلوق ہے۔ مگر ملتِ رسول سے منسوب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیر کے وقت ملتِ اسلامیہ اور ختم الرسلؐ کے ظہور کی تمنا و دعا کی تھی، جو قبول ہوئی، رسول اللہ ﷺ سے اہلِ ایمان کو ملی وحدت، باہمی اخوت اور اللہ کتاب ملی، جس کی حکمت و نصیحت ملت کی رگِ گردن ہے:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید　　وز رسالت در تنِ ماجاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما　　از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزارِ ما یک است　　جزوِ ما از جزوِ مالاینفک است
ما ز حکم نسبتِ او ملتیم　　اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

قلبِ مومن را کتابش قوت است　　　حکمتش حبل الورید ملت است
فرد از حق ملت ازوے زندہ است　　　از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے۔ رسول اللہؐ کے ماننے والے بھی اسی نسبت سے پوری دنیا کے لیے رحمت ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خدا کے آخری رسول ہیں اور اُمتِ مسلمہ آخری قوم ہے جو خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے۔ رسالت کی ساری صفات کی تکمیل محمد الرسولؐ کی سیرت میں ہوگئی ہے۔ اور آپؐ کی شریعت دین کا اوجِ کمال ہے۔ اس شریعت پر ایمان رکھنے والی اور اس سیرت کو نمونۂ عمل تصور کرنے والی امت ملی اُصول و عمل کی جامع اور مکمل ترین قوم ہے۔ یہی راز ہے تمام کثرت و تنوع کے باوجود ملتِ اسلامیہ کی اندرونی وحدت و تنظیم کا۔ اسلام پوری انسانیت کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور امتِ مسلمہ اسلامی نصب العین کے تحت آفاقی و عالمی طور پر دنیا کے تمام انسانوں کی صلاح و فلاح کی ذمے دار و علم بردار ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما　　　ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود　　　پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت زبندِ وحدت است　　　وحدتِ مسلم، زدینِ فطرت است
پس خدا برما شریعت ختم کرد　　　بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را　　　اُو رسل را ختم و ما اقوام را

رسالتِ محمدی نے عالمِ انسانیت کو عام حریت، مساوات اور اخوت کا سبق دیا، قیصر و کسریٰ، سلطان و امیر اور اسقف و براہمن سب کے طوق غلامی سے انسان کو نجات دلائی، اصحابِ دولت و اقتدار نے عوام کے جو حقوق غصب کر لیے تھے انھیں واپس دلائے، پرائی زندگی کی ساری لعنتیں ختم کر دیں اور ایک نئی زندگی دنیا کو بخشی، جس سے روئے زمین پر خیر و برکت اور ہر قسم کی ماڈی و روحانی ترقیات کا ایک نیا دور شروع ہوا، ایک خدا کی بندگی اختیار کر کے انسان تسخیرِ کائنات کی تازہ مہم پر آگے بڑھا، معاشرے کی تنظیمِ جدید ہوئی، جس سے انسان اور انسان کے درمیان سارے مصنوعی امتیازات اور غیر فطری تفرقے ختم ہو گئے، شرافت و عزت کا واحد معیار صرف صالح کردار قرار پایا:

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ　　　نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ
تا امینے حق بہ حق داراں سپرد　　　بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
قوت او ہر کہن پیکر شکست　　　نوعِ انسان را حصارِ تازہ بست
عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است　　　چشم در آغوشِ او واکردہ است

نقشِ نو بر صفحہ ہستی کشید　　امتے گیتی کشائے آفرید
مرسلاں و انبیاء آبائے او　　اکرمِ اونزدِ حق اتقائے او
کل مومن اخوۃ اندر دلش　　حریت سرمایہ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

ملی اخوت ومساوات وحریت کی تمثیل کے لیے اسلامی تاریخ کے تین عبرت انگیز واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ایک جنگِ ایران میں شکست خوردہ لشکر کے سالار جابان کی معافی کا قصہ ہے جسے صرف اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ ایک مسلمان نے اسے امان دے دی تھی اور اسے پوری ملت کی طرف سے امان تسلیم کر لیا گیا:

ہر یکے از ما امینِ ملت است　　صلح و کینش صلح و کینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد　　عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد

ایک فرد کی صلح پوری ملت کی صلح ہے اور ایک شخص کا عہد پوری جماعت کا عہد ہے۔

دوسرا قصہ سلطان مراد اور معمار کا ہے۔سلطان نے ایک مسجد بنوائی مگر اس کی تعمیر اسے پسند نہ آئی تو اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ لیا۔معمار نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔سلطان مدعا علیہ بن کر حاضر ہوا اور اس سے حکمِ قرآنی کے مطابق قصاص طلب کیا گیا،لیکن جب اس نے اپنا ہاتھ کاٹنے کے لیے معمار کے سامنے بڑھا دیا تو معمار نے عدل پا کر احسان کیا،جس کا فرمان بھی قرآن نے دیا ہے،اور سلطان کو معاف کر دیا:

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

قرآن کی نگاہ میں غلام وآقا ایک دوسرے کے برابر ہیں اور جو اہمیت ریشمی مسند کی ہے وہی چٹائی کی ہے۔

تیسرا واقعہ کربلا کا دردناک حادثہ ہے،جس میں رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت امام حسینؓ نے اسلامی اُصولِ خلافت کے تحفظ کے لیے بے مثال قربانی دی،نظامِ حکومت میں استبداد کی بدعت پر کاری ضرب لگائی اور توحید کی بخشی ہوئی آزادی کا علم بلند کیا،یہ عقل کی مصلحت کوشی کے برخلاف عشق کی سرفروشی کا کارنامہ تھا،جس سے ایمان ویقین اور خدا کی کبریائی کا ڈنکا قیامت تک بجتا رہے گا اور انسانیت کو راہِ حق میں جرات وبصیرت کا پیغام بھی ملتا رہے گا:

عقل را سرمایہ از بیم و شک است	عشق را عزم و یقین لاینفک است
عشق را آرامِ جاں حریت است	ناقہ اش را سارباں حریت است
تاقیامت قطعِ استبداد کرد	موجِ خون او چمن ایجاد کرد
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است	پس بنائے لا الہ گردیدہ است
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز	تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

آفاقی ملت

امتِ مسلمہ مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہے، اس کا تعلق کسی خاص سرزمین سے نہیں، یہ آفاق میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی لیے جب حضرت کعبؓ نے قصیدہ بانت سعاد میں رسول اللہؐ کی مدح کرتے ہوئے آنحضورﷺ کو سیف من سیوف اللہ (اللہ کی تلوار) بنادیا، تاکہ آپ کے وجود کی نسبت کسی ایک ملک کی طرف نہ سمجھی جائے:

قلبِ ما از ہندو روم و شام نیست	مرزبومِ او بجز اسلام نیست

ہمارا قلب ہندو روم و شام کا نہیں، اس کا وطن تو صرف اسلام ہے۔

اسی لیے رسول اللہﷺ نے ساری زمین کو مسلمانوں کے لیے مسجد قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو کسی ایک مقام میں مقید ہو کر نہیں رہنا چاہیے:

تاز بخشش ہائے آں سلطانِ دین	مسجدِ ماشد ہمہ روے زمیں
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو	یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

یہی وجہ ہے کہ اسلام وطن پرستی کا مخالف ہے۔قوم پرستی نے فی الواقع انسان کو انسان سے الگ کر کے قبائلیت پیدا کی ہے، جس سے انسانی اخوت فنا ہوگئی ہے، بنی نوعِ انسان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور روح اس کے اندر سے نکل گئی ہے:

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند	بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند	نوعِ انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد	آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند	آدمیت گم شدو اقوام ماند

وطن سے ہجرت رسولِ خداؐ کی سیرت کا ایک نہایت فکر انگیز واقعہ ہے:

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است	ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

ہجرت مسلمان کا آئینِ حیات اور اس کے لیے ثبات و استقلال کا باعث ہے۔

لازوال ملت

ملتِ اسلامیہ وقت کی قید سے آزاد ہے، افراد کو فنا ہے، مگر اس جماعتِ اسلامیہ کو بقا ہے جو توحید و رسالت کی بنیادوں پر اُستوار ہے، یہ امت لازوال ہے، اس کی بےخزاں ہے، زمانے کی دست برد اسے مٹا نہیں سکتی، مکان ہی کی طرح اس کا زمان بھی بے کنار ہے، جب تک ملت کا مقصودِ حیات موجود ہے اس کا دریا خشک نہیں ہوگا، خواہ تعمیر و تخریب کے کتنے ہی چکر چلیں اور اور گردشِ ایام کے کتنے ہی نشیب و فراز سامنے آئیں، قوموں کی بھی ایک اجل قرآن کے لفظوں میں ہے، لیکن امتِ مسلمہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے، جیسا اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (ہم نے اپنا کلام نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَیَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ (کفار و مشرکین اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، لیکن خواہ کفار کو کتنا ہی ناگوار ہو اللہ تو اپنا نور مکمل کر کے رہے گا) کی آیاتِ قرآنی سے واضح ہے۔ فتنۂ تاتار کا واقعہ بھی ملتِ اسلامیہ کی بقائے دوام کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس وقت کے ملی مرکز بغداد، کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ مگر امتِ مسلمہ اپنی جگہ قائم رہی، یہاں تک کہ بغداد کو تباہ کرنے والوں ہی نے اسلام کا علم اٹھالیا اور متعدد مسلم سلطنتیں ان کی فتوحات سے وجود میں آئیں، جن کے ذریعے صدیوں تک انسانیت کی زبردست ترقیات ہوتی رہیں:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے   پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ملتِ اسلامی ملتِ ابراہیمی ہے اور خلیل اللہ کی طرح اس نے وقت کے روشن کیے ہوئے کتنے ہی آتش کدوں سے گلزار کھلائے ہیں۔ امتِ مسلمہ ایک نصب العین سے عشق اور خدا ار رسول کی محبت پر مبنی ہے۔ یہ عشق عالم کے اجزاے پریشاں کو ترکیب دے کر وجود عطا کرتا ہے۔ اس سے ہستی کی سالمیت کا قیام و استحکام اور اس کی حامل ملت کا استقلال و استمرار وابستہ ہے۔ توحید کی روح اور رسالت کی برکت ملتِ اسلامیہ کو لازوال بنانے کے لیے کافی ہے، لہٰذا اس کے کمالات تا قیامت ظاہر ہوتے رہیں گے، دنیا کا وجود ہی اس کے دم قدم سے ہے:

فصلِ گل از نسترن باقی تراست   از گل و سرو و سمن باقی تراست
ہم چناں از فرد ہائے پے سپر   ہست تقویمِ امم پایندہ تر
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن   زندہ قوم از حفظِ ناموس کہن

مرگِ فرد از خشکی رودِ حیات مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات
از اجل این قوم بے پرواستے استوار از نحن نزلنا استے
تا خدا ان یطفوا فرمودہ است از فسردن ایں چراغ آسودہ است
از تہ آتش براندازیم گل نارِ ہر نمرود راسازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار چوں بہ باغِ مارسد گردد بہار
درجہاں بانگِ اذاں بودست و ہست ملتِ اسلامیاں بودست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ مازندہ است از شرارِ لا الٰہ تابندہ است
گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

آئینِ ملت

ملتِ اسلامیہ کی تشکیل ایک آئین پر مبنی ہے، جس کے بغیر وہ نہ زندہ رہ سکتی ہے نہ ترقی کرسکتی ہے:

ہستیِ مسلم زآئین است و بس باطنِ دینِ نبی این است و بس

آئین قانونِ فطرت ہے، پتی آئین کے تحت پھول بنتی ہے اور پھول گل دستہ بن جاتا ہے، آواز کے انضباط سے ہی نغمہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ محض شوروغوغا ہوگا، سانس پابند نے ہوکر ایک نوائے دلکش بن جاتی ہے۔ اس طرح دنیا کی ہر چیز آئین کی خوبی سے قائم ہے اور نشوونما پا رہی ہے، خوب سے خوب تر ہو رہی ہے۔ انسانیت اور اس کی بہترین جماعت، ملتِ اسلامیہ کا بھی ایک آئین ہے، جو قرآنِ حکیم ہے، یہ مسلمانوں کا دستورِ حیات ہے، ان کا مایہ وقار ہے، اس کی حکمت لازوال ہے، تکوینِ حیات کا باعث ہے اور اس سے ثبات واستقلال حاصل ہوتا ہے:

توہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخہ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

کتاب اللہ خدا کا آخری پیغام انسانوں کے نام ہے، یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے اور بنی نوعِ انسان کے لیے ایک پیامِ رحمت ہے:

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اور رحمۃ للعالمین

قرآن کے آئینِ زندگی نے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے، بڑے بڑے رہزن بھی اس کے پابند ہو کر دنیا کے رہبر ہو گئے ہیں:

رہزناں از حفظِ اور رہبر شدند		از کتابے صاحبِ دفتر شدند

لیکن مسلمانوں نے قرآن سے بیگانہ ہو کر اپنی ملی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اسی ناپسندیدہ روش کے سبب ان کا عروج وال میں بدل گیا ہے:

قطع کردی امرِ خود را در زبر		جادہ پیمائی الی شیء نکر

بہر حال، اسلامی زندگی قرآن پر پورا پورا عمل کیے بغیر ممکن نہیں، اللہ کی کتاب میں درج آئین پر بہ تمام وکمال کاربند ہو کر ہی مسلمان عزت کی زندگی گزار سکتے اور دنیا میں آگے بڑھ سکتے ہیں، ان کا وجود اور عروج دونوں آئینِ قرآنی سے ہی وابستہ ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن		نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

تقلید بمقابلہ اجتہاد

اقبال فکری ونظری طور پر اجتہاد کو ملی وجود کی تازگی کے لیے ضرور قرار دیتے رہے، مگر عملاً انھوں نے دیکھا کہ آزادیِ رائے ایک ایسی آزادروی اور اغیار کی غلام پیدا کر رہی ہے جس سے ملت میں انتشار برپا ہے اور مسلمانوں کا کردار پست ہو رہا ہے، ناپختہ خیالات فقط زمانہ سازی اور مفاد پرستی کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملت کی مرکزیت ختم ہو چکی ہے اور وہ چلتی ہوئی ہواؤں کے رخ پر ناچ رہی ہے۔ لہٰذا ایک پختہ کار اور صحیح الفکر مدبر کی حیثیت سے اقبال نے تجویز کیا کہ ایک پرآشوب دور میں پہلے سے طے شدہ ضوابط کی تقلید ہی مناسب ومفید ہے:

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات		ملت از تقلید می گیرد ثبات

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است		معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

ایسی بااُصول تقلید وحدتِ ملی اور جماعت کے نظم وضبط کے تحفظ کا باعث ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی بنا تصورِ توحید پر استوار ہوتی ہے:

نقش بر دل معنی توحید کن		چارہ کارِ خود از تقلید کن

اسلاف کی تقلید خیر و برکت کی ضامن ہے، اس لیے کہ اُنھوں نے بڑی احتیاط، نہایت غور وفکر اور کامل بے غرضی دبے لوثی کے ساتھ قرآن وسنت کی روشنی میں معاشرت کے احکام مرتب کیے، اُنھوں نے منشا شریعت کو صحیح طور پر سمجھا اور جو کچھ تجویز کیا تقویٰ کے ساتھ:

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر   اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست   کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں ریسد ہمی باریک تر   ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر

زوال وانحطاط کے دور میں اجتہاد انتشار انگیز ہوتا ہے:

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط   قوم را برہم ہمی پیچد بساط

تقلید بہر حال آئینِ قرآنی کی ہے جو اللہ کی رسی ہے اور اسے مضبوطی سے تھام لینے کے لیے فرمانِ خداوندی واعتصموا بحبل اللہ نازل ہوا۔ ایک آئین کی پیروی سے اتحاد و اتفاق پیدا ہوتا ہے، موتیوں کی چمکتی ہوئی بیش قیمت مالا بنتی ہے، اور نہ انسان غبارِ راہ کی طرح بکھر جاتا ہے:

از یک آئینی مسلمان زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست   اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

سیرتِ ملی اور اتباعِ آئین

سیرتِ ملی یا اجتماعی خودی کی پختگی آئینِ الٰہی کے اتباع سے ہوتی ہے، اس لیے کہ علمِ حق شریعت کے سوا کچھ نہیں اور سنتِ رسولؐ کی پیروی محبتِ رسولؐ کے سبب ہوتی ہے، جو ہر فردِ ملت کے قلب و روح میں جاگزیں ہے۔ نظامِ ملت آئینِ حق پر عمل سے قائم ہوتا ہے اور اس نظام کی محکمی ملت کے لیے بقائے دوام کا باعث ہے۔ اسلام کی حقیقت ہی شرعِ رسولؐ ہے، شریعتِ محمدیؐ سے دین کا آغاز بھی ہوتا ہے اور اسی پر دین کا انجام بھی منحصر ہے:

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست   اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئین حق گیرد نظام   از نظام محکمے خیزد دوام
باتو گویم سرِ اسلام است شرع   شرع آغاز است و انجام است شرع

دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات ہے اور شریعت محمدی آئینِ حیات کی تفسیر ہے، جو کچھ کتاب اللہ میں درج ہے سنت اللہ اس کی ہی تشریح و تعمیل کرتی ہے۔ اپنے اقوال و افعال کے ذریعے رسولِ خدا نے جو کچھ ہدایت دی ہیں وہ سب احکامِ الٰہی کے مطابق ہیں۔ اس طرح شریعت دراصل قانونِ قدرت پر عمل کا پیغام اور طریقہ ہے۔ جو جماعت اُس طریقے پر کاربند ہوگی وہ فولاد کی طرح مضبوط ہو جائے گی۔ ایک سیسہ پلائی ہوئی

دیوار (بنیان مرصوص) بن جائے گی، جس میں کوئی شگاف نہیں ہوگا، وہ دنیا میں ایک کوہ وقار کے مانند کھڑی ہوگی:

از عمل آہن عصمت می سازدت　　جائے خوبے در جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند　　پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات　　شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات

ملتِ اسلامیہ کے کردار کی استواری عربی صلابت سے وابستہ ہے، نہ کہ عجمی لطافت سے۔ اصلاً یہ عرب کا سوز دروں اور جذبۂ عمل ہے، نہ کہ عجم کی فلسفہ طرازی وتن آسانی، جوملتِ اسلامیہ کی طاقت، جمعیت اور شوکت کا باعث ہے:

قلب رازیں حرف حق گرداں قوی　　باعرب در ساز تا مسلم شوی

اجتماعی کردار اور اسوۂ رسولؐ

اسلامی شریعت کا مثالی نمونہ سیرتِ رسولؐ ہے، جسے قرآن نے اسوۂ حسنہ اور خلق عظیم قرار دیا ہے۔ لہٰذا افرادِ ملت کی حیثیت سے مسلمانوں کا اجتماعی کردار اسوۂ رسولؐ پر مبنی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے عادات و اطوار ہی ایک اچھے انسان اور سچے مسلمان کے لیے نمونے کے اخلاق ہیں۔ یہ آپ ہی کے اخلاق کا نتیجہ ہے کہ مسلمان کی فطرت وخصلت دنیا کے انسانوں کے لیے سراپا رحمت وشفقت ہے۔ ہر فرد ملت ایک قطرۂ نیساں کی طرح ہے جو سیرتِ رسول کے بحرِ بے کراں کی تہہ میں بیٹھ کر موتی بن جاتا ہے۔ جو شخص آفتاب رسالت سے روشنی حاصل کرتا ہے اس کے کردار کی تابانی کبھی ماند نہیں پڑتی، حسنِ عمل اسے زندۂ جاوید بنا دیتا ہے:

فطرت مسلم سراپا شفقت است　　در جہاں دست و زبانش رحمت است
آں کہ مہتاب از سر انگشتش دونیم　　رحمت او عام و اخلاقش عظیم
طینت پاک مسلماں گوہر است　　آب و تابش ازیم پیغمبر است
آب نیسانی بہ آغوشش در آ　　وزمیان قلزمش گوہر برآ
در جہاں روشن تر از خورشید شو
صاحبِ تابانیِ جاوید شو

ملت کا مرکز محسوس

مظاہرِ فطرت اور حقائقِ کائنات کے مشاہدے اور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے کا وجود ارتکاز

سے وابستہ ہے، آگ کی اڑتی ہوئی چنگاریاں مرتکز ہو کر لالہ بن جاتی ہیں، ہوا کی بہتی ہوئی لہریں سینے کے اندر مرتکز ہو کر سانس بن جاتی ہیں، بکھرے ہوئے نباتی عناصر مجتمع ہوتے ہیں تو ایک دانے سے ایک درخت اُگ جاتا ہے۔ انسان کی نگاہیں اسی طرح ایک نقطے پر مرکوز ہو کر زندگی کے سارے کمالات دکھاتی ہیں۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ملت کا ایک محسوس مرکز ہو، جو اس کی جمعیت کا سامان کرے۔ ملت کا سارا ربط و نظام مرکزیت سے وابستہ ہے:

ہم چناں آئین میلادِ امم　　زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چوجاں در پیکر است　　خط او در نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے　　روزگارش را دوام از مرکزے

زندگی ایک مرکز پر آتی ہے تو ملت پیدا ہوتی ہے، کسی حلقے کے لیے مرکز کی حیثیت جسم میں جان کی ہے، جیسے کوئی بھی لکیر ایک نقطے سے شروع ہوتی ہے، قوم کی ہم آہنگی اور تنظیم اس کے مرکز پر منحصر ہوتی ہے اور اسی مرکزیت سے اسے استقلال واستحکام نصیب ہوتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا مرکز محسوس خانہ کعبہ ہے، جو امتِ مسلمہ کے تمام سوز و ساز کا سرچشمہ ہے، حرم کے ساتھ تعلق کے سبب ہی ہم زندہ ہیں اور جب تک اس کا طواف کرتے رہیں گے پایندہ ہوں گے، ہماری اجتماعیت حرمِ کعبہ پر مبنی ہے:

راز دار و رازِ ما بیت الحرم　　سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
تو ز پیوندِ حریمے زندۂ　　تا طواف او کنی پائندہ
در جہاں جان امم جمعیت است　　در نگر سر حرم جمعیت است

لا مرکزیت کی تباہیوں کے لیے سب سے عبرت ناک مثال یہودیوں کی ہے، جو پوری دنیا میں بکھرے ہوئے اور دوسری قوموں کے رحم وکرم پر ہیں، ان کا اپنا کوئی مستقل بالذات مرکز ایسا نہیں جو ان کے بل بوتے پر قائم ہو۔ چنانچہ ان کی فطرت وسیرت مسخ ہو چکی ہے اور وہ انسانی تاریخ کی سب سے مردود قوم بن گئے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنے حرم کی قدر ومنزل اور اہمیت وعظمت سے آشنا ہونا چاہیے۔ کعبے میں سجدہ ریز ہو کر اور اس کے نیاز مند بن کر ملت کے اسلاف نے ایک عالم میں ہنگامہ بپا کر دیا تھا اور پوری دنیا ان کی ناز برداری کرنے لگی تھی۔ لہٰذا آج کے مسلمانون کو اپنے جلیل القدر اسلاف کے رستے پر چل کر ان ہی کے جیسا اعزاز واکرام حاصل کرنا چاہیے:

مثلِ آبا غرق اندر سجدہ شو　　آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو
مسلمِ پیشیں نیازے آفرید　　تابہ نازِ عالم آشوبے رسید

ملت کا نصب العین: توحید

مدعا و مقصد مایہ وجود ہے، ہستی کا سارا کارخانہ کسی نشانے تک پہنچنے کے لیے چل رہا ہے، بغیر منزلِ مقصود کے سفرِ حیات ممکن نہیں، نصب العین اور مطمح نظر ہی سے انسان میں حرکتِ عمل پیدا ہوتی ہے، اس کی ساری سرگرمیاں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہیں، مدعا کا تقاضا آدمی کے اندر ہمت بھی پیدا کرتا ہے اور قوت بھی، تمام عزائم اور آرزو میں مقصود کی کشش سے ابھرتی ہیں، دنیا ایک صحرا ہے اور انسان ایک محمل کے تعاقب میں دوڑ رہا ہے، جو اس کی نگاہوں کے اُفق پر ہمیشہ موجود ہے اور اگر وہ اس سے ایک لمحہ بھی غافل ہو جائے تو یہ محمل نظروں سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ پھر منزل کی طرف جانے والے راستے کے فاصلے ناقابلِ عبور ہو جائیں گے۔ کائنات کا ایک منتہا ہے جس تک وہ صدیوں کے بعد اور لاتعداد مراحل طے کر کے پہنچی ہے، کتنے ہی نقوش لوحِ زندگی پر ثبت ہوئے، کتنے ہی باطل خداوندوں سے سابقہ پڑا، تب دنیا میں اذاں کی آواز نوائے حق بن کر گونجی، ایمان کا غلغلہ بلند ہوا، توحید کا کلمہ انسان کی زبان پر جاری ہوا، لا الہ الا اللہ نقطہ پرکارِ حق اور منتہائے کائنات ہے۔ یہی وہ آفاقی صداقت ہے جس کی برکت سے آسمان کے طبقات قائم ہیں، آفتاب روشن ہے، دریا میں موج تڑپ رہی ہے اور سمندر کی تہہ میں موتی بن رہے ہیں، مٹی پھول کھلا رہی ہے، بلبل زمزمہ سنج ہے، انگور کے خوشے چمک رہے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کا نصب العین یہی توحید ہے، جس کے نشر و اشاعت کے منصب پر وہ مامور کی گئی ہے، کائنات میں تکبیر کا بول بالا کرنا ہی ملت کا مقصدِ وجود ہے۔ انسان تاریخ میں طرح طرح کی بت سازیاں کرتا رہا ہے، عصرِ حاضر نے بھی رنگ و نسل اور ملک و نسب کے اصنام تراش لیے ہیں، جن کی پرستش آج کی متمدن دنیا میں ہر جگہ ہو رہی ہے اور ان جھوٹے خداؤں کی قربان گاہ پر انسانیت کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ نمرود و آزر کے اس دورِ تباہی میں مسلمان کو ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرح کامل و خالص توحید کا علم اٹھا کر سارے باطل خداؤں کے سر کچل دینے چاہییں اور بنی نوعِ انسان کو ان کے چنگل سے چھٹکارا دلا کر امنِ عامہ سے ہم کنار کرنا چاہیے، تاکہ تخریب کے بجائے تعمیر کا دور دورہ ہو اور کاروانِ حیات ارتقا کی اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھا سکے:

چوں حیات از مقصدے محرم شود ۔۔۔ ضابطِ اسباب ایں عالم شود
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل ۔۔۔ کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل
مدعا مضرابِ سازِ ہمت است ۔۔۔ مرکزے کو جاذب ہر قوت است
تخمِ ایماں آخر اندر گل نشاند ۔۔۔ بازبانت کلمہ توحید خواند

نقطہ ادوار عالم لا الٰہ   انتہائے کار عالم لا الٰہ
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست   حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست
فکرِ انساں بت پرستے بت گرے   ہر زماں در جستجوے پیکرے
باز طرح آزری انداخت است   تازہ تر پروردگارے ساخت است
اے کہ خوردستی زمینائے خلیل   گرمیِ خونت زصہبائے خلیل
برسرِ ایں باطلِ حق پیر ہن   تیغ لا موجود الا ھو بزن

ہر دور کی طرح عصر حاضر میں بھی صرف ملت اسلامیہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک بار پھر توحید کا نعرہ بلند کرے گی، اس لیے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے اور دین اسلام کی تکمیل اس شریعت محمدی پر ہی ہوئی ہے جس کی حامل تاریخ میں ملت اسلامیہ رہی ہے، لہٰذا وہی آج کی جاہلیت جدیدہ میں حق کا نور پھیلا کر بڑھتی ہوئی تاریکی کو دور اور زمانے کو روشن کر سکتی ہے:

جلوہ در تاریکیِ ایام کن
آں چہ بر تو کامل آمد عام کن

تسخیرِ کائنات

توحید ایمان بالغیب ہے۔ ایک حاضر و ناظر خدا پر یقین انسان کو کائنات کی تمام غیبی قوتوں پر دست رس کے لیے ابھارتا ہے، جب کہ موجودات کی تسخیر اس کا مقصدِ وجود ہے، جو خدا کا ہو جاتا ہے پوری خدائی اس کی ہو جاتی ہے، خدا کو ماننے والا آدمی ہر قسم کی قیود و حدود سے آگے نکل جاتا ہے، اس کا مطلب ایک لامکاں، ہستی، ازل ہے، جس کی تلاش میں اسے ابد تک سرگرداں رہنا چاہیے۔ لہٰذا تمام محسوسات پر قابو حاصل کرنا انسانیت کا نصب العین ہے، ساتھ ہی کائنات کے سارے اسرار و رموز کا تجسس اس کی فطرت میں داخل ہے:

اے کہ باناپدہ پیماں بستہ   ہمچو سیل از قیدِ ساحل رستہ
ہستیِ حاضر کند تفسیر غیب   می شود دیباچہِ تسخیرِ غیب
ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس   سینہِ او عرضہ تیر است و بس
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد   عالمے از ذرہَ تعمیر کرد

لہٰذا عالم اسباب سے صرف نظر کرنے کے بجائے اس کے ساتھ پورا پورا اعتنا و التفات کرنا چاہیے، دنیا مسلم کی خودی کی توسیع و ترقی کے لیے ہے، تاکہ اس کی شخصیت کے تمام امکانات بروئے عمل

آ ئیں، جہاں اخیار و صالحین کے لیے ہے، اس کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا ہے، نفس کی معرفت کے ساتھ ساتھ آفاق کا عرفان مومن کو معیارِ وجود پر پورا اترنے کے قابل بنانا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم عالم کی تسخیر نہ کریں گے تو عالم ہمیں مسخر کر لے گا:

اے کہ از تاثیر افیوں خفتہٖ — عالم اسباب را دوں گفتہٖ
غائتش توسیع ذاتِ مسلم است — امتحانِ ممکناتِ مسلم است
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد — جلوہ اش بادیدۂ مومن سپرد
کارواں را رہ گزار است ایں جہاں — نقدِ مومن راعیار است ایں جہاں
گیراو را تانہ او گیرد ترا
ہمچو نے اندر سبو گیرد ترا

نظامِ کائنات پر قابو حاصل کر کے ہی انسان تکمیلِ ذات کر سکتا ہے، وہ نائبِ حق ہے، لہٰذا عناصر پر اس کا حکم چلنا چاہیے۔ مومن کو پانی سے بجلی اور دھوپ سے روشنی پیدا کرنی ہے، اسے پوری تدبیر کے ساتھ اشیا کی حقیقت کا سراغ لگانا اور اس سے مصرف لینا ہے۔ اس طرح فطرت کی قوتوں کا استعمال کر کے انسان برق و حرارت پر سوار ہو چکا ہے اور مزید انکشافات و ایجادات کے بعد اپنے خلائی سفر میں مادی کائنات کی آخری حد تک جا سکتا ہے، جب کہ اس کی روحانی طاقت بھی انتہائی حد تک بڑھ چکی ہوگی۔ آدمِ خاکی کا سارا اعتبار ''علم آدم الاسماء کلھا'' کی تعلیم پر عمل سے ہی قائم ہے، ایک ناپیدا کنار کائنات میں حکمتِ اشیا کا علم و تجربہ ہی انسان کے تحفظ کا سب سے بڑا قلعہ اور اس کی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے:

تاز تسخیر قوائے ایں نظام — ذو فنونیہائے تو گردد تمام
نائب حق درجہاں آدم شود — بر عناصر حکمِ او محکم شود
تابش از خورشید عالم تاب گیر — برقِ طاق افروز از سیلاب گیر
جستجو را محکم از تدبیر کن — انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر — نشہ زیرِ پردہ صہبا نگر
آں کہ بر شیا کمندانداخت است — مرکب از برق و حرارت ساخت است
علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصارِ آدم است

ملی خودی کا انفرادی احساس اور پاسِ روایات

جس طرح ایک بچہ بالغ ہوکر گرد و پیش کا فہم حاصل کرتا اور اپنے ماحول کی حقیقت سمجھتا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی کا کمال یہ ہے کہ جماعت اسی شدت کے ساتھ اپنی خودی کو محسوس کرلے جس شدت کے ساتھ ایک فرد اپنی ذات کا احساس کرتا ہے۔ یہ ملی احساس اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی روایت کا پورا پورا تحفظ کیا جائے، اپنی تاریخ ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھی جائے، ملی سرگزشت فراموش نہ کی جائے۔ تاریخ کوئی داستان نہیں، یہ واقعات کی ایک زنجیر ہے، سلسلہ روز و شب پر نظر رکھ کر ہی دنیا میں کچھ کیا جا سکتا ہے، قومی کمالات کو یاد رکھنے سے ملی شعور بیدار رہتا ہے اور ہر فرد ملت کو عمل پر اُبھارتا ہے، جس سے گردشِ ایام کے درمیان پائداری حاصل ہوتی ہے:

صد گرہ از رشتہ خود وا کند تا سرِ تارِ خودی پیدا کند
گرم چوں افتدبہ کارِ روزگار ایں شعورِ تازہ گردد پائدار
قوم روشن از سوادِ سرگزشت خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
ربطِ ایام است مارا پیرہن سوزنش حفظِ روایاتِ کہن

زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ لہٰذا اجتماعی وجود اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب ملی تاریخی محفوظ ہو۔ حیات ایک وحدت ہے۔ لہٰذا ماضی و حال و مستقبل کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رہنا چاہیے:

ضبط کن تاریخ را، پایندہ شو از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو
سرزند از ماضیِ تو حالِ تو خیزد از حال تو استقبال تو

زمانے میں لازوال ہونے کا نسخہ یہی ہے کہ فرد جماعت کی موجودہ، گزشتہ اور آئندہ تاریخ کے ساتھ مربوط رہے۔ تسلسل کا یہ ادراک زندگی کی سب سے بڑی علامت اور کسی وجود کی بے خطا شناخت ہے:

مشکن اَر خواہی حیاتِ لازوال رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

یعنی ملت کے تاریخی واقعات کا مربوط احساس دراصل دنیا میں زندگی کے تسلسل کا ادراک ہے، ہر لمحے کے ساتھ دوسرا لمحہ پیوستہ ہے، حال کے ایک سرے پر ماضی ہے تو دوسرے سرے پر مستقبل، ان دونوں کی جامعیت ہی حال کو بامعنی اور نتیجہ خیز بناتی ہے، صراحی سے قطرہ قطرہ شراب ٹپکتی ہے اور اس ترشح سے قلقل کی آواز بلند ہوتی ہے، جسے سن کر ہی مے کشوں کو زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ان کی روح سرشار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ملی روایات کا مطالعہ افراد کے عزائم بلند کرتا اور انھیں جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ

عطا کرتا ہے، وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے اپنے کردار کے لیے ایک نمونہ حاصل کرتے ہیں، ان کے اندر جوشِ عمل پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑی امنگ کے ساتھ اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔

امت اور اَمومت

اُمت اور اَمومت دونوں الفاظ کی اصل ایک ہے، اُم۔ اس طرح ملتِ اسلامیہ کی خودی کے لیے ماں کی حیثیت سے عورت کا رتبہ بہت بلند اور اہم ہے۔ اسی لیے تاریخِ انسانی میں اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ نہ تو جدید آزادی نسواں دے سکی نہ قدیم غلامی نسواں، کہیں افراط ہے تو کہیں تفریط، توازن صرف اسلام میں ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے قرآن کے لفظوں میں عورت مرد کا لباس ہے، جس طرح مرد عورت کا لباس ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا شریعت محمدی نے سماج اور خاندان پر عورت کے حقوق نہایت اعتدال و انصاف کے ساتھ معین کر دیے ہیں۔ اسلامی سماج میں عورت کی ایک مستقل ہستی اور خودی ہے، جس کی ترقی کے لیے وہ اپنے مخصوص دائرۂ عمل کی حدود میں کام کرتی ہے۔ مرد ہی کی طرح عورت ایک خاندان کی فرد ہے اور اس کا وجود چند رشتوں سے محکم ہوتا ہے، وہ محض عورت اور علامتِ جنس نہیں ہے جس سے مرد آزادی اور برابر کے نام پر کھیلتے اور اس کی آبرو لوٹ کر اسے اپنی خواہشات نیز مفادات کے لیے استعمال کرتے رہیں، جیسا جدید مغربی تمدن وتہذیب میں ہو رہا ہے، بلکہ عورت کسی کی بیٹی ہے، کسی کی بہن، کسی کی بیوی اور سب سے بڑھ کر کسی کی ماں، جس طرح مرد باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا ہے۔ رشتے کا یہی وہ تقدس ہے جس کے پیش نظر ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اولاد ماں کے آغوشِ تربیت میں پرورش پاتی ہے اور بچوں کے کردار پر بہت ہی فیصلہ کن اثر ماں کے اخلاق کا پڑتا ہے۔ اس طرح آئندہ نسلوں اور انسانیت کے مستقبل کا مدار ماں کی حیثیت سے عورت کی سیرت پر ہے۔ عصر حاضر کی غیر متوازن تمدنی ترقیات میں انسانی سماج کی یہ بنیادی حقیقت فراموش کر دی گئی ہے، مغربی سماج نے زن کو نازن بنا دیا ہے، یورپ اور امریکہ کا معاشرہ مرگِ امومت سے دوچار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جتنی جتنی صنعتی ترقیات ہو رہی ہیں معاشرتی الجھنیں اتنی ہی بڑھتی جا رہی ہیں، خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور انسان کی حیثیت سے نئی نسلوں کا مستقبل ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی خودی کے تحفظ کے لیے وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ بقائے نوع کے لیے اسلامی تصورِ امومت کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اسلام نے خواتین کے تحفظ و احترام کے لیے جو ضابطہ حیات تجویز کیا ہے اس پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ اس ضابطے کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی عفت وحیا کے لیے سازگار ماحول پیدا

کیا جائے، جس میں بے پردگی، عریانی فحاشی، آزادانہ اختلاطِ مرد و زن اور ہوس رانی نہ ہو:

اسلام

پوششِ عریانیِ مرداں زن است حسنِ دل جو عشق را پیرہن است
از امومت پختہ تر تعمیرِ ما در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے
ملت از تکریم ارحام است و بس ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات از امومت کشفِ اسرارِ حیات

مغرب

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش از حیا ناآشنا آزادیش
علم او بارِ امومت بر نتافت برسرِ شامش یکے اختر نتافت

ایک عورت کا مثالی نمونہ حضرت فاطمہ زہراؓ بنتِ رسول کی شخصیت ہے، جو ختم الرسلؐ کی دختر ہونے کے ساتھ ساتھ شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زوجہ مکرمہ اور حضرت امام حسینؓ کی والدہ محترمہ ہیں۔ ان کی زندگی کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اخلاق سے گھر کا ایک ایسا ماحول بنایا جس میں شہید کربلا جیسے مرد حق کی پرورش ہوئی۔ اس ماحول میں خدا کی بندگی، احکام رسول کی اطاعت، شریعت کی پابندی شوہر کے ساتھ وفاداری، اولاد کی تربیت اور ضرورت مندوں کی خدمت کے عناصر نمایاں تھے، صبر وشکر کے ساتھ دنیا کے ہر کام اور وقت کے ہر لمحے میں رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش ہوتی تھی، اپنے معاملات میں قناعت و احتیاط اور دوسروں کے ساتھ ہم دردی و غم خواری کی جاتی تھی، پورا خاندان وقار و ایثار کا ایک نمونہ تھا:

آں یکے شمعِ شبستان حرم حافظِ جمعیتِ خیر الأمم
مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گو نہ سوخت با یہودے چادرے خود را فروخت
آں ادب پروردۂ صبر و رضا آسیا گرداں و لب قرآں سرا

خلاصۂ مباحث

مثنوی اسرار و رموزِ خودی و بیخودی کے تمام مباحث و مضمرات کا خلاصہ سورۂ اخلاص ہے، جس کی ہر آیت خودی کے کسی نکتے پر مشتمل ہے۔ اس طرح خودی کا جو فلسفہ اقبال نے مثنوی میں پیش کیا ہے وہ ان کے بقول قرآن بالخصوص اس کی ایک مختصر ترین سورہ سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ شاعر نے مذکورہ سورہ کی آیات

کی تفسیر اپنے اشعار سے کی ہے۔

قل ھو اللّٰہ احد (کہو اللہ ایک ہے)

خودی کا اصل الاصول توحید ہے، معرفتِ نفس معرفتِ رب کے بغیر ممکن نہیں، یہ ایک خدا کے اقرار ہی کا فیض ہے کہ انسان کو صحیح معنے میں عرفانِ ذات حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی حدود اور امکانات دونوں سے بیک وقت آگاہ ہو جاتا ہے، جس کے سبب اس کے شعورِ ذات میں اعتدال اور اس کے مطابق عمل میں توازن پیدا ہوتا و ہے۔ زندگی میں حقیقت پسندی حق شناسی پر ہی مبنی ہے۔ وحدتِ الٰہ کا تصور طبیعت میں یک سوئی سیرت میں ہمواری اور کردار میں استواری پیدا کرتا ہے۔ توحید فرد اور سماج کے اندر مرکزیت قائم کرتی ہے۔ مسلم کا مطلب ہی ہے کہ ایک خدا کی بندگی یہ بندگی ایسی بلندی کا باعث ہے کہ پوری کائنات انسان کے لیے مسخر ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت اشرف المخلوقات بن جاتی ہے۔ اسی لیے صبغۃ اللہ کی آیت کے علاوہ حدیث رسول ہے کہ تخلقوا باخلاق اللّٰہ یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ یا اسمائے حسنیٰ کی خصوصیات پیدا کرو۔ ملی اتحاد و اتفاق بھی توحید ہی پر عمل کا عطیہ ہے۔ ایمان کا اعتبار عمل سے ہے، ایک فرد ایک سماج کے اندر عمل کر کے وجود کی آفاقیت کی شہادت دیتا ہے:

این کہ در صد سینہ پیچد یک نفس
سرے از اسرارِ توحید است و بس
رنگ او برکن مثال او شوی
در جہاں عکس جمال او شوی
آں کہ نام تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوے یکی آور دہ است
با یکی ساز، از دوئی بردار رخت
وحدتِ خود را مگر داں لخت لخت
یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن
لذتِ ایماں فرزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

اللّٰہ الصمد (اللہ بے نیاز ہے)

خدا کی بے نیازی اس پر ایمان رکھنے والے کو بھی بے نیاز بنا دیتی ہے، مومن مسوا اور غیر اللہ کی غلامی و تابعداری سے آزاد ہو جاتا ہے، خدا کے سوا اس کا سر کسی کے آگے نہیں جھکتا، اس کی سرفرازی کے سامنے کائنات کی ہر قوت پست ہو جاتی ہے، ایک عاف باللّٰہ مرد فقیر جیسے امام مالک، ایک زبردست بادشاہ، جیسے ہارون رشید کے دربار میں حاضر ہونے کے بجائے اسے اپنے دربار میں لاتا ہے، جو دیارِ رسول میں واقع ہے، خوددار اور بے غرض انسان دنیا کی کسی طاقت کا نیاز مند نہیں ہوتا، اس کا صرف ایک رنگ ہوتا ہے، اللہ کا رنگ، جس کے ساتھ دوسرے کسی کا رنگ اس کو گوارا نہیں جو انسان اپنی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے وہ نسخہ کیمیا کو چھوڑ کر خاک بہ سر ہو جاتا ہے اور اپنی رسوائی کا سامان کرتا ہے۔ آدمی کو پروانے کی طرح دوسرے کی روشنی کیگر دطواف نہیں کرنا چاہیے، شمع کی طرح اپنے نور باطن سے جو نور خداوندی ہے روشن ہونا اور پوری دنیا کو روشن کرنا چاہیے۔ وہی فرد صحیح معنے میں فرد ہے جو اپنی شناخت رکھتا ہے اور وہی قوم صحیح معنے میں قوم ہے جو صرف اپنی ملی خصوصیات پر اعتماد کرتی ہے۔ مسلمان کے لیے ایک خدا کی بندگی کافی ہے:

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردش دولاب نیست
مسلم استی بے نیاز غیر شو
اہل عالم را سرا پاخیر شو
بے نیازی ناز ہا دارد بسے
ناز او انداز ہا دارد بسے
بے نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است
بر دلِ خو نقشِ غیر اند اختی
خاک بردی کیمیا در باختی
تا کجا طوفِ چراغ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت
قوم قوم آمد کہ جز باخود نہ ساخت

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو

لم یلد و لم یولد (خدا نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا)

اسلامی تصور کے مطابق خدا کا تو الدوتناسل سے بالا ہونا عام انسانی اخوت و مساوات کی ضمانت ہے۔کسی خاص انسان کے ساتھ خدا کا کوئی ذاتی رشتہ ناطہ نہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث رسول کے مطابق تمام مخلوقات اللہ کا کنبہ (الخلق عیال اللہ) ہیں اور ان کے درمیان حسب نسب، منصب، رنگ وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔لہٰذا اگر ملت اسلامیہ کے اندر رنگ وخوں کا کوئی امتیاز کیا جانا ہے تو اس سے ملی اخوت پر ضرب پڑتی ہے:

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمت یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزو ملت کردۂ
رخنہ درکار اخوت کردۂ

توحید کی علم بردار امِ مسلمہ کے اندر اس تفرقے کی کوئی گنجائش اصولاً نہیں پائی جاتی۔تمام افرادِ ملت عالمی سطح پر ایک خدا کے ساتھ ایک ہی رسولؐ کے ماننے والے اور ان سے محبت رکھنے والے ہیں، رسول خداؐ کی یہ الفت ان کی ہم آہنگی کے لیے کافی ہے،قوم رسول ہاشمیؐ ایک خاص ترکیب کی حامل ہے، جو دوسری ملتوں کے برخلاف ملک ونسب کی حد بندیوں سے پرے ہے،ایمان اللہ کے ساتھ ساتھ صرف عشق رسولؐ اہلِ اسلام کی جمعیت کا سرمایہ ہے یہی مسلمانوں کا دین وایمان ہے،خدا ورسول کے احکام و ہدایات پر بے چون و چرا عمل کرنا ہی ان کی شان ہے:

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابند نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک و گر پیوستہ ایم
رشتۂ ایک تو لایش بس است
چشم ما را کیف صہبایش بس است

عشق او سرمایۂ جمعیت است
ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است

و لم یکن له کفو احد (کوئی خدا کا ہمسر نہیں)

خدا کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ چنانچہ اس کے بندوں کا بھی کوئی حریف و ہمسر نہیں۔ ایک آیتِ قرآنی کے مطابق اہل ایمان اپنے کردار کی بنا پر دوسروں سے بلند تر ہیں: و انتم الا علون ان کنتم مومنین۔ مسلمان صحیح معنے میں بندۂ مولا صفات ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

(مسجد قرطبہ- بالِ جبریل)

اسی حیثیت سے مسلمان دوسرے انسانوں کے ساتھ عفو و عدل اور احسان و فیاضی سے کام لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا قہر بھی اللہ کی مخلوقات کے لیے ایک کرم ہے، اس لیے کہ وہ ظلم و ستم کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا اور باطل کا پنجہ مڑوڑ کر بنی نوع انسان کے لیے امن و امان اور سکون و راحت کا سامان کرتا ہے، اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے ہے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے:

آں کہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم ورنہ سازد باشریک
مومن بالاے ہر بالاترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
خرقۂ لا تحزنوا اندر برش
انتم الاعلون تاجے برسرش
عفو و عدل و بذل و احساس عظیم
ہم بہ قہر اندر مزاج او کریم

اس طرح مومن کی اجتماعی نیز انفرادی خودی اس کی اپنی شخصیت کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ پورے انسانی معاشرے کی ترقی کا باعث ہے، اس کی خودی و بے خودی دونوں سے صلاح و فلاح کا سامان ہوتا ہے۔ للیکن عصر حاضر میں مسلمانوں کی یہ خودی گم ہو چکی ہے اور وہ دنیا میں ہر جگہ قومیت اور وطن پرستی کے

اندر مبتلا ہو کر اپنے انسانی و آفاقی مشن سے غافل نظر آ رہے ہیں۔ یہ ان کی پستی اور زوال کی نشانی ہے، ورنہ معراجِ مصطفیؐ کا سبق تو یہ ہے کہ ''عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں'' مسلمان ایک ناوک ہے اور ''ہدف اس کا ہے ثریا'' لہٰذا اس کا نعرہ ہونا چاہیے ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''، اس لیے کہ مہر و ماہ و مشتری اس کے ہم عناں نہیں، اس کی منزل تو چرخِ نیلی فام سے پرے ہے:

تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بردار و سر گردوں فگن

خاتمہ کلام

اقبال کے نظریۂ خودی کا یہ ولولہ انگیز کلام ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ'' پر ختم ہوتا ہے۔ اس خاتمۂ کلام میں مفکر شاعر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک سوانحی اعتراف ہے، جس سے اس جذبے کا پتہ چلتا ہے جو اسرار و رموز خودی و بے خودی کی تصنیف کا محرک ہوا۔ اس اقرار نامے میں گرچہ خطاب بہ رسولؐ ہے، مگر گویا خدا کو حاضر و ناظر جان کر شاعر نے اپنے افکار میں پنہاں خلوص کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح قاری کو اعتماد میں لے کر یہ بتانے کی بلیغ کوشش کی گئی ہے کہ زمزمہ سنجی سے مقصود محض شاعری نہیں ہے۔ بلکہ ایک ملت اور اس کے ذریعے پوری انسانیت کے ذہن و ضمیر کو جھنجھوڑنا ہے۔ اپنے نصب العین کے سلسلے میں شاعر نے وضاحت کی ہے کہ اس کا منبع قرآن حکیم ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ عصرِ حاضر میں ملت اسلامیہ توحید سے بیگانہ اور اپنے قبلۂ نظر سے روگرداں ہو چکی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے جسم سے روح نکل چکی ہے۔ لہٰذا اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے اور اس کے وجود میں ایک نئی روح پھونکنے کے لیے فلسفی فنکار نے مسلمانوں کو ایک بار پھر قرآن کے نظریۂ توحید اور نظام مصطفیٰ کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیا ہے۔ توحید کے علم بردار عاشق رسول کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دور جدید میں امت مسلمہ کا اصل مرض ایک قسم کا شرک ہے اس لیے کہ اس نے اسلامی شریعت کے تجویز کردہ نظام حیات کو عملاً و عموماً ترک کر کے اپنے دماغ میں غیر اسلامی تصورات کا ایک بت خانہ سجا لیا ہے اور زندگی کے اجتماعی خودی مجروح ہو چکی ہے اور اس کے افراد میں شخصی خودی کا احساس بھی باقی نہیں رہا، وہ غیروں کی بندگی کر کے خود بھی رسوا ہو رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کی ذلت کا بھی سامان کر رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنی اس تباہ کن روش سے تائب ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور شریعت محمدی کو اپنا دستور العمل بنا لیں تا کہ آج کی دنیا میں وہ اپنے گم شدہ قائدانہ مقام کی بازیافت کے بعد عالم انسانیت کی رہنمائی حقیقی ترقی کی بلند تر منزلوں کی طرف کر سکیں۔ اسلام کی اسی نشاۃ ثانیہ میں امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کی نجات ہے:

مسلم از سر نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

شیخ ما از برہمن کافر تراست
زاں کہ اور اسومنات اندر سراست
نعشش از پیش طبیبان بردہ ام
در حضور مصطفیٰ آوردہ ام
مردہ بود از آبِ حیواں گفتمش
سرے از اسرارِ قرآں گفتمش
محفل از شمع نوا افروختیم
قوم را رمز حیات آموختم
عرض کن پیش خدائے عزو جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جانِ حزیں بخشندۂ
بہرۂ از علم دیں بخشندۂ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم گہر گرداں مرا

(ڈاکٹر عبدالمغنی— اقبال کا نظریہ خودی)

رموزِ بے خودی
(آغاز اور ترامیم و تحذیفات)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

آغاز

اسرارِ خودی کی تکمیل فروری ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور اس کی اشاعت ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو عمل میں آئی۔ اس زمانے سے، اقبال کو حصہ دوم لکھنے کا خیال تھا۔[۱] ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو منشی سراج الدین کو لکھتے ہیں کہ دوسرے حصے کے مضامین میرے ذہن میں ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ ہوگا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔[۲] اقبال سے منسوب عاشق حسین بٹالوی کا یہ قول کہ: ......اسرارِ خودی پر عبدالرحمٰن بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموزِ بے خودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے‘‘۔[۳] اس لیے غلط ہے کہ بجنوری نے صرف مثنوی اسرارِ خودی پر نہیں، بلکہ Iqbal - His Persian Masnavis کے زیر عنوان دونوں مثنویوں پر بحث کی تھی اور یہ مضمون رموزِ بے خودی کی اشاعت (۱۰ر اپریل ۱۹۱۸ء) کے تین ماہ بعد رسالہ *East and West* (جولائی ۱۹۱۸ء) میں شائع ہوا تھا۔[۴]

درحقیقت رموزِ بے خودی کوئی نیا منصوبہ نہ تھا، بلکہ اسرارِ خودی ہی کی توسیع تھی اور اسی کا تسلسلِ خیال، اسی لیے اوائل میں اقبال نے احباب کے نام خطوط میں جہاں بھی رموزِ بے خودی کا ذکر کیا، اسے اسرارِ خودی کا حصہ دوم قرار دیا۔ مگر چند ماہ بعد اس کا نام رموز بیخودی ہو گیا۔ ’’میں فارسی مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ اس کا نام رموزِ بے خودی ہوگا‘‘۔[۵]

رموزِ بے خودی کا آغاز ۱۹۱۵ء کے آخری ایام یا ۱۹۱۶ء کے ابتدائی دنوں میں ہوا۔ اکثر حصے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں لکھے گئے[۶] اور تکمیل نومبر ۱۹۱۷ء میں ہوئی (۱۳ اور ۲۷ر نومبر کے درمیان)۔ بعد ازاں قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سنسر کے محکمے کو دکھائی گئی۔ جو مسوّدہ سنسر کے لیے بھیجا گیا، وہ اقبال میوزیم،

لاہور میں محفوظ ہے اور اس کے ہر صفحے پر سنسر کرنے والے افسر کے مخفف دستخط (initials) موجود ہیں۔ آخری صفحے پر پورے دستخط مع تاریخ اس طرح درج ہیں:[۸]

AbdulAziz[۸]
25.12.17

بظاہر یہی لگتا ہے کہ محکمہ سنسر نے کوئی شعر نہیں کاٹا۔ البتہ بعض اشعار، معلوم ہوتا ہے، بعد میں خود اقبال نے قلمزد کر دیے۔ اگر سنسر والے کوئی شعر کاٹتے تو احباب کے نام خطوط میں، جہاں وہ مثنوی کی تحریر و تصنیف، تکمیل و اختتام اور کتابت و طباعت وغیرہ کے بارے میں تازہ ترین صورتِ حال کی اطلاع بہم پہنچاتے رہتے تھے، اشعار کے قلمزد ہو جانے کا ذکر بھی کرتے۔

مولانا گرامی نے بطور تقریظ چند اشعار لکھ بھیجے، مگر اقبال کے خیال[۹] میں یہ اشعار رموزِ بے خودی کی نسبت اسرارِ خودی کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ توقع تھی کہ گرامی رموزِ بے خودی کے لیے نئی تقریظ لکھیں گے اور اس کے لیے اقبال منتظر بھی رہے[۱۰] مگر گرامی بروقت تقریظ نہ لکھ سکے۔ اسی اثنا (دسمبر کے آخری ایام) میں مثنوی کتابت کے لیے دے دی گئی۔ تقریباً تین ماہ کتابت و طباعت کے مراحل میں گزر گئے، حتیٰ کہ اپریل ۱۹۱۸ء کے پہلے عشرے میں کتاب چھپ کر تیار ہوگئی۔[۱۱] اور اپریل کے وسط میں، احباب کو اُس کے نسخے روانہ کیے گئے۔

رموزِ بے خودی کی اوّلین اشاعت کا اہتمام بھی حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی نے کیا۔ سرورق اور آخری صفحے کی بیل کا ڈیزائن بھی وہی ہے، تاہم رموزِ بے خودی کی بیل سرخ رنگ میں طبع کی گئی ہے۔ سرورق پر مثنوی کا پورا نام اس طرح درج ہے:

"مثنوی رموزِ بے خودی یعنی اسرارِ حیات ملیہ اسلامیہ"[۱۲]

آخری صفحے پر، سرخ بیل کے اندر یہ عبارت موجود ہے:

اطلاع

بموجب ایکٹ ۱۹۱۴ء کاپی رائٹ مجریہ فروری ۱۹۱۴ء مثنوی ہٰذا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

(مصنف)

دیباچے کے چودہ سطری مسطر کے دو صفحات پر صفحہ نمبر کا شمار نہیں کیا گیا۔ اگلے چھے صفحات (پیش کش بحضور ملتِ اسلامیہ) کو الف ب ج د ہ و سے شمار کیا گیا ہے۔ مثنوی صفحہ نمبر ۱ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۱۳۹ پر ختم ہوتی ہے۔ بالکل آخری صفحہ خالی ہے۔ یہ علامہ اقبال کی پہلی کتاب ہے، جسے عبدالمجید [پرویں رقم] نے کتابت کیا۔ طبع اوّل میں کتابت اور املا کی متعدد اغلاط موجود ہیں جن کی تفصیل راقم کی کتاب تصانیف

اقبال (طبع ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۳-۱۲۴) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

رموزِ بے خودی کا ایک شعر اس طرح ہے:

اہلِ حق را رمزِ توحید ازبر است

در اتٰی الرَّحمٰنَ عَبداً مضمر است

مصرع ثانی میں عربی ترکیب، (طبع اوّل: ص۱۲) قرآن پاک (سورہ مریم: ۹۳) سے ماخوذ ہے، مگر اقبال نے یہ تصرّف کیا ہے کہ لفظ ''اتٰی'' لکھا ہے جو وزن پر پورا نہیں اُترتا۔ وزن میں ''اٰتِی'' آتا ہے۔ بہرحال ''اتٰی'' لکھیں یا ''اٰتِی'' دونوں صورتیں قرآن کے متن (اٰتِی) سے مختلف ہیں۔ اس طرح یہاں موجودہ لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا یہ شعر کی اہم خامی ہے۔ اقبال نے رموزِ بے خودی کے طبع دوم (اسرار و رموز یکجا، اوّل ۱۹۲۳ء) میں بہت سی ترامیم کیں، مگر تعجب ہے کہ اس اہم فروگذاشت پر انھیں تنبّہ نہیں ہوسکا، جس کے نتیجے میں ایک اہم غلطی باقی رہ گئی۔

رموزِ بے خودی کی اشاعت کے بعد، علامہ اقبال اس کا تیسرا حصہ بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔[۱۳] ایک بار اُنھوں نے اس کے آغاز کی خبر دیتے ہوئے بتایا کہ ''یہ ایک قسم کی نئی منطق الطیر ہوگی''[۱۴] اور اس کا نام اُنھوں نے ''حیاتِ مستقبلۂ اسلامیہ''[۱۵] تجویز کیا تھا، مگر یہ موعودہ مثنوی کبھی طبع ہو کر منصۂ شہود پر نہ آسکی، ممکن ہے اس کے کچھ اشعار لکھ کر تلف کر دیے گئے ہوں۔

رموزِ بے خودی کا دوسرا اڈیشن بطور اسرار و رموز (ہر دو یکجا) طبع اوّل شائع ہوا۔

اسرار و رموز (یکجا)

اسرار خودی کا دوسرا اڈیشن اور رموزِ بے خودی کا پہلا اڈیشن ختم ہونے پر دونوں مثنویوں کے نئے اڈیشنوں کی اشاعت کا مسئلہ درپیش ہوا، تو علامہ اقبال نے دونوں کی یکجا اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اس موقعے پر اُنھوں نے دونوں مثنویوں پر نظرِ ثانی کر کے بعض اشعار میں ترامیم کیں اور کئی اشعار کا اضافہ بھی کیا۔

اسرار و رموز (یکجا) کے طبع اوّل پر سالِ اشاعت درج نہیں، تاہم اس کی اشاعت کا سال ۱۹۲۳ء ہے۔[۱۶] یہ اسرارِ خودی کی اشاعت سوم اور رموزِ بے خودی کی اشاعت دوم ہے۔

سرورق کے صفحہ نمبر ۳ پر چند سطری مختصر دیباچہ ہے۔ یہ دیباچہ علامہ اقبال کے کسی نثری مجموعے میں شامل نہیں، اس لیے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

دیباچہ

اس اڈیشن میں ناظرین کی سہولت کے لیے دونوں مثنویاں یعنی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی یکجا

شائع کی جاتی ہیں۔ معمولی لفظی ترمیم کے علاوہ، مطالب کی مزید تشریح کے لیے بعض جگہ اشعار کا بھی اضافہ ہے، جن کی مجموعی تعداد سوا سو ہوگی۔ ایک دو جگہ نئے عنوان بھی قائم کیے گئے ہیں، مگر کتاب کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں۔

محمد اقبال

اسرار و رموز (یکجا) میں متعدد اشعار حذف کر دیے گئے، کئی حصوں میں ترمیم کی گئی اور بعض اشعار کا اضافہ بھی ہوا۔ تفصیل اس طرح ہے:

(ا) محذوفات:

رموزِ بے خودی:

۱- ص الف کا یہ شعر:

اے بہ عشق دیگراں دل باختہ   جلوہ ہائے خویش را نشناختہ (م)

۲- ص۲۴ کا یہ شعر:

جانم از مظلومیِ او می تپد[۱۷]   اشکِ خوں از دیدۂ دل می چکد (م)

۳- ص۹۷ کے تین اشعار:

سیلئے از دستِ مادر می خورد   خویشتن را باز در مادر تند

مزدِ روشستن زما در گیرد او   چوں گل از بادِ سحر زر گیرد او

چشم او ہر لحظہ بر اشیافتد   از لبش ہر دم سوالے می چکد (م)

۴- ص۱۱۴ کے حاشیے میں مندرج سعید ابن مسیّب کا ایک قول (یہ قول ص۱۲۴ پر نقل کیا جا چکا ہے)۔

۵- ص۱۸۶ کا یہ شعر:

تابباغت[۱۸] رنگِ خویش انداخت است
احمرت را غیر اصفر ساخت است

۶- آخری صفحے پر حقوقِ اشاعت سے متعلق ''اعلان'' (یہ عبارت گذشتہ صفحات میں نقل کی جا چکی ہے)۔

(ب) اضافات:

۱- دیباچہ (گذشتہ صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے)۔

۲- ص۹۲ (رموزِ بے خودی) پر مولانا روم کا یہ شعر:

جہد کن در...... (کلیات: ص۸۰)

۳- ص ۱۱۱ کا عنوان:

''محاورہ تیر و شمشیر......(کلیات: ص ۹۷)

۴- ص ۱۱۹-۱۲۰ پر ایک نئے عنوان:

''در معنیِ ایں کہ مقصود رسالتِ محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوتِ بنی نوعِ آدم است'' کے تحت ابتدائی سولہ اشعار......(کلیات: ص ۱۰۳-۱۰۴)

۵- اسرار و رموز: ص ۱۲۹ کا شعر نمبر ۴ (پیشِ پیغمبر......)، شعر نمبر ۵ (در ثنایش......)، ص ۱۳۰ کے گیارہ اشعار (از: آں مقامش......تا مسلم استی......) اور ص ۱۳۱ کے دو اشعار (می نگنجد......اور: دل بدست آور......) کل پندرہ اشعار (کلیات: ص ۱۱۲-۱۱۳)۔

۶- ص ۱۲۹، ۱۳۰ کے حواشی (کلیات: ص ۱۱۲-۱۱۳)

۷- ص ۱۳۳ کا عنوان:

''در معنی ایں کہ وطن اساسِ ملت نیست'' (کلیات: ص ۱۱۵)۔

۸- ۱۴۳-۱۴۴ پر ایک نئے عنوان:

''در معنیِ ایں کہ در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اَولیٰ تر است'' کے تحت شعر نمبر ۲ (بزمِ اقوام کہن......) تا شعر ۱۶ (اے پریشاں محفل......) کل پندرہ اشعار۔ (کلیات: ص ۱۲۴-۱۲۵)

۹- ص ۱۵۲ پر دو اشعار:

شعر نمبر ۵: مرشدِ رومی......

اور: شعر نمبر ۶: مگسل از ختم الرسل......(کلیات: ص ۱۳۱-۱۳۲)۔

۱۰- ص ۱۵۵ کا شعر نمبر ۲: (گر نظر داری......) اور نمبر ۶ (فکرِ خامِ تو......) تا نمبر ۱۲ (سازِ خوابیدہ......) ص ۱۵۶ کا شعر نمبر ۱ (دمبدم مشکل......) کل نو، اشعار (کلیات: ص ۱۳۴)

۱۱- ص ۱۶۷ کا آخری شعر: قطرۂ کز......(کلیات: ص ۱۴۴)

۱۲- ص ۱۶۸ کا شعر نمبر ۱: (چوں بدریا......)، نمبر ۲ (چوں صبا......) اور نمبر ۴ (حرف چوں طائر......) (کلیات: ص ۱۴۴)

۱۳- ص ۱۶۸ کا حاشیہ نمبر ۱ (کلیات: ص ۱۴۴)

۱۴- ص ۱۸۷ کے آخری دو اشعار:

(۱) چوں نظر در پردہ ہائے......

(۲) در جہاں مثلِ حباب......(کلیات: ص ۱۶۱)

۱۵- ص ۱۹۰ کے دو اشعار:

(۱) امتِ اومثلِ او......
(۲) نورِحق راکس......(کلیات: ص۱۶۳)

(ج) ترامیم

اسرار و رموز (یکجا) میں بعض اشعار و مصاریع کو ترمیم کے ذریعے، نئ صورت دی گئی۔ اس کی وضاحت گوشوارے سے ہوتی ہے جو راقم کی کتاب تصانیف اقبال، طبع ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۱-۱۳۴، میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(د) تقدیم وتاخیر

اسرار و رموز (یکجا) میں بعض مقامات پر ترتیب اشعار ومصاریع میں تقدیم وتاخیر کی گئی ہے۔

صفحہ	رموزِ بے خودی، اوّل	صفحہ	اسرار و رموز (یکجا)
ب	یہ شعر: اے نظر بر حسنِ تر...... ترتیب کے اعتبار سے اس باب کا چھٹا شعر ہے۔	۹۳	اس شعر کو باب کا تیسرا شعر بنادیا گیا ہے۔
۹	اس شعر کی یہ صورت ہے: گلستاں در دشت و در پیدا کند تازہ اندازِ نظر پیدا کند	۱۰۳	مصرعوں کو اُلٹ دیا گیا ہے: تازہ اندازِ نظر پیدا کند گلستاں در دشت و در پیدا کند
۶۳	اشعار کی ترتیب اس طرح تھی: (۱) فکر شاں ریسد...... (۲) عہدِ حاضر فتنہ......	۱۴۳	دوسرے شعر کو باب: ''در معنیِ ایں کہ در زمانۂ انحطاط'' کا اوّلیں شعر بنادیا گیا۔
۶۳-۶۴	اشعار کی ترتیب یہ تھی: (۱) اے کہ از اسرارِ دیں...... (۲) نقش بر دل......	۱۴۴	دوسرے شعر کو اس باب کا سترہواں شعر بنا دیا گیا۔
۷۸	اشعار کی ترتیب اس طرح تھی: (۱) گرچہ مثلِ بُو...... (۲) آتشِ او دم بخویش......	۱۵۵	دوسرے شعر کو باب ''در معنی ایں کہ حیاتِ ملیہ مرکز'' ......کا ساتواں شعر بنا دیا گیا۔

۱۲۰-۱۲۱ اشعار کی ترتیب اس طرح تھی: ۱۸۶ پہلے شعر کو اس بند کا چوتھا شعر بنا دیا گیا۔

(۱) از خزانش خاکِ تو......

(۲) علمِ غیر آموختی......

اسرار و رموز (یکجا) کے زیرِ نظر پہلے اڈیشن میں اسرارِ خودی (طبع دوم) اور رموزِ بے خودی (طبع اوّل) کی متعدد اغلاط درست کر دی گئی ہیں۔ بعض رہ گئیں اور بعض نئی اغلاط رو پذیر ہو گئیں۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: راقم کی کتاب تصانیف اقبال (طبع ۲۰۱۱ء) ص ۱۳۱-۱۴۱

اسرار و رموز کا دوسرا اڈیشن (اسرارِ خودی، طبع چہارم اور رموزِ بے خودی، طبع سوم) نسبتاً بڑی تقطیع پر شائع ہوا۔ سرورق پر نمبر لگانے والی مشین سے سالِ اشاعت 1928 درج کیا گیا ہے۔ مختلف کتب خانوں میں اس ایڈیشن کے جو نسخے، راقم الحروف کی نظر سے گزرے، ان سب پر اسی طرح نمبر لگانے والی مشین سے سال اشاعت درج ہے۔ غالباً طباعت کے وقت سال اشاعت نہ لکھا جا سکا، اس لیے بعد میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔

بالعموم، شعری مجموعوں کی کتابت، عبدالمجید پرویں رقم کیا کرتے تھے، مگر اس اڈیشن کی کتابت ''محمد حسن خوشنویس چوک متی لاہور'' نے کی ہے۔ اسی زمانے میں مطبوعہ زبورِ عجم (۱۹۲۷ء) کی کتابت بھی ایک اور خوش نویس (محمد صدیق) نے کی۔ کسی غیر معمولی سبب سے، کتابت پرویں رقم کے بجائے محمد حسن اور محمد صدیق سے کرائی گئی۔ ممکن ہے ان ایام میں منشی عبدالمجید، لاہور میں موجود نہ ہوں۔ اسرار و رموز کے اس اڈیشن کی تقطیع (۱۹×۱۴ س م) سابق اڈیشن سے قدرے بڑی ہے مگر بارہ سطری مسطر برقرار رکھا گیا ہے۔ مختلف ابواب کے آغاز و اختتام اور اشعار و حواشی کی ترتیب وغیرہ میں سابقہ اڈیشن کا اتباع کیا گیا ہے۔ سرورق کی عبارت حسبِ سابق ہے، مگر سرورق کے اندر، سرورق کے صفحہ نمبر ۲ سے دیباچہ حذف کر دیا گیا ہے اور اس جگہ بارِ اشاعت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

اسرارِ خودی: اشاعتِ چہارم

رموزِ بے خودی: اشاعتِ سوم

۱۹۲۸ء کے اس اڈیشن میں طبع اوّل (یکجا، ۱۹۲۳ء) کے بعض اغلاط کی اصلاح ہو گئی، مگر بعض رہ گئیں اور چند نئی اغلاط رو پذیر ہو گئیں (تفصیل کے لیے دیکھیے: راقم کی کتاب تصانیف اقبال (طبع ۲۰۱۱ء) صفحات ۱۴۲-۱۴۴

متذکرہ بالا اڈیشن، علامہ اقبال کی زندگی میں اشاعت پذیر ہونے والا، اسرار و رموز کا آخری اڈیشن تھا۔ اگلا اڈیشن بارہ برس کے وقفے سے ۱۹۴۰ء میں چھپا۔ یہ اسرار و رموز (یکجا) کا تیسرا اڈیشن تھا۔ پہلے اور دوسرے اڈیشن میں سرورق کی پیشانی پر تسمیہ کے علامتی یا ابجدی اعداد ''۷۸۶'' درج کیے گئے

تھے، اس اڈیشن میں، انھیں غالباً نادانستہ طور پر، ترک کر دیا گیا۔ اقبال کی وفات کے بعد، شائع ہونے والے اس پہلے اڈیشن پر حقوقِ اشاعت سے متعلق یہ جملہ پہلی بار درج کیا گیا: ''جملہ حقوق مع حق ترجمہ بحق جاوید اقبال خلف الصدق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمتہ محفوظ ہیں''۔ قلم قدرے جلی ہے تاہم ابواب کے آغاز و اختتام پر، اشعار و حواشی کی ترتیب وغیرہ میں سابقہ اڈیشن (۱۹۲۸ء) ہی پیش نظر رہا ہے۔

یہ اغلاط، تعداد میں، سابقہ اشاعتوں کے مقابلے میں خاصی کم ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خوش نویس اور نگرانِ اشاعت نے نسبتاً زیادہ تردد اور احتیاط سے کام لیا۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد شائع ہونے والا یہ پہلا ایڈیشن تھا۔ جو ۱۹۷۱ء تک جو کئی بار (۱۹۴۸ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۶ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۱ء) شائع ہوا۔

۱۹۷۲ء میں، تمام شعری مجموعوں کی کتابت از سرِ نو کرائی گئی، چنانچہ اسرار و رموز کے بعد کے اڈیشن (۱۹۷۶ء و مابعد) اسی نئی کتابت (از محمود اللہ صدیقی) سے طبع کیے گئے ہیں۔

یہ ہے رموز بیخودی کی اشاعت کی ایک سو سال کی مختصر کہانی۔

❁...❁...❁

حوالہ جات و حواشی

۱- صحیفہ، اقبال نمبر، اوّل، ۱۹۷۳ء: ص ۱۵۳

۲- اقبال نامہ، اوّل: ص ۲۳۔

۳- چند یادیں، چند تأثرات: ص ۴۷

۴- بجنوری کے مضمون کا متن ملاحظہ کیجیے: *Tributes to Iqbal*، مرتب: محمد حنیف شاہد (ص ۱۴۷ - ۱۵۵)۔ اس ضمن میں ایک بیان جابر علی سیّد کا ہے جو محلِ نظر ہے۔ (اقبال - ایک مطالعہ: ص ۱۰۴)

۵- ملاحظہ کیجیے:

(الف) شاد اقبال: ص ۳ اور ۴۸

(ب)اقبال نامہ،اوّل:ص۲۳اور۷۹

(ج)اقبال نامہ،دوم:ص۵۳

(د)صحیفہ،اقبال نمبر،اوّل۱۹۷۳ء:ص۱۵۳

۶- جن دنوں میں اقبال رموزِ بے خودی لکھ رہے تھے، خط کتابت کے ذریعے مولانا گرامی سے برابر مشورہ لیتے رہے۔ ملاحظہ کیجیے: مکاتیبِ اقبال بنام گرامی: صفحات ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۱ اور ۱۳۳۔

۷- ملاحظہ کیجیے: مسوّدہ رموزِ بے خودی: نمبر A/M 1977-199 مخزونہ اقبال میوزیم لاہور۔

۸- عبدالعزیز، پریس برانچ میں officer -in-charge تھے۔ بعدازاں انجمن حمایت اسلام کے آنریری سیکرٹری رہے۔مزید دیکھیں حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں:ص۱۵۶

۹- مکاتیبِ اقبال بنام گرامی:ص۱۳۶

۱۰- مکاتیبِ اقبال بنام نیاز:ص۱۱

۱۱- کتاب چھپ کر تیار ہے۔(شاد اقبال:ص۸۲)

۱۲- رموزِ بے خودی طبع اوّل کے سرورق کا عکس Iqbal in Pictures میں شامل ہے۔

۱۳- اقبال نامہ،دوم:ص۷۵

۱۴- مکاتیبِ اقبال بنام گرامی:ص۱۲۴

۱۵- شاد اقبال:ص۷۹

۱۶- اس دور کی بعض کتابوں کے کوائف اس طرح ہیں:

کتاب		پرنٹ لائن
پیامِ مشرق	طبع اوّل ۱۹۲۳ء	در مطبع کریمی واقع لاہور باہتمام میر امیر بخش طبع گردید
اسرار و رموز، یکجا		ایضاً
بانگِ درا	طبع اوّل ۱۹۲۴ء	کریمی پریس لاہور نزد کوتوالی قدیم باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپی۔
پیامِ مشرق	طبع دوم ۱۹۲۴ء	میر امیر بخش صاحب مرحوم کے کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپی

پیامِ مشرق،طبع اوّل اور اسرار و رموز یکجا کی پرنٹ لائن ایک ہی ہے۔ پیامِ مشرق طبع اوّل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی،اس اعتبار سے قرینِ قیاس ہے کہ اسرار و رموز بھی اسی سال ۱۹۲۳ء میں چھپی ہوگی، کیونکہ اگر یہ اگلے برس (۱۹۲۴ء) میں چھپتی تو اس کی پرنٹ لائن بھی بانگِ درا طبع اوّل اور پیامِ مشرق طبع دوم کی پرنٹ لائن کے مطابق ہوتی۔ غالباً میر امیر بخش ۱۹۲۳ء کے آخر میں (پیامِ مشرق اوّل اور اسرار و رموز، یکجا کی اشاعت کے بعد) فوت ہوگئے۔ اس لیے ۱۹۲۴ء میں شائع ہونے والی دونوں کتابوں کی پرنٹ لائن میں تبدیلی کر دی گئی۔ (میر امیر بخش معروف ادیب اور محقق مشفق خواجہ (م:۲۰۰۵ء) کے نانا تھے اور میر قدرت اللہ ان کے ماموں۔ ایک بار خواجہ صاحب نے راقم کو بتایا کہ میر قدرت اللہ کچھ عرصہ کریمی پریس کو چلاتے رہے، پھر انھوں نے پریس عنایت اللہ صاحب کو فروخت کر دیا تھا۔ اُنھوں نے کچھ عرصے بعد پریس کا ساز و سامان بیچ دیا،اس طرح کریمی پریس ختم

ہوگیا۔)

۱۷- اس شعر کے بارے میں مولانا مہر کی یہ وضاحت: ''ایک مقام پر یہ شعر لکھا تھا، پھر قلم زد کردیا'' (سرودِ رفتہ: ص۲۵۶) مبہم ہے۔ اُنھوں نے اس شعر کو ''ترمیم شدہ شکل'' کے زیرعنوان درج کیا ہے، مگر یہ نہیں واضح کیا کہ اس کی ابتدائی صورت کیا تھی۔ حقیقت میں یہ شعر طبع اوّل میں موجود تھا، مگر اسرار و رموز (یکجا) میں اسے حذف کردیا گیا۔

۱۸- مولانا مہر نے ''بباغش'' لکھا ہے (سرودِ رفتہ: ص۲۵۸) مگر طبع اوّل میں ''بباغت'' ہے (اوّل: ص۱۲۰)۔

❁......❁......❁

رموز بیخودی — مدعائے بیان

ڈاکٹر خضر یٰسین

اسرار و رموز دونوں باہم مربوط مثنویاں ہیں، اسرار خودی میں علامہ اقبال نے ''فرد'' کے مخفی قویٰ کی نشاندہی کی ہے اور رموز بیخودی میں فرد کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ملت کی ہستی دراصل فرد کے انفرادی قویٰ کے نشو ونما کے لیے ضروری ہے۔ رموز بیخودی میں اقبال بظاہر ملت سے مخاطب ہیں اور فرد سے مخاطب نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت فرد سے مخاطب ہیں۔ فرد کی بقا اور احیاء ملت کی صورت میں ہے۔ اسرار خودی کے عنوانات رموز بیخودی کے عنوانات سے مختلف ہیں مگر مضمون دونوں میں ایک ہے۔ دونوں مثنویوں میں علامہ اقبال شعر و شاعری کے فنی کمالات پوری طرح کام میں لاتے ہیں۔ فکری جہت کو شاعری پر غالب رکھنے کی اپنی تمنا بھی اقبال شعر میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں؛

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست
حسن انداز بیان از من مجو
خوانسار و اصفہان از من مجو
خوردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند
دل بذوق خردہ مینا بہ بند[1]

شعر اور شاعری سے یہ بیزاری اقبال میں کیوں پیدا ہوئی تھی، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے شعر نے انہیں عزت و شہرت دی ہے؟ اقبال اپنے فکر کی عظمت کے جتنے قائل ہیں اپنے شعر کی ویسی عظمت کے قائل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ شعر کو وسیلہ بنانا چاہتے تھے اور بس وسیلہ ہی رکھنا چاہتے تھے، اسے مقصد کے درجہ تک ترفع دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ فن برائے فن ہو تو شعر مقصود بالذات ہوتا ہے اور فن برائے فن نہ ہو تو شعر کا مقصد شعر سے باہر تلاش کرنا پڑے گا۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ ان کے شعر کو مقصود بالذات نہ بنایا

جائے، شعر میں جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں اسے غایت بنا کر شعر سے حاصل ہونے والی انفعالی لذت سے دور رہا جائے۔ اسرار و رموز کا مطالعہ ایک پہلوفنی ہے جس میں اقبال کے شعر و شاعری کے اوصاف و اطراف دیکھے گئے ہیں دوسرا پہلو وہ ہے جس میں اس غایت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے لیے اقبال نے فن شعر کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم یہاں اسی دوسرے پہلو سے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

فارسی کے بڑے شعراء نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے خاص طور پر مثنوی فارسی زبان و بیان کے لیے دیگر اصناف سخن کی نسبت زیادہ مقبول اور زیادہ موزوں صنف رہی ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنے مدعا کا بیان زیادہ سہولت کے ساتھ اور زیادہ سے زیادہ اشعار میں پیش کر سکتا ہے۔ حکمت و دانائی کی باتیں، قصہ کہانیاں، سماجی اور سیاسی واقعات، عشق و محبت کی داستانیں، ذاتی مشاہدات و تجربات غرض ہر طرح کی بات مثنوی میں بیان کی جا سکتی ہے۔ شاعر اپنی بات بعض اوقات بالکل فطری انداز میں کہہ دیتا ہے اور بعض اوقات سادہ اور کبھی پیچیدہ استعاراتی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ سب کچھ مثنوی میں بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔ اقبال نے خودی کے اپنے تصور مثنوی اسرار و رموز میں پیش کیے ہیں۔ دراصل یہ فارسی اساتذہ کی روایت کا تتبع تھا۔ اقبال سے قبل ہندوستان میں فارسی زبان کا بڑا شاعر غالب ہے، جس کے فارسی دیوان میں قصائد کے علاوہ طویل مثنویاں اور غزلیات ہیں۔ شعر حکمت جسے اقبال نے اپنے خطبات میں اعلیٰ شاعری (higher poetry) کہا ہے[۲]، فارسی کے بڑے شعراء کا طرہ امتیاز ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ایک متعین موضوع پر توجہ مرتکز رکھی اور مذکورہ توام مثنویوں میں اس موضوع کے متعلق اپنے افکار یکجا کر دیے ہیں۔ اقبال سے قبل طویل مثنویوں کے موضوعات اس طرح کے نہیں رہے جو بیک وقت خارج میں واقعیت رکھتے ہوں اور اپنی اصل کے اعتبار سے بسیط بھی ہوں۔ غالب نے اپنی ایک مثنوی کا آغاز رومی کے شعر سے کیا ہے[۳]۔ اقبال اپنی مثنوی کا آغاز رومی اور نظیری کے اشعار سے کرتے ہیں۔

اسرار خودی اجتماعیت کے ایسے جبر کی نفی ہے جس میں فرد کے ارادی اور غائی مقاصد پامال ہو جاتے ہیں اور رموز بیخودی میں ایسی انفرادیت کی نفی جس سے فرد میں اجتماع گریز رجحانات نشو ونما پاتے ہیں اور وہ اپنے لیے اور معاشرے کے لیے یا تو غیر مفید ہو جاتا ہے یا ضرر رساں بن جاتا ہے۔ یہ بہت مشکل راہ تھی جس پر اقبال نے اپنے فکر کو مرتکز رکھنا تھا، اس کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ فرد کی فردیت زائل نہ ہو اور سماج کی اجتماعیت پامال نہ ہو۔ گویا: بر کف جام شریعت بر کف سندان عشق، والی کیفیت تھی جسے اقبال کو اسرار و رموز میں مسلسل برقرار رکھنا تھا۔ اقبال سماج کو غیر معمولی حد تک پیچیدگی کا شکار اکائی دیکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ انہیں یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ سماج کو امت یا ملت کی صورت میں دیکھیں اور ایک وقت میں فرد اور معاشرے کی حرکیات کا دقیق جائزہ لینے کے بجائے سادہ شکل میں اجتماع فرض

کریں۔ ملت اسلامیہ تاریخ کے جس عمل اور ردعمل کا شکار ہو کر انتشار اور مرکزیت سے محروم ہو چکی ہے، اسے ایک نکتہ پر لے جائیں۔ اس اجتماعیت کے لیے اقبال نے فن کو فکر اور فکر کو فن (Art & Thought) بنا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے فکر کی نمائندہ ہے اور ان کا فکر ان کی شاعری کا نمائندہ ہے۔

اسرار خودی میں اقبال فرد سے مخاطب ہیں اور وہ فرد جس سے مخاطب ہیں کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی ذات ہے۔ اسرار خودی میں تمہید سے قبل رومی کے چند اشعار درج ہیں، جس میں شیخ بتاتا ہے کہ انسان کی جستجو میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ تمہید میں اس انسان کی صفات بیان کی جاتی ہیں جس کی تلاش شیخ کی جستجو کا محرک ہے۔ نظیری کے شعر سے تمہید کا آغاز کرتے ہیں اور پھر ان تمام پوشیدہ قوتوں کو بیان کرتے ہیں جو فرد کی ذات میں بالقوۃ موجود ہیں۔ بعض اوقات شاعر انسان کی پوشیدہ قوتوں کو بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیتا ہے، اقبال کے بیان میں شاعرانہ تعلّی ہے مگر کہیں بھی یہ تعلّی غیر فطری غرور بنتی نظر نہیں آتی۔ تعلّی مبالغہ آمیز بیان ہوتی ہے، شاعر کو حق حاصل ہے کہ وہ ایسا کرے لیکن اگر مبالغہ غیر معمولی تجاوز پر مبنی ہو تو فطری نہیں رہتا۔ اقبال نے انسان کی قوتوں کو بیان کرنے میں مبالغہ کیا ہے مگر یہ مبالغہ شعر کی شعریت میں صرف ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسرار خودی کی تمہید میں ایک شعر ہے؛

فکرم آں آہو سرِ فتراک بست
کو ہنوز از نیستی بیروں نجست
در نمی گنجد بجو عمان من
بحر ہا باید پے طوفان من
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت[۴]

شاعرانہ تعلّی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ شاعر شاعری سے بیزاری کا اظہار کر دیتا ہے اور خود کو شاعر کہنے اور کہلوانے کو ناپسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر خود کو شاعر کہلوانا پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے مدعا کو اس درجے کی شے باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کا پیغام شاعری کے اس مقام سے بہت بلند رہے شاعری جس کی مستحق ہے۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی، بت گری مقصود نیست

حسن انداز بیان از من مجو
خوانسار و اصفہاں از من مجو[۵]

اسرار خودی کے مختلف عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کن کن مسائل کو موضوع بناتا ہے اوران کا حل بتانے کی فکر میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قادرالکلام اور بھرپور شاعر کی خوبی یہ نہیں ہے کہ وہ کن مسائل کو شعر کا رنگ دیتا ہے یا ان مسائل کا کیا حل بتاتا ہے۔ اقبال نے اسرار و رموز میں جن مسائل کو موضوع بنایا ہے وہ نہ تو عامیانہ ہیں اور نہ ہی پیش پا افتادہ ہیں۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کا موضوع بھی عالمی (universal) نوعیت کا ہے اور شعریت بھی انتہائی کمال کی ہے۔ شاعر کی ''قوت خیال'' (imagening power) حساس اور بلند پرواز نہ ہو تو شعر لاکھ وزن میں ہو، شعریت سے عاری ہوتا ہے۔ شعر جب تک ذہن کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے شعور کے دیگر وظائف اس وقت تک معطل رہتے ہیں یا پھر اسی جانب گامزن رہتے ہیں جس طرف شعر انہیں لے جانا چاہتا ہے۔ ذہن پر شعر کی گرفت بہت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، جلد یا بہ دیر شعور اپنی حالت میں واپس آ جاتا ہے۔ ذہن کی قوت حافظہ اس گرفت کو محفوظ نہیں رکھ سکتی البتہ اس گرفت کے کیف کو حافظے میں ایک مجسمہ بنا دیتی ہے۔ وہ شعر پھر کبھی سامنے آئے، یا اس کی یاد کسی حوالے سے شعور کے مطلع ادراک پر نمودار ہو تو حافظہ میں محفوظ کیف کے مجسمے سے آہستہ آہستہ پردہ ہٹنے لگتا ہے۔

اعلیٰ شاعری فقط فلسفیانہ مسائل کا شاعرانہ حل پیش نہیں کرتی بلکہ اعلیٰ شاعری ذہن کو کچھ قوت کے لیے کیف و سرور کے اس درجے پر لے جاتی ہے جہاں شعور انسانی ہمہ تن یک سو ہو جاتا ہے اور اپنے دوسرے وظائف سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ بڑا شاعر جب پوری کائنات پر کوئی حکم لگاتا ہے، اپنے بارے میں کوئی دعویٰ کرتا ہے یا خدا سے ہم کلام ہوتا ہے تو سننے والا اس کے بیان کے سحر میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ کائنات پر حکم لگانا ممکن نہیں ہے، یہ دعویٰ حد سے زیادہ مبالغہ آمیز ہے یا خدا پاک سے ہم کلام ہونا ممکن نہیں ہے۔ اقبال انسان کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا ہے، کائنات کے متعلق جو بتانا چاہتا ہے اور ذات خداوند کے بارے میں جو موقف رکھتا ہے وہ ان کے شعر میں بالکل درست ہے۔ اگر کوئی دانش ور شعر اقبال سے کوئی تصور لیتا ہے اور اسے فلسفہ وجود بنانے پر اصرار کرتا ہے تو وہ دو گونہ مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ شعریت سے باہر وہ بیان اپنے درست ہونے کے جن معیارات کا محتاج ہے اسے فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ شعریت انسان، کائنات اور خدا کے متعلق شاعر کے غیر معمولی مبالغے کو دبا دیتی ہے اور شعور جمال کی تسکین کسی حد تک شعور کو قانع رہنے اور ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن جب کوئی دانش ور شعریت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان تصورات کو مستقل صداقت (independent truth) کا

درجہ دینے کوشش کرتا ہے تو وہ خود کو یا دوسروں کو شعور کے معمول سے محروم کرنے کا وظیفہ انجام دے رہا ہوتا ہے، یہ وہ مشکل ہے جس سے شعر حکمت کے تعلق میں بالعموم واسطہ پڑتا ہے۔

شعر اقبال کا نقاد اگر اس صورت حال کو پیش نظر نہیں رکھتا تو نہ اقبال کے فن کی انتقادی تحسین کر سکتا ہے اور نہ اقبال کی شاعرانہ حکمت کو داد دے سکتا ہے۔ زبان و بیان اور انداز بیان وقت کے ساتھ متغیر ہوتا رہتا ہے، انسان کا ذوق لطیف وقت کے ساتھ ترقی کرتا ہے۔ آج اگر فارسی زبان و بیان کی جگہ کسی دوسری زبان نے لے لی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شعر اقبال سے مطالب اور اقبال کے افکار سے ان کے شعر کو الگ کر دیں۔ آج اگر کسی کو اقبال کے اشعار کی تفہیم میں فارسی دانی کی کمی حائل نظر آتی ہے تو یہ نئی بات نہیں ہے۔ اقبال کی اپنی زندگی میں بھی فارسی دانی بہت زیادہ عروج پر نہیں تھی۔

اقبال جب فرد کو مخاطب کرتا ہے تو ظاہر ہے یہ فرد ملت اسلامیہ کا وہ ''فرد'' ہے جو تعلیم یافتہ اور ملت کے ماضی اور حال سے باخبر ہے نیز ملت کا یہ فرد مستقبل میں کچھ کر گزرنے کا آرزو مند بھی ہے۔ شعر اقبال کی تفہیم کے لیے کم از کم تعلیمی استعداد فقط زبان دانی نہیں ہے بلکہ ملت اسلامیہ کے شاندار ماضی اور اندوہ ناک حال سے پوری طرح آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اقبال جب خودی کے اسرار اور بے خودی کے رموز کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو ان کے شعر میں ایک کاٹ ہوتی ہے۔ جو ایک طرف فرد کی سلبی انفرادیت (negative individuality) کی نفی ہے اور دوسری طرف اجتماع کے غیر ضروری جبر پر چوٹ ہے۔ اسرار خودی کے مضامین فرد کے ایک پوشیدہ اوصاف کا بیان ہے اور رموز بیخودی ملت کے ساتھ وابستہ فرد کے تعلقات اور حرکیات کا بیان ہے۔ اسرار خودی میں نظام عالم کی اصل خودی بتاتے ہیں نیز ''تعینات وجود'' اور ''تسلسل حیات'' کا انحصار خودی کے استحکام سے مشروط کرتے ہیں[۶]۔ تعینات وجود، تسلسل حیات اور استحکام خودی ان تینوں تصورات کا فلسفیانہ پیش منظر اور پس منظر اور ہے۔ اگر شاعرانہ اظہار و ابلاغ کی حیثیت کو مستقل مقام و منصب نہ دیا جائے تو ''تعینات وجود'' خودی کے استحکام کی اور خودی کا استحکام تسلسل حیات کی نفی بن سکتا ہے۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمد بر فروخت

اس شعر کا مقصد شعر کے ظاہری معنی سے بہت دور ہے۔ ظاہری معنی پر اصرار شعر کی مقصدیت کو فنا کر دیگا اور اس ظاہری بیان سے اعراض شعر کی شعریت فنا کر دیگا۔ تعینات وجود کے تناظر میں دیکھا جائے تو شعر میں کہا جا رہا ہے کہ ابراہیمؑ ان اولین وجودی تعینات کا استعارہ ہے جو تسلسل حیات میں محض اس لیے فنا ہوتے ہیں کہ وجود محمدؐ کا ظہور ہو سکے۔ ایک دوسرے شعر میں اس مفہوم کو غیر معمولی شعریت میں بیان

کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خیزد، انگیزد، پرد، تابد، رمد
سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد[۷]

علامہ اقبال انفرادی خودی کا نمونہ کمال اقبال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاتے ہیں۔ انسان میں جس قدر روحانی وجسمانی قوائے حیات مضمر ہیں وہ بتمام وکمال آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات میں حقیقت بن کر آشکار ہو چکے ہیں۔ اسرار خودی میں عشق کو ''استحکام خودی'' کا وسیلہ بتایا ہے، مقصد کے ساتھ وفاداری کا نام عشق ہے۔ ملت اسلامیہ کے فرد کی خودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔ محتاجی اور دریوزہ گری ایک ایسا عمل ہے جس سے خودی ضعف کا شکار ہوتی ہے۔ اقبال اسرار خودی میں کہتے ہیں کہ خودی جب عشق سے مستحکم ہوتی ہے تو نظام کائنات پر حاکم بن جاتی ہے۔ خودی کے استحکام کی نفی ان کے نزدیک دراصل غالب اقوام کا ایک حربہ ہے، جس سے مغلوب اور محکوم اقوام کو تادیر محکوم بنائے رکھنا مقصود ہے۔ اسلام کی تاریخ میں تصوف تحریک کی شکل میں ابھرا ہے، اس کا نصب العین بہت اعلیٰ اور ارفع تھا مگر آگے چل خودی کی نفی کے رجحانات اس میں درآئے ہیں۔ اقبال خودی کی نفی کے رجحانات اوران کے اسباب ومحرکات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: افلاطون کے نظریات عالم اسلام میں اس نوع کے خیالات کا سبب ہیں۔ افلاطون کے خیالات سے احتراز ضروری ہے، اسی ضمن میں وہ حافظ شیراز کے شعر اوران سے پیدا ہونے والے نظریہ شعر پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اقبال جس شاعر اور شعر کو پسند کرتے ہیں اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں[۸]۔ شعر وادبیات کی اصلاح میں معاون وممد شعر و ادبیات ان کے نزدیک معیاری فن ہے۔

خودی کے استحکام کی حکمت عملی میں اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی بتاتے ہیں۔ فرد کی ہستی پر مزید توجہ کرتے ہیں تو اپنی بیان کردہ حکمت عملی کا عملی نمونہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ہستی بتاتے ہیں اوران تینوں مراحل کوان کی ذات میں حقیقت بنتے ہوئے دیکھاتے ہیں۔ اسرار خودی کی ۱۷ویں نظم سے اقبال رموز بیخودی کے لیے تمہید بنانا شروع کرتے ہیں۔ ملت کی حیات وروایات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے جوع الارض نہیں ہے۔ اسرار خودی میں فرد سے اقبال کی توجہ ملت یا اجتماع کی طرف منتقل ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کے لیے بابائے صحرائی کی نصیحت بیان کرتے ہیں۔ اسرار خودی میں زمان پر توجہ کرتے ہیں تاکہ فرد اور ملت کی زندگی میں وقت کی اہمیت کا شعور اجاگر ہو۔ اسرار خودی کا اختتام ایک دعا پر ہوتا ہے۔

اسرار خودی کے عناوین ومضامین میں ایک داستان کا سا ربط نہیں ہے، ایک عنوان پر بحث مکمل

کرنے کے بعد دوسرے عنوان پر بحث و دلائل اور ایک لطیف پیرایے میں نکتہ سنجی کی جاتی ہے۔ بظاہر عناوین میں تعلیمی ربط و تعلق نظر نہیں آتا مگر تھوڑا تامل کرنے سے پتا چل جاتا ہے کہ ایک عنوان کے ساتھ آنے والا دوسرا عنوان پہلے سے متعلق اور مربوط ہے۔ اگرچہ اسرار خودی میں فرد اور اس کی پوشیدہ قوتوں کو بیان کرنے پر توجہ مرتکز کی گئی ہے تاہم اسرار کے آخر تک جاتے جاتے رموز بیخودی کے دروازے کھلتے معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کی زیادہ توجہ ''فرد'' کی انفرادی ہستی اور اس کی بالقوۃ فطرت کو شعر میں بیان کرنے پر مرتکز رہی ہے۔ وہ اگر ملت کی وجہ سے فرد کی بیخودی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو فرد کی ہستی اور خودی کو محو نہیں کرنا چاہتے۔ بیخودی کے تصور کی روایتی تفہیم میں خودی کی نفی ہے، خودی سے اقبال کی مراد فرد کی ہستی کا فنا ہرگز نہیں ہے بلکہ ملت کے وسیع تناظر میں اپنی ہستی کو اس طرح قائم رکھنا ہے کہ اس کے نتیجے میں ملت کا وجود منور ہو جائے۔ اقبال فرد کی بیخودی نہیں چاہتے ہیں اور نہ انفرادی خودی کی نفی کے قائل ہیں۔ خودی کی روایتی تفہیم میں ''خودی'' تکبر و عناد اور بغض و کینہ سے عبارت ہے اور بے خودی انہی اخلاقی رذائل کو ترک کر دینے سے عبارت ہے۔ اقبال خودی اور بیخودی کی روایتی تفہیم کی نفی نہیں کرتے اور نہ روایتی معنی کو نظرانداز کرتے ہیں، وہ روایتی بیان کو الٹ دیتے ہیں۔ اب اقبال کے نزدیک خودی انسان کے اوصاف حمیدہ کا مظہر ہے، اپنی ذات کا وہ شعور ہے جو اپنی نسبت غلط تصور کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ رومی کے ایک شعر سے رموز بیخودی کا آغاز کرتے ہیں:

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب[9]

پیش کش بحضور ملت اسلامیہ مثنوی رموز بیخودی کا پہلا عنوان ہے اور اس کا آغاز عرفی کے ایک شعر سے کیا گیا ہے:

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ نیست اگر با دگرے ہست[10]

''پیش کش'' کا محتاط مطالعہ اقبال کے اس منصوبے (رموز بیخودی) کے خد و خال واضح کر دیتا ہے۔ یہاں وہ ملت کی ہستی اور اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو غیر معمولی فطانت و ذکاوت کے شعر کا روپ دیتے ہیں۔ قاری ''پیش کش'' کے انداز بیان اور مضامین کی گیرائی اور گہرائی میں اس طرح منہمک ہو جاتا ہے کہ یہ احساس نہیں رہتا کہ وہ شعر پڑھ رہا ہے۔ یوں احساس ہوتا ہے جیسے ایک حقیقت ہے جو اس کے ارد گرد اس طرح موجود ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

رموز بیخودی کا بنیادی تصور ملت اور فرد کا باہمی ربط ہے۔ رموز بیخودی میں ہمیں فن از

حد پر کشش اور منطقی نظر آتا ہے اور فن کا یہی کمال ہمارے فلسفیانہ شعور کو اس منطقی تجرید کو یہ مہلت نہیں دیتا جس سے شعر میں پیش کردہ تصور کا ہم فلسفیانہ تجزیہ کر سکیں یا منطقی تحلیل سے اس تصور کی قدر و قیمت کا فیصلہ کر پائیں۔ مندرجہ ذیل شعر دیکھیے، اظہار کے حسن نے شعور علمی کو قید کر لیا ہے۔ لہٰذا ہم اس کے معنی کی طرف مدہوشی میں بھی نہیں دیکھ پاتے ہیں؛

نقش گیر اندر دلش ''او'' می شود
من ز ہم می ریزد ''تو'' می شود
ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
نازہا سازد بہم خیزد نیاز[۱۱]

رموز بیخودی میں ایک عنوان ''۔۔۔ملت از اختلاط افراد پیدا می شود و تکمیل تربیت او از نبوت است'' ہے۔ اس عنوان کے ماتحت تمام اشعار مندرجہ عنوان کی وضاحت ہیں اور ان تمام اشعار میں ایک شعر بھی منطقی تحلیل کا متحمل نہیں ہے، اس لیے کہ منطقی تحلیل و تجزیہ ہر جز کو الگ کرنے پر قانع نہیں ہوتا، وہ اس جز کے جواز کی ایسی دلیل کا طالب ہوتا ہے جس میں باہمی تضاد و تناقض نہ آتا ہو۔ نظری منطق اور مذہبی منطق کے مسلمات ایک نہیں ہیں اور نہ مسلمات کے باہمی ربط کی نوعیت ایک ہوتی ہے۔ مذہبی منطق میں نبی کی بعثت اور ایک صاحب دل کی نہضت ایک شے نہیں ہے۔ شعر اقبال کی انتقادی تحسین میں مذہبی اور نظری منطق کے فرق کا مسئلہ کبھی زیر بحث نہیں آسکتا:

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازہء
خاک را بخشد حیات تازہء
نقش پایش خاک را بینا کند
ذرہ را چشمک زن سینا کند
نکتہ توحید باز آزمودش
رسم و آئین نیاز آزمودش[۱۲]

ملت کی خارجی تشکیل کے لیے محسوسات میں دو بنیادیں درکار ہوتی ہے ایک ''تہذیبی ثقافت'' جس کے ذریعے سے افراد ملت میں کردار کی یکسانی نظر آئے اور دوسرا یہ کہ کسی ایک مقام یا جگہ کو مرکز ملت کی حیثیت حاصل ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کا مرکز بیت اللہ شریف ہے۔ مرکز ملت مرکز ارتکاز ہے

اور ملت کی یکسانی کردار کا ایک نمونہ ہے۔ اسرار خودی میں خودی کے استحکام کی شرط اور رموز بیخودی میں ملت کا حقیقی نصب العین توحید بتاتے ہیں اور اسی مقصد کے ساتھ وابستگی کو ملت کے استحکام کا سبب سمجھتے ہیں۔ مذہبی معنی میں توحید وجود باری تعالیٰ کی صفت ہے اور اس سے مراد فقط یہ کہ الہ العالم واحد یعنی ایک ہے۔ اقبال اپنی شعری بصیرت (Poetic vision) میں توحید کا مطلب وہ نہیں لیتے جو متداول چلا آ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد
عاشقاں را بر عمل قدرت دہد[۱۳]

اقبال کا شعری وجدان توحید کے جس معنی کو بیان کر رہا ہے، وہ متداول نہیں ہے:

مدعائے ما، مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک جان و یک دل و یک جاں شدیم[۱۴]

اقبال حیات ملی کا دوسرا رکن رسالت بتاتے ہیں۔ رسالت کا متداول مفہوم یہ ہے کہ اللہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے انسانوں میں سے ایک انسان پر وحی بھیجتا ہے۔ یہ وحی نبوت یا رسالت کہلاتی ہے اور جس ذات شریف پر وحی کی جاتی ہے اسے نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ اقبال جب نبوت یا رسالت کو رموز بیخودی کی رمزوں میں سے ایک رمز ظاہر کرتے ہیں تو اس کے معنی بالکل نئی شکل میں ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است[۱۵]

شعر اقبال میں رسالت کے متداول معنی کی نفی نہیں ہے بلکہ متداول معنی پر شعر اقبال کی حکمت منحصر ہے۔ رسالت کے متداول معنی اگر پہلے سے فرض شدہ نہ ہوں تو جو اقبال معنی پیدا کرنا چاہتے ہیں سامنے نہیں آ سکیں گے۔ مذکورہ بالا اشعار میں یہ کہنا کہ ''وز رسالت در تن ما جاں دمید'' اس امر کا ثبوت ہے کہ

اقبال رسالت کے متداول معنی میں ایک ترفع پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ رسالت ہی کے باعث ملت کو یکجاں ظاہر کررہے ہیں۔ رسالت کے متداول معنی میں مقصد کا اضافہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: رسالت محمد یہ کا مقصود حریت، مساوات اور اخوت بنی نوع انسان ہے۔ حریت سے یہاں اقبال کا مقصد اجنبی اقوام کے غلبے سے نجات ہے یا حریت کے کچھ اور معنی ہیں؟ اقبال یہاں حریت سے سیاسی آزادی مراد نہیں لے رہے ہیں۔ یہ انسان کا انسان کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ مساوات سے مراد قانونی مساوات ہے یعنی ہر انسان قانون کے سامنے یکساں جوابدہ ہے اور قانون ہر انسان پر یکساں واجب النفاذ ہے۔ اخوت کا مقصد تمام انسانوں کے حقوق وفرائض کی یکسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا کو حریت کی مثال بنایا ہے اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے واقعے کو اخوت کا اور سلطان مراد اور معمار کے واقعے کو مساوات کا نمونہ بتایا ہے۔[۱۶]

ملت اسلامیہ کی اساس چونکہ توحید و رسالت ہے اس لیے زمانی و مکانی قید سے بالا ہے۔ اس موقف کو بنیاد بنا کر اقبال ایک طرف ملت اسلامیہ کے لیے جغرافیائی وطنیت کی نفی کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کو زمانے کی قید سے باہر نکال لیتے ہیں اور قرآن پاک کو ملت کا آئین بتاتے ہیں۔ ایک بات ان مقدمات سے بالکل واضح ہے کہ قرآن پاک کے فہم کا حوالہ قرآن پاک خود ہے اور اس کی تفہیم زمانی و مکانی حوالوں سے بالاتر ہے۔ قرآن پاک کے متعلق یہ تصور ''متداول عقیدے'' سے بہت زیادہ ممتاز ہے۔ بالعموم قرآن پاک کی تفہیم آیات کے شان نزول سے مشروط سمجھی جاتی ہے۔ اقبال کا تصور یہ بتا رہا ہے کہ قرآن پاک کی تفہیم زمانی و مکانی حوالوں کی محتاج نہیں ہے۔

فکر اقبال میں عروج و زوال کی منصوبہ بندی ایک جیسی نہیں ہے۔ وہ دور زوال میں رونما ہونے والی بعض مشکلات کا اندازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دور انحطاط میں اجتہاد کے بجائے تقلید زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ بظاہر اقبال کے مذکور ماقبل اور عمومی موقف سے یہ بات متصادم نظر آتی ہے کہ اجتہاد کے بجائے تقلید دور انحطاط میں زیادہ کارآمد ہے۔ اقبال خاص طور پر تقلید کی نفی کرتے ہیں اور خودی کا وجود فقط اسی صورت میں متحقق مانتے ہیں جب آزادی کے ساتھ فرد اپنے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ یہاں اقبال نے ''دور انحطاط'' کا ذکر کیا ہے، گویا انحطاط کے دور میں بہت سے برائیوں کو بوجہ مجبوری قبول کرنا پڑتا ہے، تقلید بھی ان برائیوں میں سے ایک ہے۔ دوسری بات یہ کہ ''عالمان کم نگاہ'' کے اجتہاد کو شرف قبولیت نہیں دینا چاہتے۔ تقلید انفرادی مسئلہ ہے، فرد فرد کی تقلید کرتا ہے، جماعت جماعت کی تقلید کرتی ہے۔ فرد جماعت کی یا جماعت فرد کی تقلید نہیں کرتی، تقلید اجتماعی یا ملت کا مسئلہ اس وقت ہوگا جب وہ ملت اسلامیہ کسی دوسری قوم کی تقلید کر رہی ہو۔ یہاں اقبال فرد سے مخاطب ہیں اصولاً اسے اسرار خودی کے مضامین میں ہونا

چاہیے۔ مگر اقبال افراد ملت سے مخاطب ہوتے ہیں تو انہیں بعض وجوہات کی بنا پر نصیحت کرتے ہیں کہ قدیم روش کو ترک نہ کرو، قدیم روش کو ترک نہ کرنا تقلید کے دائرے میں آتا ہے۔ جب افراد ملت کے بجائے ملت سے مخاطب ہوتے ہیں تو اسے آئین الٰہیہ کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ [۱۷]

شعری وجدان کے ذریعے سے اقبال عمدہ اور بامعنی تراکیب بناتے ہیں، ان میں ایک ''آداب محمدیہ'' ہے۔ ملت کے اجتماعی شعور میں اس کے معنی واضح ہیں لیکن انفرادی شعور میں کثرت تعبیر کی وجہ سے متعین مفہوم پریشان خیالی کا شکار ہوسکتا ہے۔ اقبال اس پریشان خیالی سے گریز کرتے ہوئے اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں [۱۸]۔ ذہنی یا روحانی مرکزیت متعین کرنے کے بعد وہ مادی اور محسوس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حیات ملی کے لیے مرکز ملت بیت اللہ شریف ہے۔ ملت اسلامیہ کا اجتماعی نصب العین حفظ توحید اور نشر و اشاعت توحید ہے۔ ملت اسلامیہ کی توسیع کے لیے تسخیر کائنات ضروری ہے۔ نظام عالم کے قوای کی تسخیر کا مقصد وحید عالم پر قابض ہونا نہیں ہے بلکہ ملت کی توسیع یا انسانوں کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی طرف راغب کرنا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ملت کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک فرد کی طرح ہو جائے اور یہ مقصد فقط اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ ملت کی روایت کو مضبوطی سے تھام کر رکھا جائے۔

ملت کی روایات میں سے ایک اہم روایت کی نشاندہی کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ماں کا احترام اسلام ہے۔ یہاں اقبال دراصل عورت کے مقام کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ماں کی ہستی میں وہ پیغمبرانہ صفات دیکھتے ہیں اور امت اور ام میں معنوی تعلق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے
حرمت امت نکتہ ہا دارد بسے [۱۹]

اقبال کہتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنھا مسلمان خواتین کے لیے اسوہ کاملہ ہیں۔ خواتین اسلام سے خطاب کرتے ہوئے جن خیالات کا اقبال اظہار کرتے ہیں ان سے بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ اقبال مغرب کی آزادی نسواں کی تحریک سے بیزار ہیں اور دوسرا وہ عورت سے ایسی توقع باندھے ہوئے ہیں کہ جیسے وہ ملت کی اصل پروردگار ہے:

اے امین نعمت آئین حق
در نفس ہائے تو سوز دین حق
دور حاضر تر فروش و پرفن است
کاروانش نقد دیں را رہزن است
آب بند نخل جمعیت توئی

حافظ سرمایہ ملت توئی
از سر سود و زیاں سودا مزن
گام جز بر جادہ آبا مزن
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوہ زہرا منبد
تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بگل زار آورد[۲۰]

اقبال کے شعری وجدان میں متعین شخصیت کی تعریف وتوصیف درحقیقت انسان کے کردار بلند کی تعریف وتوصیف ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا آخری دونوں شعروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنھا کا اسم گرامی ایک وصف کے حوالے سے بیان کررہے ہیں اور خواتین اسلام سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی اسے اپنائیں۔

رموز بیخودی کے آخر میں رسالب مآب علیہ السلام کی بارہ گاہ میں ایک التجا ہے مگر اس عرض حال کے قبل اقبال نے رموز بیخودی کا خلاصہ سورہ اخلاص کی تفسیر کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خلاصہ ایک خواب کا بیان ہے جس میں اقبال سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرتے ہیں اور آپ سے کسب فیض کرتے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبانی سورہ اخلاص کی ایک ایک آیہ مبارک کے معانی کھولتے ہیں۔ توحید کے عقیدے کو بطور عقیدہ اللہ کی وحدانیت بتاتے ہیں اور جب یہ ایمانی عقیدہ عمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو ملت کی وحدت بن جاتا ہے۔

یک شو توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن[۲۱]

"الصمد" سے اقبال یہ اخذ کرتے ہیں کہ اے مسلم تو اپنی ہستی کو عالم اسباب کا قیدی نہ بنا، جس قدر تیرے اندر صمدیت آئے گی تو اسی قدر آزاد انسان ہوگا۔

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو[۲۲]

"لم یلد و لم یولد" سے رنگ ونسل سے آزادی مراد لیتے ہیں۔ علاقائی قومیت سے دست کش ہونا ضروری سمجھتے ہیں چونکہ کہتے ہیں:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
ہر کہ پابند اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد و لم یولد است[۲۳]

"لم یکن لہ کفوا احد" سے اقبال صاحب ایمان میں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا بھی کوئی ہمتا و شریک نہیں ہوسکتا؛

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم در نسازد باشریک
مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے[۲۴]

آخری نظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں "عرض حال" ہے جس میں اقبال نے بڑے درد وسوز کے ساتھ اپنی صورت حال نبی علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کی ہے اور آخر میں التجا کی ہے کہ ان کو موت مدینہ منورہ میں آئے اور آپ کے روضہ اقدس کی دیوار کے سایہ میں قبر ہو تو فخر سے میں بھی آسمان سے کہہ سکوں:

بافلک گویم کہ آرامم نگر
دیدہ آغازم انجام نگر[۲۵]

❁...❁...❁

حواشی وحوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱-۱۲۔
۲۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور۔
۳۔ غالب، کلیات غالب (فارسی)، شیخ مبارک علی، لاہور، طبع اول ۱۹۶۵ء، ص ۹۵۔
۴۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۶، ۷۔
۵۔ ایضاً، ص ۱۱۔
۶۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۷۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۸۔ ایضاً، ص ۳۵۔
۹۔ ایضاً، ص ۸۰۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۸۱۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۸۷۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۸۹۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۹۱۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۹۳۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۹۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۴۹۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۵۷۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۳۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۷۰۔

❁...❁...❁

رموز بیخودی — علامہ اقبال کے شعری سفر کا برزخی سنگ میل

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

مثنوی رموز بیخودی علامہ اقبال کے فکری ارتقاء اور قومی مقاصد کی برآری کے لیے علامہ اقبال کی جدوجہد کا ایک نمایاں سنگ میل ہے۔ علامہ کی تمام شعری کاوشوں میں رموز بیخودی اس لحاظ سے محوری حیثیت رکھتی ہے کہ یہ مثنوی علامہ کے تمام شعری آثار کا مقام برزخ ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جب رموز بیخودی شائع ہوئی تو اس سے پہلے اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہو چکی تھی۔ خود علامہ کے بقول اسرار خودی رموز بیخودی کا پس منظر یا ابتدائیہ تھی جبکہ ادھورے مطالب کی تکمیل کے لیے رموز بیخودی تصنیف کی گئی۔ اور پھر رموز بیخودی سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب علامہ نے بعد کی شعری کاوشوں میں دیا۔ رموز بیخودی کے دیباچے سے جو علامہ نے خود لکھا اس مثنوی کی مرکزی اور محوری حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ اسی دیباچے میں علامہ نے رموز بیخودی کے اسرار خودی سے تعلق کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

> یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلب منفعت دفع مضرت تعینِ عمل و ذوق حقائق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشوونما۔ اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت۔ تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔[1]

اور پھر رموز بیخودی کو اسرار خودی کا تسلسل قرار دیا:

> گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِ نظر

رکھ کر میں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔[۲]

رموز بیخودی سے مقصود ہی ملت کی تشکیل ہے۔ اس کی زندگی کے مضبوط اور محکم عملی اصولوں کا بیان کہاں ہوگا؟ اس کا جواب اس دیباچے میں علامہ نے یوں دیا:

البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص للّٰہیت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔[۳]

علامہ نے بعد ازاں بھی اپنی اس تصنیف کو اس نکتے یعنی انفرادی خودی اور قومی بےخودی یا اجتماعی انا کی توضیح قرار دیا۔ قاضی نذیر احمد کے نام ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھا:

جنابِ من! ڈاکٹر صاحب کو آپ کا خط مل گیا ہے۔ وہ خود علیل ہیں اس واسطے مجھ سے آپ کے سوالات کا مندرجہ ذیل جواب لکھوایا ہے:

۱- میری تحریروں میں خودی کا لفظ دو معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اخلاقی اور مابعد الطبیعی ہر دو معنوں میں لفظ مذکور کی تشریح واضح طور پر کر دی گئی ہے جس میں فارسی جاننے والے کو کسی قسم کی شک کی گنجایش نہیں رہتی۔ 'اسرار خودی' اور رموز بیخودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجیے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں انیس سو چودہ اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں مضمون ان کے مطالب کی تشریح میں لکھے گئے ہیں۔ باوجود ان کے اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ممکن نہیں کہ سچائی کی دو قسمیں قرار دی جائیں ایک عوام کے لیے، ایک خواص کے لیے اور جو صداقت خواص کے لیے ہو، اُسے عوام پر ظاہر نہ کیا جائے۔ لیکن میرے حالات کے لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میں نے مسئلہ خودی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کا جاننا اس زمانے کے ہندی مسلمانوں کے لیے میرے خیال میں ضروری ہے اور جس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ خودی کے متعلق تصوف کے جو دقیق مسائل ہیں، اُن سے میں نے اعراض کیا ہے۔[۴]

اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی کی تصنیف سے علامہ کے پیش نظر کیا مقاصد تھے، اس کا اندازہ ان ناموں سے بھی ہوتا ہے جو مختلف مراحل پر ان کتب کے لیے علامہ کے زیر غور رہے۔ ابتداً علامہ کے پیش نظر یہ نام 'اسرار حیات'، 'پیام سروش'، 'پیام نو' اور 'آئین نو' تھے۔ ۲ فروری ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی

کے نام لکھا:

ڈیئر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے جو ہے۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمائیے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام ''اسرارِ حیات''، ''پیامِ سروش''، ''پیامِ نو''، ''آئین نو'' تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ مَیں انتخاب کرسکوں۔[۵]

جب یہ مثنوی مکمل ہو رہی تھی تو علامہ رموز بیخودی کو 'اسرارِ حیات ملیہ اسلامیۂ' سے تعبیر کر رہے تھے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کو سید سلیمان ندوی کے نام علامہ نے لکھا:

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو مسیگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ ان شاءاللہ معارف کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی، اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔ مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموزِ بیخودی (اسرارِ حیاتِ ملیۂ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے۔ شائع ہونے پر ارسالِ خدمت کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۶]

اس طرح علامہ نے ایک خط میں اس مثنوی کو دورِ نو کی منطق الطیر سے بھی تعبیر کیا۔ اس کے بعد علامہ نے ہماری علمی و شعری روایت سے اپنی کتاب گلشن راز جدید کو محمود شبستری کی گلشن راز سے معناً اور ہیئت کے لحاظ سے منسوب کیا۔ رموز بیخودی کو منطق الطیر قرار دیتے ہوئے علامہ نے لکھا:

اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموز بیخودی زیرِ طبع ہے، فروری یا مارچ میں شائع ہوجائے گا۔ تو آپ کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہوگا۔ تیسرے حصے کا بھی آغاز ہوگیا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی منطق الطیر ہوگی۔[۷]

اسرار خودی کی تصنیف کے وقت علامہ کے پیشِ نظر حیات فرد یہ تھی۔ اقبال کے ایک اور بیان کے مطابق مثنوی اسرار خودی تحریر کرنے کا آغاز تو ۱۹۱۰ء سے ہوگیا تھا، مگر ابتدا میں یہ مثنوی بطور حقایق حیات فردیہ، انہوں نے اردو میں لکھنا شروع کی۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

میں نے ''اسرارخودی'' پہلے اردو میں لکھنی شروع کی تھی مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہا۔ جو حصہ لکھا گیا تھا، اس کو تلف کر دیا گیا۔ کئی سال بعد پھر یہی کوشش میں نے کی۔ قریباً ڈیڑھ سو اشعار لکھے، مگر میں خود ان سے مطمئن نہیں ہوں۔

یہ مثنوی فارسی میں کیوں تحریر کی گئی؟ اس سلسلے میں اقبال خود بیان کرتے ہیں:

۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور

دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں، جو انسان کے لیے امید، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے، جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے کے لیے سائنس کھڑی تھی، جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی، جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات سے میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے۔ میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں، لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہر حال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدِّ نظر رکھ کر اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' لکھنی شروع کی اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے، آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے فارسی میں شعر کیوں کہنے شروع کیے۔ بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' ابتداء میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال تک بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر کا سینہ چیر کر یورپ پہنچ جائے گی۔ بلا شبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔

اقبال کے فکر کا محور انفرادی اور اجتماعی خودی رہی۔ حتیٰ کہ اس حوالے سے ان کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں ،اسرارخودی اور رموز بیخودی میں ملتی ہے۔ مثنوی اسرار خودی میں پیش کردہ نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کیا:

> میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی گذشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے، جس سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ان دونوں قوموں کے اطباء کو اپنے مریض کا اصل مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصل مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہوگیا......اب حالات حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نقطۂ خیال کی اصلاح کی جائے۔

اسرار کی تصنیف پر علامہ نے ڈاکٹر نکلسن کے نام ۲۶ جنوری ۱۹۲۱ء کے خط میں اس نکتے کی بھی وضاحت کر دی کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیاء اور اہل حکمت سے ماخوذ ہے:

میں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسرارِ خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے جنھیں آپ نے دیباچہ اسرار میں شامل کر لیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں مَیں نے مغربی مفکرین کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے۔ یہ طریق محض اس لیے اختیار کیا گیا تھا تاکہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بہ آسانی سمجھ لیں۔ ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں بزبانِ اُردو جو دیباچہ لکھا ہے اس میں یہی طریقِ استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لیے نئی چیز نہیں۔ قرآن الہٰیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الہٰیات ہی کے مسائل سے ہے۔ عہدِ جدید کا ایک مسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو مذہبی واردات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبدا اور سرچشمہ قرآنِ مجید ہے، تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فکریات کی تاریخ سے نا آشنائے محض ہیں۔ اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔

کیا اسرار خودی کی تصنیف کا محرک روحانی یا وجدانی تھا؟ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں:

یہ مثنوی جس کا نام اسرار خودی ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی، جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی، کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب

شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے مگر:

من نوائے شاعرِ فرداستم

اور:

نا امید ستم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بار آور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمدللہ۔

شیخ اعجاز احمد کے خیال میں اقبال کے اس کشف کا تعلق ۱۹۱۰ء سے ہے۔ انارکلی والے مکان میں وہ رات گئے اشعار قلم بند کرنے کی غرض سے نچلی منزل میں واقعہ اپنے دفتر میں گئے۔ جب واپس اوپر جانے لگے تو کمرے میں ایک دراز قد، سفید ریش، متبرک صورت بزرگ جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے، دکھائی دیئے۔ بزرگ نے انہیں ارشاد کیا کہ پانچ سو آدمی تیار کرو اور اتنا کہنے کے بعد غائب ہو گئے۔ چند ماہ بعد جب اقبال موسم گرما کی تعطیلات میں سیالکوٹ آئے تو اس واقعہ کا ذکر اپنے والد سے کیا۔ میاں جی نے انہیں کہا کہ میں سمجھتا ہوں تمہیں ہدایت ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے اور انہیں ''آدمی'' بنانے والی پانچ سو اشعار کی کتاب لکھو شیخ اعجاز احمد کی رائے میں اس کشفی ہدایت کی تعمیل میں لکھی جانے والی کتاب دراصل مثنوی اسرار خودی تھی۔ ایک خواب تھا جس میں مولانا رومی نے اقبال کو مثنوی لکھنے کی تلقین کی تھی:

روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحرف پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانہ ارباب عشق
جرعہ گیر از شراب ناب عشق[۵]

علامہ نے اسرار خودی اور رموز بیخودی کے مضامین کو باہم منطقی ربط سے ترتیب دیا یعنی خودی سے بےخودی کی طرف کس طرح آئیں گے اور خودی کے مقابل بےخودی کا مفہوم کیا ہوگا۔ اس تصور کو بھی واضح کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کے نام ۲۰ر جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں:

یہ بات دُرست نہیں بلکہ میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں نے کسی گذشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لیے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجیے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا۔

آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

اور اسرارِ خودی میں کوئی تناقض نہیں۔ یہ بات تو میں نے پہلے حصہ میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر بیان کی ہے:

اندکے اندر حرائے دل نشیں
ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سرشکن
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شُد

میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے، یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا، اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے۔

بندۂ حق پیش مولالا ستے
پیشِ باطل از نعم برجاستے

دوسرے حصے میں عالمگیر کی ایک حکایت ہے۔ اس میں یہ شعر ہے:

یں چنیں دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینۂ مومن وطن

مگر ایک اور بے خودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ جو Lyric Poetry کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔

(۲) دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیہ اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے، نہ احکامِ باری تعالیٰ میں۔

پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم تمام مذہب و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دو قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ اس طرح پر کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک 'فنا' ہے؛ البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے، اُن کے مقاصد کچھ اور تھے۔ آیاتِ قرآنی جو آپ نے لکھی ہیں، زیرِ نظر ہیں۔ میں ان کے وہی معانی سمجھتا ہوں جو آپ کے ذہن میں ہیں۔ حیاتِ دُنیا بیشک لہو و لعب ہے۔ میں

نے بھی پہلے حصہ میں (اسرارِ خودی) یہی لکھا ہے:

درقبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار خدا اندیش زی

پھر دوسرے حصے میں ہے، جس میں حضرت عمرؓ کا ایک قول منظوم کیا ہے:

راہ دشوار اس ساماں کم بگیر
درجہاں آزاد زی، آزاد میر
سبحۂ اَقلِلْ من الدنیا شمار
از تعشِ حراً شوی سرمایہ دار

غرض یہ کہ سلطنت ہو، امارت ہو، کچھ ہو، بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ یہ ذرائع ہیں اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے جو شخص ان کو بجائے خود مقصد جانتا ہے، وہ رضوا بالحیوٰۃِ الدنیا میں داخل ہے۔ کوئی فعل مسلمان کا ایسا نہ ہونا چاہیے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہو۔ مسلمان کی تعریف پہلے حصے میں یوں کی گئی ہے(اسرار خودی): ؎

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق رانا موس و نام ونگ دہ
طبع مسلم از محبت قاھراست
مسلم اور عاشق نبشد کا فراست
تابع حق دیدنش، نادیدنش
خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش
دررضایش مرضیِ حق گم شود
ایں سخن کے باورِ مردم شود

زیادہ کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ مجھ پر عنایت فرمایئے۔ عنایت کیا رحم کیجیے اور اسرارِ خودی کو ایک دفعہ پڑھ جایئے۔ جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اُس کی تکلیف سے اُس نے آہ و فریاد کی، اسی طرح مجھ کو آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے۔

رموز بیخودی کی تصنیف کے مقاصد کی وضاحت کے سلسلے میں سر عبد القادر مثنوی کے اس حصے کی وجہِ تصنیف علامہ اقبال ہی کی زبانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، میں عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بڑا معترف ہوں بلکہ ایک اعتبار

سے ممنون بھی ہوں۔ وہ یوں کہ جب اسرار خودی شائع ہوئی تو بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیش نظر ملت کا وجود نہیں۔ حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے۔ بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموز بیخودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کردوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموز بیخودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموز بیخودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔

اسی طرح نیاز الدین خان کے نام ایک خط محررہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء میں ''رموزِ بیخودی'' کے موضوع پر اقبال نے تحریر کیا:

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیّت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیّت کے اصول حقّہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورایّام و اعصار سے متاثر نہیں ہوسکتی۔

رموز بیخودی کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱-تعارف

(i) مولانا روم سے انتساب

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب[9]

(ii) پیش کش بحضور ملت اسلامیہ

(iii) تمہید۔ درمعنی ربط فرد وملت

(iv) درمعنی ایں کہ ملت از اختلاطِ افراد پیدا می شعر و تکمیل تربیت او از نبوت است

۲-ارکان اساسی ملت اسلامیہ

رکن اول۔ توحید

(i) درمعنی ایں کہ یاس وحزن وخوف ام الخبائث است و قاطع حیات و توحید ازالہ این امراض خبیثہ می کند۔

(ii) حکایات۔ ا۔ محاورہ تیر وشمشیر

ب۔ حکایت شیر وشہنشاہ عالمگیر

رکن دوم ـ رسالت

(i) در معنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل تاسیس حریت ومساوات واخوت بنی نوع آدم است

حکایات

(i) حکایت بوعبیدہ و جابان در معنی اخوت اسلامیہ

(ii) حکایت سلطان مراد و معمار در معنی مساوات اسلامیہ

(iii) در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا

۳ـ خصائص ملت اسلامیہ

(i) زمانی ـ مکانی بقا

ا ـ در معنی ایں کہ چوں ملت محمدیہ موسس بر توحید و رسالت است پس نہایت مکانی ندارد

ب ـ در معنی ایں کہ وطن اساس ملت نیست

ج ـ در معنی ایں کہ ملت محمدیہ نہایت زمان ہم ندارد کہ دوام ایں ملت شریفہ موعود است

(ii) آئین ملت

ا ـ در معنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئین ملت محمدیہ قرآن است

ب ـ در معنی ایں کہ در زمانہ انحطاط تقلید از اجتہاد اولی تر است

ج ـ در معنی ایں کہ پختگی سیرت ملیہ از اتباع آئین الٰہیہ است

(iii) سیرت ملت

در معنی ایں کہ حسن سیرت ملیہ از تادب بآداب محمدیہ است

(iv) مرکز ملت

در معنی ایں کہ حیات ملیہ مرکز محسوس میخواہد مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرم است

(v) ملی نصب العین

در معنی ایں کہ جمعیت حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ است ونصب العین امت محمدیہ حفظ ونشر توحید است

(vi) توسیع حیات ملیہ

در معنی ایں کہ توسیع حیات ملیہ از تسخیر قوائے نظام عالم است

(vii) کمال حیات ملیہ

در معنی ایں کہ کمال حیات ملیہ ایں است کہ ملت مثل فرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل ایں احساس از ضبط روایات ملیہ ممکن گردد۔

(viii) بقائے ملت

ا۔ در معنی ایں کہ بقائے نوع از امومت است و حفظ و احترام امومت اسلام است

ب۔ در معنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؑ اسوہ کاملہ ایست برائے نساء السلام

ج۔ خطاب بہ مخدرات اسلام

۴۔ خلاصہ مطالب مثنوی در تفسیر سورۃ اخلاص

۵۔ عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعلمین۔

کتاب کا آغاز مولانا روم کے اس شعر سے کیا گیا ہے:

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب

یہ شعر ایک لحاظ سے کتاب کا مولانا روم سے انتساب بھی ہے اور علامہ کے منشا و مقصود کا بیان بھی۔ یعنی اس مثنوی کے لیے علامہ نے بے خودی کا لفظ مثنوی سے کیا۔ مثنوی بے خودی میں لفظ بے خودی کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثنوی کے دفتر دوم[۱۰] دفتر سوم[۱۱]، دفتر چہارم[۱۲] اور دفتر پنجم[۱۳] میں یہ لفظ مولانا لاتے ہیں۔ مگر ان تمام اشعار سے رموز بیخودی کے لیے علامہ نے جس شعر کا انتخاب کیا وہ اپنے نفس مضمون اور الفاظ یعنی جہد، بے خودی، خود را یافتن، اور زودتر کے لحاظ سے علامہ کے پیغام سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ شعر جس پس منظر میں مثنوی معنوی میں آیا ہے وہ علامہ کے تصور خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کی وضاحت بھی ہے۔ یہ شعر دفتر چہارم کی ایک حکایت سے ہے جس کا عنوان ہے:

در بیان آنکه شهزاده، آدمی بچه است و خلیفه خداست پدرش، آدم صفی خلیفه حق سجود ملایك، و آن کمپیر کابلی دنیاست که آدمی بچه را از پدر ببرید به سحر، و انبیا و اولیا آن طبیب تدارك کننده اند۔[۱۴]

مثنوی کو اس حکایت کے مطابق جب ایک بادشاہ کا شہزادہ جادو کے اثرات کے تحت اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے تو بادشاہ کے لیے یہ واقعہ ایک سانحہ جانکاہ ثابت ہوتا ہے۔ بصد تدبیر جب وہ شہزادہ صحت یاب ہوتا ہے تو مولانا بادشاہ کی اس ساری پریشانی اور مصیبت کے ازالے کو بندہ مومن کے احوال سے مناسبت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بندہ مومن کی چشم بصیرت دنیا کی افسوں گری سے نابینا ہو چکی ہے۔ اس کی صحت یابی اس میں ہے کہ وہ ذات حق کے سامنے بیخود ہو جائے تا کہ وہ واصل بحق ہو سکے۔ یہی مفہوم

علامہ کے رموزِ بیخودی کو منطق الطیر قرار دینے میں ہے۔[۱۵] منطق الطیر کا یہ شعر اس مفہوم کو بیان کرتا ہے جو خودی کے انتساب کے طور پر دیئے گئے مولانا کے شعر میں ہے:

تو درو گم شو وصال ایں است وبس
تو ممان اصلا کمال ایں است و بس

اس بےخودی کی وضاحت مثنوی کے دوسرے اشعار سے یوں ہوتی ہے:

عقل سایہ حق بود حق آفتاب
سایہ را با آفتاب او چہ تاب
چوں پری غالب شود بر آدمی
گم شود از مرد وصف مردمی
ہر چہ گوید آن پری گفتہ بود
زیں سرے نہ، زآں سرے گفتہ بود
پس خداوند پری و آدمی
از پری کے باشدش آخر کمی
گرچہ قرآن از لب پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نگفت او کافر است[۱۶]

رموز بیخودی کی تصنیف کے بعد اس مثنوی کا تیسرا حصہ ''حیات مستقبلہ ملت اسلامیہ'' علامہ کے پیش نظر تھا۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں رموز بیخودی مکمل ہوئی، اس دوران اقبال مثنوی کے تیسرے حصے بعنوان ''حیاتِ مستقبلہ اسلامیہ'' تحریر کرنے پر بھی غور کر رہے تھے۔ چنانچہ گرامی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آ رہا ہے اور مضامین دریا کی طرح اُمڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔ اس حصے کا مضمون ہوگا، حیات مستقبلۂ اسلامیہ یعنی قرآنِ شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعتِ اسلامیہ، جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات وحوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخران سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات اور سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجہ پر پہنچا ہوں، مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس

کا لکھنا آسان نہیں۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا، اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا اشاعت ہو جائے گی۔

اسی طرح اس ارادے کا اظہار رموز بیخودی کی اشاعت کے بعد، اکبرالٰہ آبادی سے بھی اپنے ایک خط محررہ ۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء میں کیا اور تیسرے حصے کے چند شعر بھی انہیں لکھے۔

گو رموز بیخودی کا تیسرا حصہ 'حیات مستقبلہ ملت اسلامیہ' کے عنوان کے تحت تو نہ لکھا جا سکا مگر بعد کی تصانیف خصوصاً جاوید نامہ میں علامہ نے ان تمام مضامین کو بیان کر دیا۔ جاوید نامہ میں 'محکمات عالم قرآنی'[۲۸] کے تحت بیان کیے گئے نکات اس مضمون کو بیان کرتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے مستقبل کی محکم اساس کیا ہو سکتی ہے۔ محکماتِ عالم قرآنی کے تحت درج ذیل نکات کو علامہ نے بیان کیا ہے:

۱-خلافت آدم
۲-حکومت الٰہی
۳-ارض ملک خدا ست
۴-حکمت خیر کثیر است

اگر ان نکات کی تفصیلات کو رموز بیخودی کے مضامین کے تناظر میں دیکھا جائے تو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ محکمات عالم قرآنی نہ صرف رموز بیخودی کے مضامین کی تفصیل و توضیح ہیں بلکہ ان تصورات کے عملی نفاذ و اطلاق کا منہج بھی ہیں۔ اب ان نکات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

۱- خلافتِ آدم

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق

دونوں جہانوں میں ہر جگہ عشق ہی کے آثار ہیں۔ آدم کا بیٹا عشق اسرار میں سے ایک راز ہے۔

سرِّ عشق از عالمِ ارحام نیست
او ز سام و حام و روم و شام نیست

سرعشق کا تعلق ماوؤں کے رحم سے نہیں نہ اس کی نسبت خاندان یا ملک سے ہے۔

کوکبِ بے شرق و غرب و بے غروب
در مدارش نے شمال و نے جنوب

وہ ایسا ستارہ ہے جس کا تعلق نہ مشرق سے نہ مغرب سے اور نہ وہ کبھی غروب ہوتا ہے اور نہ اس کے مدار میں

شمال وجنوب ہے۔

حرفِ اِنی جَاعِل تقدیرِ او
از زمیں تا آسماں تفسیرِ او

اللہ تعالی کا ارشاد کہ ''میں آدم کو زمین میں اپنا نائب بنا تا ہوں'' انسان کی تقدیر ہے اور زمین سے آسمان تک ہر شے کی تسخیر اس تقدیر کی تفسیر ہے۔

او امام و او صلوات و او حرم
او مداد و او کتاب و او قلم!

وہ امام ہے وہی صلوۃ اور وہی حرم۔ وہی سیاہی ہے وہی لوح محفوظ اور وہی قلم۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

آدم کا مقام آسمان سے بھی بلند تر ہے احترام آدم ہی تہذیب کی بنیاد ہے۔

زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست؟
عشقِ یک بیں در تماشاے دوئی است!

اے زندہ دل کیا تو جانتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ عشق یک بین کثرت میں وحدت کا تماشا کرتا ہے۔

زن نگہ دارندۂ نارِ حیات
فطرتِ او لوحِ اسرار حیات

عورت نارِ حیات کی محافظہ ہے اس کی فطرت ایسی لوح ہے جس پر اسرار حیات رقم ہوتے ہیں۔

آتشِ ما را بجانِ خود زند
جوہرِ او خاک را آدم کند

وہ ہماری آتش (شوق) کو اپنی جان میں سموتی ہے چنانچہ اس کا جوہر خاک کو آدم بنا دیتا ہے۔

در ضمیرش ممکناتِ زندگی
از تب و تابش ثباتِ زندگی

اس کے ضمیر کے اندر زندگی کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ اس کی تب وتاب سے زندگی ثبات پاتی ہے۔

اے ز دینت عصرِ حاضر بردہ تاب
فاش گویم با تو اسرارِ حجاب

دورِنو نے تیرے دین کی آب وتاب زائل کر دی ہے۔ میں تجھ پر پردے کے اسرار واضح کرتا ہوں۔

ذوقِ تخلیق آتشے اندر بدن
از فروغِ او فروغِ انجمن!

ذوقِ تخلیق بدن کے اندر آگ کی مانند ہے اسی کی روشنی سے انجمن روشن ہے۔

ہر کہ بردارد ازیں آتش نصیب
سوز و ساز خویش را گردد رقیب

جو بھی اس آگ سے کوئی حصہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے ساز وساز کو محفوظ کر لیتا ہے۔

ہر زماں بر نقشِ خود بندد نظر
تا نگیرد لوحِ او نقشِ دگر

وہ ہر لمحہ اپنے نقش پر نگاہ مرکوز رکھتا ہے مبادا اس کی لوح کسی اور کا نقش اختیار کر لے۔

مصطفیؐ اندر حرا خلوت گزید
مدّتے جز خویشتن کس را ندید

جناب رسول پاک نے غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی اور مدت تک اپنے سوا کسی اور کو نہ دیکھا۔

نقشِ ما را در دلِ او ریختند
ملّتے از خلوتش انگیختند

آپؐ کے قلب مبارک میں ہمارا نقش ڈالا گیا۔ آپؐ کی خلوت کے اندر سے ایک نئی ملت ابھری۔

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

اللہ تعالی سے انکار کیا جا سکتا ہے مگر حضورؐ کی عظمتِ شان سے انکار ممکن نہیں۔

از کم آمیزی تخیل زندہ تر
زندہ تر، جویندہ تر، یابندہ تر!

کم آمیزی سے قلب کے اندر زندگی جستجو اور یافت بڑھتی ہے۔

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات
ہر دو می گیرد نصیب از واردات!

علم اور شوق (عشق) دونوں زندگی کے مقامات میں سے ہیں ہر دو کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے ہے۔

ہر کجا بے پردہ آثارِ حیات
چشمہ زارش در ضمیرِ کائنات

جہاں کہیں آثارِ حیات بے پردہ نظر آئے ہیں۔ ان کا سرچشمہ ضمیر کائنات کے اندر ہے۔

در نگر ہنگامہ آفاق را
زحمتِ جلوت مده خلاّق را

پس تو ہنگامۂ آفاق دیکھ اس کے خلاق کو جلوت کی زحمت نہ دے۔

حفظِ ہر نقش آفریں از خلوت است
خاتمِ او را نگیں از خلوت است

ہر نقش آفریں کی حفاظت خلوت سے ہے خلوت ہی اس کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔

خلافت آدم کے تحت علامہ نے آدم کے مقام، منصب، تہذیب انسانی کے فروغ و ارتقاء عورت کے منصب، تحفظ ناموس اور پردے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ معاشرے کی تعمیر میں عورت کا وہی کردار جس کا ذکر 'خطاب بہ مخدرات اسلام' میں تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل سے آیا ہے۔ علامہ نے معاشرے کی مستحکم اساس اس امر کو قرار دیا ہے کہ تخلیق خلوت میں ہوتی ہے اور جلوت میں تخلیقی فعلیت کمزور ہو جاتی ہے لہٰذا اگر معاشرے کو مضبوط اساس پر استوار کرنا ہو تو عورت کے ناموس، تقدس اور امومت کے کردار کا احترام بحال کرنا ہوگا۔

۲- حکومتِ الٰہی

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق ہر مقام سے بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا غلام ہے نہ کوئی اس کا غلام۔

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس

بندۂ حق بس مردِ آزاد ہے۔ اس کی حکومت اور آئین اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لَا یَرَاعِی لَا یَخَاف

احکام وحی صلح و جنگ دونوں میں عدل پر مبنی ہیں وہ دوستی و دشمنی دونوں میں نہ کسی کی رعایت کرتے ہیں نہ کسی کا خوف رکھتے ہیں۔

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود

زور ور بر ناتواں قاہر شود

جب اللہ تعالی کے علاوہ کوئی اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ تو اس سے طاقتور کمزور پر مسلط ہو جاتا ہے۔

قاہرِ آمر کہ باشد پختہ کار
از قوانیں گردِ خود بندد حصار

پختہ کار زبردست آمر۔ قوانین کے ذریعے اپنے اردگرد قلعہ بنا لیتا ہے۔

قاہری را شرع و دستورے دہد
بے بصیرت سُرمہ با کورے دہد!

جبر و تسلط کو قانون اور آئین کی صورت دیتا ہے گویا اندھا اندھے کو سرمہ عطا کرتا ہے۔

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک!
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک!

پادشاہوں کے آئین و دستور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاگیردار موٹے ہو جاتے ہیں اور دہقان تکلے کی مانند نحیف و نزار۔

وائے بر دستورِ جمہور فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ!

فرنگی جمہوریت کے دستور پر افسوس فرنگ کی بانگ صور سے مردہ زندہ ہونے کی بجائے اور زیادہ مردہ ہو جاتا ہے۔

دیدہ ہا بے نم ز حُبّ سیم و زر
مادراں را بارِ دوش آمد پسر

سونے چاندی کی محبت نے ان کی آنکھوں سے ہمدردی چھین لی ہے یہاں تک کہ مائیں اپنے بیٹوں کو بوجھ سمجھنے لگی ہیں (مامتا جیسی قیمتی چیز بھی ختم ہو گئی ہے۔)

گرچہ دارد شیوہ ہای رنگ رنگ
من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!

اگرچہ افرنگ رنگا رنگ انداز رکھتا ہے مگر میں انہیں دیکھ کر صرف عبرت حاصل کرتا ہوں۔

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو!

اے وہ شخص جو ان کی تقلید کا غلام بنا ہوا ہے آزاد ہو۔ قرآن پاک کا دامن تھام اور صحیح معنوں میں مرد حر بن

جا-

حکومتِ الٰہی سے علامہ کی مراد وہ روحانی جمہوریت ہے جس کا اجمالی ذکر تو رموز بیخودی میں آیا اور پھر اسے علامہ نے تشکیل جدید میں بھی بیان کیا۔ یہاں اس کی مزید تفصیلات آئی ہیں ۔مسلم معاشرہ قانون الٰہی اور وحی کا پابند ہوتا ہے۔ دنیاوی جمہوریت کے وہ مفاسد جنھوں نے دنیا کو مسائل کی آماجگاہ بنا دیا ہے ان میں حب سیم و زر، استحصال اور دوسرے مسائل شامل ہیں۔ ان کا ازالہ صرف آئین الٰہی کی پابندی سے ہی ممکن ہے۔

۳- ارض ملک خدا است

سر گذشتِ آدم اندر شرق و غرب
بہرِ خاکے فتنہ ہاے حرب و ضرب!

مشرق و مغرب میں آدم کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ لڑائی جھگڑے کے سارے فتنے زمین کے لیے پیدا ہوئے۔

یک عروس و شوہرِ او ما ہمہ
آں فسونگر بے ہمہ ہم با ہمہ!

یہ ایک دلہن ہے اور ہم سب اس کے شوہر اور یہ ساحرہ ہم سب کے ساتھ بھی ہے اور ہمارے بغیر بھی۔

عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است
نے ازانِ تو نہ از آنِ من است!

اس کے سارے ناز و ادا مکر و فن ہیں۔ نہ یہ تیری ہے اور نہ میری۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

اللہ تعالی نے زمین کو صرف ہماری متاع فرمایا ہے۔ اور یہ بے بہا متاع مفت ہے مفت۔

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

جاگیردار مجھ سے یہ نکتہ سمجھ زمین سے رزق اور قبر حاصل کر، زمین پر قبضہ نہ کر۔

تو عقابی طائفِ افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

تو عقاب ہے افلاک کی سیر کر۔ اپنے بال و پر کھول اور خاک سے آزاد ہو۔

باطنِ الارض للہ ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اس کے معنی ظاہر ہیں جو اس ظاہر نہیں دیکھتا وہ کافر ہے۔

من نگویم در گذر از کاخ و کوے

دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بوے

میں نہیں کہتا کہ مکان و آبادی کو چھوڑ دے یہ جہان رنگ و بو (دنیا) تمہاری دولت ہے۔

دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر

صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

زمین کی خاک سے دانوں کو موتیوں کی طرح چن لیکن شاہین کی مانند اس کے افلاک سے شکار کر۔

مُردنِ بے برگ و بے گور و کفن؟

گم شدن در نقرہ و فرزند و زن!

بے سر و سامانی کی حالت میں اور بغیر گور و کفن کے مرنا کیا ہے؟ سونے، چاندی اور فرزند و زمن میں کھو جانا۔

ہر کہ حرفے لآ اِلٰہ از بر کند

عالمے را گم بخویش اندر کند

جس کسی نے لا الہ از بر کر لیا۔ اس نے گویا سارے جہان کو اپنے اندر سمو لیا۔

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست

فقر سلطانی است رہبانی کجاست

بھوکا، ننگا رہنا اور رقص کرنا۔ یہ فقر نہیں فقر سلطانی ہے رہبانی نہیں۔

الارض للہ وہ عنوان ہے جو علامہ کے معاشی افکار کا بیان ہے۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ'[۱۸] میں علامہ نے مطلق ملکیت کی بجائے امانت کے جس تصور کا ذکر کیا تھا وہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ اکتناز اور استحصال وہ معاشی بیماریاں ہیں جو معاشرے کو انسانیت کے اوصاف سے محروم کر دیتی ہیں۔ ایک اسلامی معاشرے میں وسائل معیشت سے استفادے کے امکانات ہر شخص کے لیے برابر کھلے ہوتے ہیں۔

۴۔حکمت خیر کثیر است

'گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر

ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر'

اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے جہاں کہیں تو اس خیر کو دیکھے اپنا لے۔

علم حرف و صَوت را شہپر دہد
پاکی گوہر بہ نا گوہر دہد

علم مصنف اور خطیب کو شہپر عطا کرتا ہے اس سے معمولی شخصیت کو بھی اندرونی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔

علم را بر اوجِ افلاک است رہ
تا ز چشمِ مہر بر کند نگہ

علم کا راستہ افلاک کی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وہ سورج کی آنکھ سے بھی نگاہ چھین لیتا ہے۔

نسخۂ او نسخۂ تفسیرِ کل
بستۂ تدبیر او تقدیرِ کل

علم ساری موجودات کی تفسیر حاصل کرنے کا نسخہ ہے سب کی تقدیر اسی کی تدبیر کے ساتھ وابستہ ہے۔

چشمِ او بر وارداتِ کائنات
تا بہ بیند محکماتِ کائنات

علم کی نظر کائنات کے بارے تجربات پر ہے۔ تا کہ وہ کائنات کے بنیادی اصول دیکھے۔

دل اگر بندد بہ حق، پیغمبری است
ور ز حق بیگانہ گردد کافری است!

دل کو اگر اللہ تعالی سے لگایا جائے تو یہ پیغمبری ہے اور یہ اگر اللہ تعالی سے بیگانہ رہے تو یہی کافری ہے۔

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است
نورِ او تاریکی بحر و بر است!

اگر تو علم کو سوزِ عشق کے بغیر پڑھے تو یہ شر ہے۔ ایسے علم کو نور بحر و بر کی تاریکی ہے۔

بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ
از بمِ طیّارۂ او داغ داغ!

بحر، صحرا، کوہسار، باغ و راغ سب اس کے طیاروں کے بموں سے داغ داغ ہو جاتے ہیں۔

سینۂ افرنگ را نارے ازوست
لذّتِ شبخون و یلغارے ازوست

اسی علم نے فرنگیوں کے سینے میں آگ بھڑکائی ہے اور اسی سے انہیں شبخوں اور یلغار کی لذت حاصل ہوئی ہے۔

قوتش ابلیس را یارے شود

نور نار از صحبت نارے شود

اس علم سے حاصل شدہ قوت ابلیس کی مددگار بنتی ہے اور پھر نار یعنی ابلیس کی صحبت سے اس علم کا نور بھی نار بن جاتا ہے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!

ابلیس کو مارنا مشکل کام ہے کیونکہ وہ نفس کی گہرائیوں میں گم ہے۔

از جلالِ بے جمالے الاماں
از فراقِ بے وصالے الاماں!

ایسے علم کے جلال بے جمال سے خدا کی پناہ۔ اس کے لیے وصال فراق سے خدا کی پناہ۔

علمِ بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں!

بغیر عشق کے علم کا تعلق شیاطین سے ہے اور باعشق علم کا تعلق عارفانِ الٰہی سے ہے۔

بے محبت علم و حکمت مُردۂ
عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ

عشق الٰہی کے بغیر علم وحکمت مردہ ہے اور عقل ایسا تیر ہے جو نشانے سے دور۔

کور را بینندہ از دیدار کن
بولہب را حیدرِ کرّار کن!

اندھے (علم) کو دیدارِ الٰہی سے بصیر بنا دے اور اس طرح بولہب کو حیدر کرارؓ میں بدل دے۔

رموز بیخودی میں حیات ملیہ کے تسلسل، مقاصد اور توسیع کے باب 'در معنی ایں کی توسیع حیات ملیہ از تسخیر توائے نظام علم است' کا جو عنوان قائم کیا تھا اس کی توضیح 'حکمت خیر کثیر است' کے تحت موجود ہے۔ علامہ یہاں تسخیر کائنات کے لیے علم وحکمت کی اہمیت کو بیان کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ علم طاغوتی کو علم لاہوتی بنانے پر بھی زور دیتے ہیں۔

رموز بیخودی کے مضامین کا یہ مختصر جائزہ واضح کرتا ہے کہ علامہ کی بعد کی تمام شعری اور نثری تصانیف انھی مضامین کی توضیح وتشریح ہیں۔ اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی میں علامہ نے انفرادی اور اجتماعی خودی کی تعمیر کے لیے جو اصول تشکیل دیئے تھے وہ اتنے محکم تھے اور علامہ کو ان کے بارے میں اتنا شرح صدر تھا کہ وہ زندگی بھر انھی اصولوں کی تعبیر وتشریح اور ابلاغ کے لیے کاوشیں کرتے

رہے۔

ملت اسلامیہ کے ارکان اساسی کا ذکر کرتے ہوئے جب رموز میں علامہ نے توحید اور رسالت کا ذکر کیا تو یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اسلام کے تصور دین و تصور حیات کے تیسرے اہم رکن ''آخرت'' کا ذکر نہیں کیا۔ مگر رموز کا آخری عنوان ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' اس سوال کا جواب ہے۔ اس کے درج ذیل اشعار علامہ کے تصور آخرت کو بیان کرتے ہیں:

از درت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فردائے من
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

یعنی علامہ کے نزدیک مرد مومن کا تصور آخرت، جو توحید اور رسالت کے بعد دین کا تیسرا رکن ہے، جنت، دوزخ کے تصور تک محدود یا اس پر ہی مبنی نہیں بلکہ حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ کی حضوری، آپ کی خوشنودی اور ابدی سرخروئی کے حصول سے عبارت ہے، جہاں اقبال کائنات کو مخاطب کرتے ہوئے زبان حال سے کہتے ہیں:

دیدۂ آغازم انجامم نگر!

❁....❁....❁

حوالہ جات وحواشی

۱- علامہ اقبال، دیباچہ رموزِ بیخودی، اشاعت اول، ۱۹۱۸ء۔

۲- ایضاً۔

۳- ایضاً۔

۴- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۳۷-۵۳۸۔

۵- ایضاً۔ ص ۶۱۴-۶۱۵۔

۶- ایضاً۔ ص ۱۱۲-۱۱۳۔

۷- ایضاً۔ ص ۵۰۶-۵۰۷

۸- علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۹۔

۹- مثنوی معنوی، دفتر ۴، بیت: ۳۲۱۸۔

۱۰-

تا نگردد نیکوئی ما بدی
اینکہ گفتم ہم نبد جز بیخودی
(دفتر- دوم، بیت: ۸۴۱)

۱۱-

لاف درویشی زنی و بیخودی
ہای و ہوی عاشقان ایزدی
(دفتر- سوم، بیت: ۶۷۸)

در گلستان عدم، چون بے خودیست
مستی از سغراق لطف ایزدست
(دفتر- سوم، بیت: ۲۹۴۲)

ای بدیدہ در فراقم گرم و سرد
باخود آ از بے خودی و باز گرد
(دفتر- سوم، بیت: ۴۶۶۷)

۱۲-

چون همای بیخودی پرواز کرد
آن سخن را بایزید آغاز کرد
(دفتر- چہارم، بیت:۲۱۲۳)

با خودی، با بے خودی دو چار زد
با خود اندر دیدۂ خود خار زد
(دفتر- چہارم، بیت:۲۱۳۷)

نہ همہ جا بیخودی شر میکند
بی ادب را، بی ادب تر میکند
(دفتر- چہارم، بیت:۲۱۵۶)

جہد کن در بیخودی، خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب
(دفتر- چہارم، بیت:۳۲۱۸)

۱۳-

بیخودی، بی ابری است، ای نیک خواه
باشی اندر بے خودی چون قرص ماه
(دفتر-پنجم، بیت:۶۸۴)

بے خودی نامد بہ خود، توش خوانده ای
اختیار از خود نشد، توش رانده ای
(دفتر- چہارم، بیت:۴۱۰۷)

۱۴- مثنوی معنوی، دفتر چہارم
۱۵- شیخ عطاءاللہ، مجموعہ مکاتیب اقبال، ص۵۰۶-۵۰۷
۱۶- مثنوی معنوی، دفتر چہارم
۱۷- علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص۶۸۔
۱۸- علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، ص۱۰۷۔

❁...❁...❁

رموزِ بیخودی — قیام واستحکامِ پاکستان

حسن رضا اقبالی

علامہ محمد اقبالؒ کے یہاں بے خودی سے مقام فنا مراد نہیں بلکہ بے خودی سے اُن کی مراد ہے، انسان کا انفرادیت کی منزل سے نکل کر اجتماعیت کی منزل میں آنا۔ فرد کو انفرادی مقاصد کے لیے جدوجہد کرنا لازمی ہے لیکن جب تک وہ اپنے ذاتی مقاصد کو قوم کے وسیع تر مقاصد پر قربان نہیں کرے گا اس کی خودی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ اقبالؒ کا نظریہ یہ ہے کہ ہر فرد کی ذات میں انفرادیت اور اجتماعیت کے عناصر اس طرح پیوستہ ہوتے ہیں کہ انہیں جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی لکھی۔ اور اوّل الذکر میں فرد کی شخصیت کے ذاتی یا انفرادی پہلو کی اور آخر الذکر میں اس کی شخصیت کے اجتماعی یا عمرانی پہلو کی تربیت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جس طرح فرد پیدا ہوتا ہے اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی ہیں یعنی قوموں کی تخلیق میں وہی قانون کارفرما ہے جو فرد کی تخلیق میں ہے۔ وہ یہ کہ جب:

الف۔ زندگی کسی قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے تو فرد موجود ہو جاتا ہے۔

ب۔ وہی زندگی (بصورت افراد) جب کسی مرکز پر مجتمع ہو جاتی ہے تو قوم وجود میں آجاتی ہے۔

بالفاظ دیگر:

الف۔ زندگی جب کسی تن سے مربوط ہو جاتی ہے تو اسے فرد کہتے ہیں۔

ب۔ وہی زندگی جب کسی مرکز سے وابستہ ہو جاتی ہے تو اسے قوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ:

۱۔ جماعت کے بغیر فرد اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کرسکتا ہے۔

۲۔ افراد کے بغیر جماعت کا وجود متحقق نہیں ہوسکتا ہے۔

اقبال اپنے خطبات میں یوں لکھتے ہیں:

جماعت کے ساتھ منسلک رہنے سے فرد میں مشاہدہ کی قوّت اور جذبات کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور

ارادہ میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔[۱]

ملت افراد کے اختلاط و آمیزش سے پیدا ہوتی ہے اور ان کی تربیت کی تکمیل نبوت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ اگر چہ فرد کی فطرت مائل بہ یکتائی ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی سے ہی ممکن ہے۔ الختصر فرد کی بقاء ذات خداوندی سے اور ملت کی زندگی رسالت سے وابستہ ہے۔ اور شعر کے پردے میں اسی بات کو علامہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی[۲]

ملت ابراہیمؑ کی بنیاد وطنیت کے محدود مادی تخیل پر قائم نہ تھی، بلکہ اس کا سب سے پہلا جز وتوحید تھا۔ اس لیے ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی جن روحانی ارکان و اصول سے ہوتی ہے ان میں سب سے سب مقدم یہی توحید ہے؛ توحید کے بعد اس ملت کا دوسرا روحانی عنصر نبوت اور رسالت ہے، کیوں کہ اس ملت کو حضرت ابراہیمؑ نے پیدا کیا تھا اور وہ پیغمبر تھے۔ اس لیے وہ رسالت سے عالم وجود میں آئی اور رسالت ہی کی آغوش میں نشو و نما پائی۔ امت کا ابتدائی و انتہائی سلسلہ دو پیغمبروں کی ذات سے ملا ہوا ہے۔ ان دونوں اجزاء یعنی توحید و رسالت کی بنا پر ملت اسلامیہ کسی خاص ملک، کسی خاص مقام اور کسی خاص خطہ تک محدود نہیں ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کلمہ پر اس کی بنیاد رکھ کر ایک ''ملتِ گیتی نورد'' پیدا کر دی ہے۔

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد[۳]

میں سمجھتا ہوں کہ اسرار خودی کی بنیاد کلمہ طیبہ کے پہلے جزو ''لا الٰہ الا اللہ'' اور رموز بیخودی کی بنیاد کلمہ کے دوسرے جزو ''محمدؐ رسول اللہ'' پر استوار ہے۔ قومیت کی پیدائش، افراد کی اجتماعی کیفیت سے ہوتی ہے۔ اور اجتماعی کیفیت صرف نبوت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی یقین منتشر افراد کو ایک سلسلہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ اور غایت محمدؐ یہ کی اساس ''حریت، مساوات اور اخوت'' ان سہ گانہ اصولوں پر قائم ہے۔ یعنی کہ؛

۱۔ توحید سے حریت پیدا ہوتی ہے۔
۲۔ حریت کا منطقی نتیجہ مساوات نسل انسانی ہے کیونکہ جب تمام انسان ایک خدا کے بندے ہیں اور کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہیں ہے تو لامحالہ سب انسان برابر ہیں۔
۳۔ مساوات کا منطقی نتیجہ اخوت ہے کیونکہ اگر تمام انسان ہم مرتبہ ہیں تو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

رموز بیخودی کے آخر میں علامہ نے سورۃ اخلاص کی تفسیر میں دونوں مثنویوں کے افکار کا خلاصہ

مجمل شکل میں بیان کیا ہے۔اس سورۃ کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان کیا ہے کہ وہ (۱) احد ہے، (۲) صمد ہے، (۳) لم یلد ولم یولد ہے، (۴) لم یکن لہ کفواً احد؛ کا مصداق ہے۔لیکن اقبال نے ان صفات اربعہ سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ:

۱۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے یکتا ہے،مسلمان کوبھی اپنے اندر بقدر بشری یکتائی کی شان پیدا کرنی چاہیے۔

۲۔ جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے یعنی کسی طاقت کامحتاج نہیں ہے،اسی طرح مسلمان کوبھی اپنے اندر شان ِبے نیازی پیدا کرنی چاہیے۔

۳۔ جس طرح خدامادی علائق سے پاک ہے اسی طرح ملتِ اسلامیہ کوبھی وطن،نسب،رنگ اورنسل کے امتیازات سے بالاتر ہونا چاہیے۔

۴۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔اسی طرح ملت اسلامیہ کو ایسی سربلندی حاصل کرنی چاہیے کہ کوئی قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کرسکے۔

رموز بیخودی...... قیامِ پاکستان

حضرت حکیم الامت نے رموزِ بیخودی میں ملت اسلامیہ کے مختلف اجزائے ترکیبی اور اس کی مجموعی حیثیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔اور بتایا ہے کہ حیاتِ ملی کا کمال یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد ایک مخصوص آئین کی پابندی سے اپنے جذبات ورجحانات کی حدیں مقرر کریں۔تاکہ انفرادی اعمال کا اختلاف ہوکر ساری قوم یکسانیت واشتراک عمل وقول پیدا ہوجائے۔اس مثنوی کالبّ لباب یہ ہے کہ دین اسلام کسی ایک شخص کا دین نہیں ہے،اور نہ دوسرے مذاہب کی طرح پوجا پاٹ کا نام ہے۔بلکہ حیاتِ انسانی کی ایک مخصوص مجموعی شکل کا نام''دین اسلام'' ہے۔اوراس دین کا دستور العمل ایک ایسا قانون ہے کہ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے،تو ملت اسلامیہ کا فرد نہیں کہلا سکتا۔اور نہ اپنی خودی کومعراجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔اس لیے ضروری ہے،کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اس دستور کے احکام کی پابندی کریں۔

خودی کے ارتقاء کا طریقہ اقبالؒ نے رموز بیخودی میں بیان کیا ہے۔تفصیلات کے بغیر اس کوبھی حسبِ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے:

۱۔ فرد کی خودی کے''ارتقاء'' کا عملی ذریعہ، اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ایک ایسے معاشرے کا قیام جس کی بنیادہی انسان کی فطرت صحیحہ میں گہرے طور پر پیوست ہوں۔یہ بنیادیں ان کے نزدیک دو ہیں:۔

(الف)　ایمان باللہ

(ب)　ایمان بالرسول

ایمان باللہ کے تعلق سے ان کا خیال تھا کہ اللہ کی اطاعت خود انسان کی اپنی فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول کی ذات اجتماعی زندگی کا محور ہوتی ہے۔ اور وہی ہے جو فطرت صحیحہ کے اصولوں پر معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ ان دو بنیادوں کے علاوہ اس معاشرہ میں مندرجہ ذیل پانچ خصوصیات ہونی چاہئیں جو انسان کی فطری امنگوں کے عین مطابق ہیں:

(ا) اخوت　(ب) مساوات　(ج) حریت

(د) عالمگیریت (یا نہایت مکانی)　(ھ) ابدیت (یا نہایت زمانی)

اوّل الذکر تین معاشرہ کی داخلی خصوصیات ہیں اور باقی دو خارجی خصوصیات ہیں۔

۲۔　اس معاشرہ کے لیے ایک آئین اور دستور کا ہونا ضروری ہے اور یہ دستور بھی مثالی اور فطری ہونا چاہیے۔ یہ دستور اقبال کی نظر میں قرآن مجید ہے۔

۳۔　اس معاشرہ کے لیے ایک نصب العین ہونا چاہیے اور یہ نصب العین بھی نہایت اعلیٰ وارفع ہونے کے ساتھ ساتھ فطری ہونا چاہیے۔

اقبال کی نگاہ میں یہ بلند ترین فطری آدرش ہے ''حفظ ونشر توحید''۔

۴۔　اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح فرد کی خودی ہوتی ہے اسی طرح معاشرہ (ملت یا قوم) کی بھی ایک خودی ہوتی ہے، جس کو وہ ''اجتماعی خودی'' یا ''قومی خودی'' کا نام دیتے ہیں۔

۵۔　انفرادی خودی اس ملی یا قومی خودی سے ہم آہنگ ہو کر ہی منازل ارتقاء طے کرتی ہے اور یہی ہم آہنگی اور ربط واختلاط ہی ''بے خودی'' ہے۔ اقبال کی نظر میں فرد و معاشرہ میں ربط اور ہم آہنگی بے حد ضروری ہے، کہ فرد، معاشرہ یا ملت سے الگ تھلگ رہ کر اپنی خودی کو اس فطری بلندیوں تک نہیں پہنچا سکتا۔ وہ الگ تھلگ رہے گا تو اپنی خودی کے خول کے اندر بند رہے گا؛ ملت سے پیوستہ یا ہم آہنگ ہوگا تو اس خول کو توڑ کر اپنی خودی کو ارتقاء کی منزلوں تک پہنچائے گا۔

در　جماعت　خود　شکن　گردد　خودی
تاز　گلبرگے　چمن　گردد　خودی[۴]

ملت سے یہ ربط و پیوستگی خودی کے ارتقاء کے لیے اقبال کی نظر میں ایک ناگزیر منزل ہے۔

۶۔　جب خودی کے ارتقاء کے لیے فرد و معاشرہ (ملت وقوم) کا باہمی ربط یا ہم آہنگی ضروری قرار پائی تو اس ہم آہنگی میں توازن بھی ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ معاشرہ (ملت وقوم) فرد کو دبوچ لے یا فرد معاشرہ

(ملت وقوم) کی گردن پر سوار ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں خودی کا نقصان ہے۔ پہلی صورت میں خودی گھٹ کو رہ جاتی ہے تو دوسری صورت میں خودسر بن جاتی ہے۔ یہ توازن اگر انہیں کہیں نظر آتا ہے تو اسلام کے آئین حیات میں۔ یہاں صرف توازن ہی نہیں بلکہ انتہائی درجہ کا توازن وتوافق ہے۔ اسی لیے وہ فرد کو ایسی ہی ملت ربط واتصال پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

یہ ہے ''ارتقائے خودی'' کا فلسفہ یا طریقہ جو انہوں نے رموز بیخودی میں پیش کیا ہے۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال نے ارتقائے خودی کے لیے جس معاشرہ کا تصور پیش کیا اس میں شک نہیں کہ وہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ ہے۔ تاہم معاشرہ کا یہ تصور اقبال نے محض کسی عصبیت کی بناء پر نہیں بلکہ صرف اور صرف ارتقائے خودی کے مسئلہ کے عملی حل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہی بات انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری فارسی نظموں (مراد اسرار خودی ورموز بے خودی) کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں، بلکہ میری قوت طلب وجستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے۔ اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید، ذات پات، رتبہ ودرجہ، رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔[۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال بہت بڑے شاعر اور عظیم مفکر وفلسفی تھے۔ اسرار و رموز پر عموماً اقبال کی اعلیٰ ترین فکری وشعری تخلیق کی حیثیت ہی سے نظر ڈالی جاتی رہی ہے اور یہ ہے بھی ان کا نہایت ہی بلند پایہ فکری وشعری کارنامہ۔ تاہم وہ ان شعراء میں سے نہ تھے جو صرف اپنے تخیل کی بلند پروازیوں میں گم رہتے ہیں، اور وہ ایسے فلسفی ومفکر بھی نہ تھے جو اپنے افکار ونظریات کی بھول بھلیوں کھو جاتے ہیں، انہوں نے زندگی کے حقائق کا نہایت گہرے فلسفیانہ انداز سے کھوج لگایا اور پھر ان حقیقتوں کو شعر کا آب ورنگ بخشا تھا۔ اور ایسا انہوں نے صرف اس لیے کیا کہ ان حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ذوق وشوق سے ان کا نہ صرف مطالعہ کریں بلکہ ان پر عمل پیرا ہوں۔ غور سے دیکھئے تو ان کی یہ فکری وشعری تخلیق دراصل ایک عملی منصوبہ ہے، خودی کے استحکام وارتقاء کا یہ منصوبہ انہوں نے بیسویں صدی کے دوسرے عشرہ (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۸ء) میں پیش کیا۔ یہ پہلی عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ اس جنگ اور اس کے مابعد دور کے متعلق ان کا اپنا تاثر یہ تھا کہ؛

> یہ ایک قیامت تھی۔ جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب تہذیب وتمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔[۶]

اقبال نے ایسے پرآشوب اور قیامت خیز زمانہ میں اپنا یہ عملی منصوبہ پیش کیا۔شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ، اقبال کے انداز ہ و معیار کے مطابق، یہ''نیا آدم'' وہی ہوسکتا ہے جس کی خودی مستحکم ہوچکی ہو اور یہ ''نئی دنیا'' وہی ماحول یا معاشرہ ہوسکتا ہے جس میں رہتے ہوئے یہ ''آدم'' اپنی خودی کو اس انتہائی بلندیوں تک پہنچا سکے۔خیر یہ تو ایک تصوری یا تخیل بات تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ ایک خواب تھا جو'شاعر' اقبال نے اپنے محاکاتی تخیل کی مدد سے دیکھا تھا۔اور ہر بڑا شاعر اور ہر عظیم فلسفی خواب تو دیکھا ہی کرتا ہے۔مگر اقبال نے اپنے اس خواب کی عملی تعمیر بھی پیش کی۔انہوں نے ایک ''نئی دنیا'' کی تعمیر کا نقشہ ـــ گو چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی ـــ پیش کیا تا کہ آنے والا ''نیا آدم'' اپنی خودی کو بلند تر کر سکے۔

اقبال نے پہلی عالمی جنگ کے دوران خودی کی تربیت، استحکام اور ترقی کا یہ عمل منصوبہ پیش کیا، لیکن شاید اس کا خاکہ ان کے ذہن میں ۱۹۰۸ء کے بعد ہی سے وہ ''اسلامی قومیت'' کا آوازہ بلند کرنے لگے تھے۔اور یہ اسلامی قومیت اس مثالی معاشرہ کا عملی مظہر تھی جس کا نقشہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں اپنی مثنوی رموز بیخودی میں پیش کیا ہے۔اس زمانہ میں برصغیر جنوبی ایشیاء پر برطانیہ کی حکومت تھی جس کا نقشہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں اپنی مثنوی رموز بیخودی'' میں پیش کیا ہے۔اس زمانہ میں برصغیر جنوبی ایشیاء پر برطانیہ کی حکومت تھی۔کچھ عرصہ قبل اس حکومت سے گلوخاصی کی تحریک شروع ہوگئی تھی، اس تحریک میں برصغیر کے رہنے والے ہندو مسلمان سبھی شریک تھے۔اسی لیے متحدہ وطنی قومیت اس کی بنیاد قرار پائی۔عملی سیاست کی خارزار راہوں سے یہ تحریک گزرتی رہی۔

علامہ اقبال نے ۱۹۲۴ء تک ملک کی سیاست میں کوئی قابل ذکر عملی حصہ نہیں لیا، بجز اس کے وہ اس وطنی قومیت کے خلاف اسلامی قومیت کا دم بھرتے رہے۔۱۹۲۴ء میں انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔کل ہند سیاست میں جو مدوجزر پیدا ہوتے رہے ان پر انہوں نے گہری نظر رکھی اور ان میں بھی انہوں نے عملاً حصہ لیا۔۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوئی، جس سے برصغیر کی سیاست میں بھونچال سا آ گیا اور اس بھونچال نے ''متحدہ قومیت'' کے تصور کو پاش پاش کر دیا۔پھر یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ برطانیہ سے گلوخلاصی کی جو تحریک اس متحدہ قومیت کی بنیاد پر چلائی جا رہی تھی، وہ اپنے منطقی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد عملاً تمام باشندگان برصغیر کے لیے آزادی کا پیام نہ لائے گی بلکہ وہ ایک مخصوص گروہ یا طبقہ کو دوسرے گروہ پر اپنا مکمل اور مستقل تسلط جمانے کا موقع فراہم کرے گی۔

بحرِ سیاست کے اس طوفان میں اقبال اسلامی قومیت کے لنگر کو مضبوطی سے تھامے رہے اور متحدہ قومیت کی پرشور موجوں کے تباہ کن اثرات سے ہر ایک کو آگاہ کرتے رہے۔۱۹۲۸ء میں، نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد، علامہ اقبال کے بیان کردہ خطرات اور اندیشے سب کو بالعموم اور اس گروہ کو بالخصوص بچشم

سر نظر آنے لگے جس سے اقبال نے اپنے مثالی معاشرہ کے قیام کی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اب برصغیر کی سیاست ایک موڑ پر آ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو ۱۹۰۸ء ہی سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ خودی کو پروان چڑھانے کے لیے جس معاشرہ کا تصور ان کے ذہن میں ہے وہ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی برصغیر میں قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ متحدہ قومیت کا وہ تصور تھا جس پر کل ہند کانگریس نے اپنی تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ابتداء ہی سے اس کے خلاف رہے لیکن بحر سیاست میں جو لہریں اٹھتی ہیں ان کے نتائج فی الفور نہیں، کچھ عرصہ بعد ظاہر ہوتے ہیں۔

اب ۱۹۲۸ء میں، نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد، یہ نتائج سامنے آ گئے تھے۔ متحدہ قومیت کا اصلی رنگ وروپ ظاہر ہو چکا تھا۔ اقبال نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنی اس تجویز کا علی الاعلان سب کے سامنے پیش کر دیں جس کے ذریعہ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے معاشرہ کا قیام، پورے برصغیر میں نہ سہی تو اس کے بعض گوشوں میں، ممکن ہو سکے گا جہاں ان کے تصور کے مطابق خودی کے استحکام وارتقاء کے مواقع بہم پہنچائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنی وہ معرکہ آراء تجویز پیش کر دی جس نے برصغیر کی تاریخ کے دھارے کے رخ کو موڑ دیا۔ ان کی اس تجویز کو ان ہی کے الفاظ میں سنیے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد مملکت بنا دی جائے۔ برطانوی سلطنت کے اندر حکومت خود اختیاری ملے یا برطانوی سلطنت سے باہر، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم ومتحدہ مسلم مملکت کی تشکیل مسلمانوں۔۔۔ کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں۔۔۔ کے لیے بالآخر مقدر ہو چکی ہے۔[۷]

پھر اس مملکت کے قیام کی غرض وغایت بھی انہوں نے اسی خطبہ میں یہ بیان کی:

برصغیر ہند دنیا میں سب سے بڑا مسلم بلاک ہے۔ اس ملک میں اسلام کی زندگی، بحیثیت ایک تمدنی قوت کے، بڑی حد تک اس امر پر منحصر ہے کہ اس کو ایک مخصوص رقبہ میں مرتکز کر دیا جائے۔[۸]

گویا اسلام کا تمدنی قوت کی حیثیت سے ارتکاز ہی اس مملکت کے قیام کا مقصدِ اولین ہے۔ تمدنی قوت کی حیثیت سے اسلام کے ارتکاز کی توضیح بھی انہوں نے ان الفاظ میں کی؛

میں ایک مستحکم ومتحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے اسلام کے لیے ایک ایسا موقع حاصل ہوگا کہ وہ اس ٹھپہ سے نجات حاصل کرے جو عرب شہنشاہیت نے اس پر لگا دیا ہے اور اپنے قانون، اپنی تعلیم، اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور انہیں اپنے اصلی مزاج اور عصرِ حاضر کی روح سے قریب تر کر دے۔[۹]

اس مملکت کے مقاصد کی وضاحت سے قبل انہوں نے اسی خطبہ صدارت کے ابتدائی حصہ میں اسلام کی بحیثیت ایک نظام معاشرت و سیاست نہایت عالمانہ انداز میں تشریح کی۔ غور کرنے کی یہ بات ہے کہ اس وقت وہ ملک کی ایک سیاسی جماعت کے سالانہ اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ جماعت مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم تھی، کوئی علمی ادارہ یا تبلیغی مجلس نہ تھی۔ اس کا مقصد تو مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا اس وقت کے حالات میں تحفظ کرنا تھا۔ عموماً سیاسی جماعتوں کے سالانہ اجلاسوں اور کانفرنسوں کے خطبہ ہائے میں اس قسم کی خالص علمی باتیں نہیں کی جاتیں، وہاں تو حالات حاضرہ پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اور اسی کی روشنی میں جماعت کی حکمت عملی (پالیسی) کو مرتب کرنے کے لیے خطوط واضح کیے جاتے ہیں۔ لیکن اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں اس روایت کو بڑی حد تک توڑا۔ انہوں نے اس وقت کے سیاسی حالات پر گفتگو تو ضرور کی اور اپنی جماعت کی پالیسی کو متعین کرنے کے لیے بعض امور کی نشاندہی بھی کی، لیکن خطبہ کا آغاز اسلام کے معاشرتی و سیاسی نظام کی وضاحت سے کیا۔ اپنے خطبہ صدارت کا ایک تہائی حصہ انہوں نے اسی علمی گفتگو کے لیے مختص کر دیا۔ اس کے بعد والے حصہ میں بھی انہوں نے اس وقت کے سیاسی حالات پر اپنی جماعت کے نقطہ نظر سے بحث ضرور کی، لیکن بیچ بیچ میں حسبِ موقع وہ اسلام کے معاشرتی و سیاسی نظام کی مختصراً تشریح کرتے گئے۔ اگر ایک ایسا شخص جو اقبال کے بنیادی افکار سے قبل از قبل واقف نہ ہو اس خطبہ کا مطالعہ ایک سیاسی تقریر کی حیثیت سے کرے تو غالبًا اس کو مایوسی ہوگی۔ شاید وہ آغاز ہی میں اکتا جائے، کیونکہ اس کے ابتدائی حصہ میں سیاست تو بالکل ہے ہی نہیں، ہاں علمیت ضرور ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال نے یہ انداز تخاطب کیوں اختیار کیا؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ مخاطب کے ذہن کو اس تجویز کے سننے اور اس کی معنویت پر غور کرنے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ جو انہوں نے اپنے خطبہ صدارت کے تقریباً آخری حصہ میں پیش کی، یعنی برصغیر جنوبی ایشیا میں ایک متحدہ، مستحکم مسلم مملکت کا قیام۔

اقبال کے کلام، بالخصوص فارسی مثنویوں (اسرار خودی اور رموز بیخودی)، کو پڑھیے پھر ان کے اس خطبہ صدارت کے اس ابتدائی حصہ کی عالمانہ بحث پر غور کیجیے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ایک ہی ذہن ہے جو شاعری اور سیاست میں کام کر رہا ہے۔ وہاں جس معاشرہ کا تصور انہوں نے تخیل کے رنگ میں رنگین کر کے نظم کے ذریعہ پیش کیا ہے، اسی تصور کو یہاں نثر میں پیش کیا گیا ہے۔ وہاں تفصیل ہے تو یہاں قدرے اجمال ہے۔ وہاں خطاب دل سے ہے تو یہاں دماغ سے۔

مثنوی اسرار و رموز میں بیان کردہ حقائق کے پس منظر میں اگر اقبال کے خطبہ صدارت کے ابتدائی حصہ، پھر اس کی مسلم مملکت والی تجویز اور اس کے اغراض و مقاصد کی تشریح پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک مربوط سلسلہ فکر ہے۔ اسرار و رموز خودی کے استحکام و ارتقاء کا ایک منصوبہ ہے تو

مسلم مملکت کا قیام اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کی ایک تجویز۔ پہلے وضاحت کی جاچکی ہے کہ اقبال نے اسرار میں انفرادی خودی کو مستحکم کرنے پر زور دیا ہے۔ اور اس کے گر بتائے ہیں۔ رموز بے خودی میں انہوں نے خودی کے ارتقاء کا طریقہ بتایا ہے اور وہ طریقہ، جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ہے، یہ ہے کہ فرد ایک ایسے مخصوص معاشرہ (قوم یا ملت) کا رکن بن جائے جس میں ان کی بیان کردہ خصوصیات اور خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ پھر فرد کی خودی اور اس معاشرہ (قوم یا ملت) کی خودی میں کمال درجہ کی ہم آہنگی اور باہمی ربط بھی ہو اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معاشرہ شاعر کے خلائی ذہن میں ہی رہے گا یا اس کو منصۂ شہود پر کہیں جلوہ گر کیا جائے گا؟ ایسا معاشرہ کسی کرۂ فضائی یا خلا میں تو قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو برپا کرنے کے لیے تو کرۂ ارض ہی کا کوئی خطہ چاہیے۔

اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک متحدہ و مستحکم مسلم مملکت کے قیام کی تجویز کے ذریعہ ایک ایسے ہی خطہ کا تعین کیا تھا جہاں اس قسم کا معاشرہ تعمیر کیا جاسکے، جس کو وہ مثالی معاشرہ قرار دیتے ہیں اور جس کا نقشہ انہوں نے رموز بے خودی میں پیش کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں اقبال کے ذہن میں جو مملکت کا تصور ابھرا تھا، اس کا محرک دراصل خودی کے استحکام و ارتقاء کا وہ منصوبہ تھا، جو انہوں نے اپنی مثنویوں میں ۱۹۱۸ء میں پیش کیا تھا۔ بالفاظ دیگر اقبال کے پیش کردہ منصوبہ استحکام و ارتقائے خودی کی عملی صورت گری کا دوسرا نام پاکستان ہے۔

رموز بیخودی ـــــ استحکامِ پاکستان

علامہ اقبال تجدید و احیاء دین کی جدوجہد کی سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہیں ان کی دعوت یہ ہے کہ دین اسلام کو از سر نو نظام زندگی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اقبال کا نظریاتی نظام اسلام ہے۔ اس کی مثالی ہیئت حاکمہ خلافت راشدہ ہے اس کے آئیڈیل ہیرو خلفائے راشدینؓ ہیں۔ اس لیے اقبال کی نظریاتی قومیت، اخلاقی نصب العین، اصولی مؤقف رکھتی ہے وہ نسل، زبان، خطے، رنگ یا قبیلے میں قومیت تلاش نہیں کرتا۔ نظریے کے اندر اصولِ اجتماعیت تلاش کرتا ہے۔ اور چوں کہ پوری بنی نوع انسان کے پاس ایک نظریاتی نصب العین جو اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے صرف اسلام ہی ہے۔ اس لیے وہ اسلام کے بین الاقوامی کردار کو ساری دنیا کے سامنے پیش کر کے اسلام کے اخلاقی نصب العین کی طرف دعوت دیتا ہے۔

> اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کرسکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔[۱۰]

آگے چل کر انھوں نے کہا کہ:

اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی پر مبنی ہو۔[۱۱]

اقبال اپنے مطالعہ کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی بقاء کا راز اسلامی نصب العین میں ہی پوشیدہ ہے۔ اگر مسلمان اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد سے دستبردار ہوگئے تو وہ تاریخی قوتوں کے ریلے میں بہہ جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہوجانے سے انہیں کوئی چیز بھی نہیں بچا سکے گی۔ انہوں نے اپنے خطبے میں کہا؛

ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ منتشر اور پراگندہ قوتیں ازسرِ نو جمع ہوجائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت سے محفوظ ہوجائے گا۔[۱۲]

اس لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا نظامِ مملکت موجود ہو جو معاشرے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو اور اسلام کے سوا یہ خوبی کسی نظام میں بھی نہیں ہے۔ اسلام جس قدر زندگی کے مختلف گوشوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اسی قدر اس کی ہم آہنگی یک رنگی نیز گوناگوں بوقلمونی انسانی زندگی کو برکات وحسنات سے معمور کر دیتی ہے۔ اقبال جس مملکت کا خواب دیکھتے ہیں وہ مساوات انسانی کا مثالی نمونہ ہے۔ چنانچہ کہا کہ:

اسلام، اب بھی ایسی دنیا پیدا کرسکتا ہے، جہاں انسان کا معاشرتی درجہ، اس کی ذات، رنگ اور اس کے کمائے ہوئے منافع کی مقدار سے معین نہ ہوتا ہو، بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غرباء مالداروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں۔ جہاں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر ہو، جہاں نجی ملکیت ایک ٹرسٹ کی حیثیت رکھتی ہو اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اس طرح اجازت نہ دی جائے کہ وہ اصلی دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کرلے۔[۱۳]

اسلامی مملکت کے بارے میں اقبال کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے بین الاقوامی ہے۔ اس میں رنگ ونسل اور علاقہ وجغرافیہ کی محدودیتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے:

عالم اسلامی کا ظہور ہوگا تو آزاد اور کودمختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق وتطابق سے بدل دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام ہے جس نے ہمارے خود پیدا

کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم بھی کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لیے۔[۱۴]

انھوں نے اپنی وفات سے صرف چار ماہ پہلے ایک پیغام دیتے ہوئے فرمایا؛

جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کو مٹایا نہ جائے گا، اجب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیاں اللہ کے اصول کا قائل نہ ہوجائے گا اور جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے امتیازات محو نہ ہوجائیں گے اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر نہ کرسکیں گے اور نہ اخوت وحریت ومساوات کے عظیم الفاظ شرمندہ ہوں گے۔[۱۵]

ایک موقعہ پر انہوں نے اسلامی مملکت کے فرائض کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا:

حکومت کا تو سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اخلاق کی حفاظت کرے لیکن آج کل کی حکومتیں تو صرف لوگوں کے سیاسی خیالات ورجحانات کی نگرانی اور احتساب کا کام ہی کرتی ہیں۔[۱۶]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر یہ بات بہت اچھی طرح واضح تھی کہ اسلام ایک نظام مملکت ہے اور ایک مملکت کے وجود کے بغیر اسلام کا عملی تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس نوبت پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی سوسائٹی خودی کے ارتقاء کے لیے سازگار ہے۔ اور کونسا معاشرہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے؟ ۔۔۔۔ اقبال کے نزدیک آئیڈیل سوسائٹی اور استحکام پاکستان کے لیے امورِ ذیل کی ضرورت ہے:۔

۱۔ روحانی اقدار مثلاً اصول وحدت کی بنیاد پر قائم کی جائے۔
۲۔ رسالتؐ اس کا محور ہو۔
۳۔ اس کا اپنا نظامِ حیات ہو۔
۴۔ اس کا ایک مرکز ہو۔
۵۔ ایک نصب العین اس کے سامنے ہو۔
۶۔ تسخیر فطرت اس کی جدوجہد میں شامل ہو۔
۷۔ وہ اپنی روایات کو محفوظ رکھتی ہو۔
۸۔ امومت کا وہ احترام کرتی ہو۔

وحدت

کسی عظیم تر ملت کی تعمیر کے لیے روحانی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے، یہ مضبوط بنیاد ہمیں صرف وحدت کی تصور ہی مل سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

جدید تمدن عالمی اتحاد کے لیے اصولِ توحید کو بنیاد بنا سکتا ہے۔ اور اسلام ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت

سے اس اصول کو انسانی ذہن میں زندہ شکل دے سکتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق خدا کے ساتھ وفاداری ضروری ہے نہ کہ تخت وتاج کے ساتھ۔ اس لیے باری تعالیٰ سے وفاداری کا مطلب انسان کی خود اپنی فطرت کے ساتھ وفاداری ہے۔[۱۷]

عقیدۂ توحید ایک فطری عقیدہ ہے جو نہ صرف فرد کے لیے قابل قبول ہے بلکہ ملت کو ایک ایسی نفسیاتی اساس بھی فراہم کرتا ہے جس پر اخلاقی قدروں کی تعمیر سے قوم کو طاقت اور عظمت حاصل ہو سکتی ہے۔ وہی دین و مذہب، علم وحکمت، آئین وستور، فکر وتجسس اور جذبات عشق ومحبت انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں جن کہ بنیاد اصولِ وحدت پر رکھی گئی ہو، عقیدۂ توحید انسان کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے اور اس کے جذبۂ عمل کو بڑھاتا ہے۔ اس کے خوف اور ہراس کو زائل کرتا ہے اور اس کے ضمیر کو روشن اور مقامِ عبدیت کو محکم کر کے رموزِ کائنات کو اس پر منکشف کر دیتا ہے:

اہل حق را رمزِ توحید ازبر است در اتی الرحمٰن عبداً مضمر است
چوں مقامِ عبدہ محکم شو کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[۱۸]

عقیدۂ توحید تمام رجعت پسند قوتوں کا ازالہ کرتا ہے، استوار بنیادوں پر انسانی ذہن کی تربیت کرتا ہے، اور انسان کے لیے ایسی روحانی قدریں فراہم کرتا ہے کہ جن سے ملت کو اتحاد اور استقلال نصیب ہو سکتا ہے۔ لا الہ کا تصور انسانی فکر کے لیے ایک مشترک اساس بہم پہنچاتا ہے جس کی بدولت افراد کا احساس بیگانگی رفع ہو کر اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ جو عظیم تر ملت کے قیام کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہی قوم پھول اور پھل سکتی ہے جس کے اغراض و مقاصد مشترک ہوں، جس کے جذبات و وجدانات یکساں ہوں اور جس کے خیر وشر کے معیار میں مکمل آہنگی ہو:

ملت بیضائے تن و جاں لاالہٰ سازِ مارا پردہ گرداں لاالہٰ
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدّعا باید یکے

جذبہ باید در سرشت او یکے
ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے[۱۹]

سید سلیمان ندوی اپنے مقالے ''ڈاکٹر اقبال کا علمِ کلام'' میں لکھتے ہیں:

نظری حیثیت سے توحید باری کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں کہ صرف ایک خدا کے وجود پر اعتقاد رکھا جائے لیکن عملی حیثیت سے جب تک توحید کے ماننے والوں میں عملی اتحاد نہ ہو، محض یہ اعتقاد ناکافی ہے اور اس سے کوئی متحدہ تہذیب، متحدہ تمدن، متحدہ معاشرت اور متحدہ نظام اخلاق پیدا ہو سکتا۔۔۔۔ڈاکٹر اقبال نے توحید باری کی بنیاد اس اتحاد پر رکھی اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے توحید پر جو غیر معمولی زور دیا ہے، اس کا

مقصد مسلمانوں میں اتحادِ عمل پیدا کرنا تھا۔[20]

اس کے بعد سید سلیمان ندوی اقبالؒ کے کلام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

توحید وحدت افکار اور وحدت کردار کے مجموعے کا نام ہے۔ مکی زندگی رسول اللہ ﷺ نے توحید کی جو تعلیم دی، اس کا تعلق صرف وحدت افکار سے تھا۔ لیکن اس تعلیم نے جب چھوٹی سی ایک متحد الخیال جماعت پیدا کر دی اور آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہیں فرائض و احکام کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں اور وحدت کردار کا دور شروع ہوا۔ وحدت کردار سے مسلمانوں کی عملی زندگی شروع ہوئی اور انہوں نے مشرکان عرب، عیسائیان روم اور یہودان خیبر وغیرہم کی طاقت کو پاش پاش کر کے اپنا ایک متحدہ نظم سلطنت قائم کر لیا اور ایک زندہ قوم بن گئے۔[21]

رموز بے خودی کی روشنی میں توحید پر عامل ہونے کے فوائد و ثمرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ موحد ہر وقت راہِ حق میں جدوجہد کرتا رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی زندگیوں سے دو چیزوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دو خوبیاں اسکے اندر پیدا ہو جاتی ہیں:

(ا) وہ خوف اور شک سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

(ب) انسان نفسیاتی اعتبار سے اُن تمام اخلاقی عیوب جس کی بنیاد خوف ہے (مثلاً خوشامد، مکاری، چاپلوسی، عیاری، کینہ، جھوٹ، فریب و ضمیر فروشی) توحید کی بدولت ان سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔

۳۔ عمل پر کمربستہ ہو جاتا ہے اور ضمیر کائنات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ جب مسلمان کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مجھے کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔

۵۔ توحید ملت کے افراد میں وحدتِ افکار پیدا کر دیتا ہے۔

۶۔ اگر قوم بہ حیثیت مجموعی توحید اختیار کریں تو کائنات پر حکمران ہو سکتی ہے۔

۷۔ توحید میں یہ تاثیر ہے کہ اسود کو احمر کر سکتی ہے یعنی نسل اور رنگ کے امتیازات کو فنا کر دیتی ہے۔

توحید اگر ہمارے زندگی کے ہر شعبے میں نفوذ کر جائے تو پھر ہم یک نما، یک بین، یک اندیش ہو سکتے ہیں۔ ہمارا مدعا، ہمارا مال، ہمارا خیال کا انداز بھی ایک ہے تو پھر تمام افراد میں وحدت کا رنگ پیدا ہو جائے گا اگر ملت اسلامیہ کو جسم قرار دے دیا جائے تو توحید اس کے لیے بمنزلہ روح ہوگی۔

رسالت

اقبال کہتے ہیں کسی ملت کی کامیابی کی ضمانت صرف الہامی قیادت (Inspired Leadership) ہی سے ہو سکتی ہے جس کی بہترین شکل رسالت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہماری ملت کی بنیاد رکھی۔ اس ملت کی قیادت اللہ کے رسولوں کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی بن کر

آئے اور دنیا کے لیے ایک واضح شریعت اور ایک مکمل نظام حیات عطا کر گئے:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولؐ ما رسالت ختم کرد[۲۲]

رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت تمام اختلافات کو مٹا کر سوسائٹی کی تقویت میں ممد ومعاون ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام کا ہم پر یہ احسان ہے کہ ان کے عشق نے ہم سب کو ہمنوا اور ہم مدعا کر کے ہماری ملت کو وحدت اور زندگی بخشی ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما　　　　ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود　　　　پختہ چوں وحدت شود ملت شود[۲۳]

جب کوئی ملت رنگ ونسل، وطن وجغرافیہ کی مادی بنیادوں پر نہیں بلکہ وحدت اور رسالت کی اساس قائم ہوتی ہے تو وہ زمان ومکان کی تحدیدات سے آزاد ہو کر ابدی اور لافانی ہو جاتی ہے۔ وہ اندرونی مرکز گریز عناصر کو کچل دیتی ہے۔ اور بیرونی دشمن کا قلع قمع کر کے موت کے حملوں کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی اُمت کا جوہر جغرافیہ اور مقام سے وابستہ نہیں رہا۔ آپؐ کے غلام دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلتے چلے گئے۔ مسلمانوں کی اذانیں بر و بحر اور کوہ وصحرا میں گونجتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ طارق بن زیاد نے اندلس پر اپنی فوجیں اُتار دیں اور دشمن کے ساحل پر اپنے جہازوں کو آگ لگا دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ وطن کو واپسی کی کیا صورت ہوگی جبکہ سفینہ نذرِ آتش ہو چکا ہے اور یہ ترکِ سبب شریعت میں کہاں جائز ہے۔ طارق کی آنکھوں میں بجلی کی چمک پیدا ہوئی ایک ملکوتی تبسم اس کے ہونٹوں پر رونما ہوا، اور اُس نے اپنی تلوار کو نیام سے کھینچتے ہوئے کہا کہ کرۂ ارض کا چپہ چپہ جس پر کہ خدائے قدوس کی حکومت ہے، غلامانِ محمدؐ عربی کا اپنا وطن اور اپنا گھر ہے:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت　　　　گفتند کارِ تو بہ نگاہ خرد خطاست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت　　　　ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست[۲۴]

رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے ملتِ اسلامیہ کی اساس کو منکشف فرمایا اور یہی واضح کر دیا کہ ملت اسلامیہ کی بنیاد کلمہ توحید ہے اور تمام روئے زمین اُس کی جولا نگاہ ہے:

جوہرِ ما بامقامے بستہ نیست　　　　بادۂ تندش بجامے بستہ نیست[۲۵]

ایسی ملت جو روحانی قدروں پر قائم ہوتی ہے وقت کے پنجہ آہنی سے بھی محفوظ رہتی ہے خود خدائے قدیر ایسی ملت کی حفاظت کرتا ہے اور اسے اپنے لطف وکرم سے طاقت وتوانائی پہنچاتا رہتا ہے:

از اجل ایں قوم بے پرواستے　　　　استوار از نَحنُ نزلنا ستے

تا خدا اَن یُّطفئُوا فرمودہ است　　از فسردن ایں چراغ آسودہ است [۲۶]

نظامِ حیات

ملت کے استحکام اور مفادات کی ہم آہنگی کے لیے ایک معین آئین اور واضح نظامِ حیات کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ پنکھڑیوں میں ایک آئین کے تحت نظم قائم ہوتا ہے تو وہ پھول بن جاتی ہیں، پھول ایک ترتیب کے تحت گل دستہ بن جاتے ہیں اور آواز میں ضبط سے نغمہ پیدا ہوتا ہے:

برگ گُل شد چوں ز آئیں بستہ شد　　گُل زآئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبط صدا پیدا ستے　　ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے [۲۷]

اسی طرح اقبال کے نزدیک ملت کی ترقی کے لیے آئین سے وابستگی لازمی ہے وہ کہتے ہیں کہ؛

حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہی ہے کہ افراد کسی آئین مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلب مشترک ہو جائیں۔ [۲۸]

آئین ہی کے سہارے ملت مشکلات کا سامنا کرتی ہے اور انقلابات کی آندھیوں میں اسی کی بدولت اپنے چراغ حیات کو روشن رکھتی ہے۔ جو ملت اپنے آئین اور نظام حیات کی پابند ہوتی ہے اس کی قدروں کا ایقان بھی اس آئین اور نظام حیات کے ساتھ ساتھ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آئین کی عدم موجودگی میں امدادِ زمانہ سے قدریں بدل جاتی ہیں اور ایک نسل کے واقعات اور حقائق دوسری نسل کی نگاہیں محض توہمات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اپنی تہذیب و روایات پر آنے والی نسلوں کا اعتماد زائل ہو جاتا ہے اور وہ کسی دوسری حوصلہ مند قوم کے طرزِ فکر کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر اس کی غلام بن جاتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک کسی ملت کے لیے بہترین نظامِ حیات قرآن مجید ہے۔ لیکن انھیں شکایت ہے کہ مسلمان دوسروں کی افکار کے رہینِ منت ہو رہے ہیں جبکہ ملت اسلامیہ کو غیروں سے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ پیغمبرؐ عربی سے پیمانِ وفا اور محبت باندھ لینا کافی ہے:

اے فلک مشتِ غبار کوئے تو　　اے تماشہ گاہ عالم روئے تو

ہمچو موج آتش تہہ پا میروی　　تو کجا بہر تماشہ میروی

طرح عشق اندازہ اندر جان خویش

تازہ کُن با مصطفےٰؐ پیمانِ خویش [۲۹]

مرکز ملت

جب تک دل تمام چیزوں کو تازہ خون پہنچاتا رہتا ہے اس وقت تک تمام اعضاء میں زندگی رہتی ہے۔

اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہر ملت کے لیے ایسے مرکز کی ضروت ہوتی ہے جہاں سے اُس کی تمام تمدنی جدو جہد کے لیے توانائی اور رہنمائی فراہم ہوتی ہو اور جس سے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی بھی ممکن ہو، مملکت اور وفاقی اکائیوں کے لیے دارالخلافہ کی اہمیت اور ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک وسعت پذیر ملت کے لیے مرکز کی ضرورت بھی شدید ہوجاتی ہے۔ دائرہ خواہ کتنا ہی پھیلتا جائے، مرکزی نقطہ اُس میں ترتیب اور ضبط قائم رکھتا ہے۔ یہی صورت ایک مرکز کی ہے۔ جہاں سے ملت کو نظم اور زندگی حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کیلیے یہی مرکز بیت الحرام ہے:

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است　　　خط اُودر نقطۂ او مضمر است

قوم را ربط و نظام از مرکزے　　　روز گارش را دوام از مرکزے

راز دارو رازِ ما بیت الحرم

سوزِ ماہم سازِ ما بیت الحرم[۳۰]

مرکز سے کسی قوم کی روایات قائم رہتی ہیں جو اُس کی بقا کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کی اُمت نے جب اپنے مرکز کو چھوڑ دیا تو وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہوئی:

عبرے اے مسلم روشن ضمیر　　　از مآل اُمتِ موسیٰ بگیر

داد چوں آں قوم مرکز راز دست　　　رشتۂ جمیعت ملت شکست[۳۱]

نصب العین

صحتمند نصب العین حیاتِ اجتماعی کے انتشار کو رفع کر کے ملت کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھنے کا موقع نصیب ہوتا ہے:

مدعا گردو اگر مہمیز ما　　　ہمچو صرصر می رود شبدیز ما

مدعا رازِ بقائے زندگی　　　جمع سیماب توائے زندگی

چوں حیات از مقصدے محرم شود

ضابطہ اسباب ایں عالم شود[۳۲]

مستحکم نصب العین ہماری رگوں میں دوران خون کو تیز تر کردیتا ہے، ہمارے عزم کو پختگی اور حوصلوں کو بندگی عطا کرتا ہے، اور ملت کو جوشِ عمل اور وحدت فکر بخش دیتا ہے:

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست　　　تیز از سعیِ حصول مدعاست

مدعا مضرابِ ساز ہمت است　　مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم راجنباند داد
یک نظر صد چشم را گرداند داد[۳۳]

نصب العین کی بلندی کے تناسب سے ملت کو عظمت اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے مختلف مفکرین کے سامنے مختلف نصب العین رہے ہیں۔ افلاطون ترکِ دنیا و ترکِ جہد کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ عیسائیت رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے۔ بدھ مت جسمانی خواہشات کے کچل دیئے جانے میں انسان کی نجات سمجھتا ہے۔ جبکہ مسلمان کے وجود کا راز تکبیر میں پنہاں ہے۔ اس لیے جب تک کہ تمام عالم میں بانگِ حق بلند نہ ہو مسلمان کو لمحہ کے لیے بھی چین نہیں آنا چاہیے۔ قرآن نے مسلمانوں کو اُمت عادل کا خطاب دیا جائے۔ جس کی وجہ سے اُن کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اُن کا فرض ہے کہ اہل جہاں کو دعوت فکر دیں۔ پیغمبرؐ عربی کی تعلیم اُن تک پہنچائیں اور اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں تاکہ ان پر راز کائنات کا افشا اور اسرار حیات کا انکشاف ہو سکے:

زآنکہ در تکبیر راز بود تست　　حفظ و نشرِ لاالٰہ مقصود تست

تانہ خیزد بانگِ حق از عالمے　　گر مسلمانی نیا سائی دمے

می نہ دانی آیۂ اُم الکتاب　　اُمت عادل ترا آمد خطاب

نکتہ سنجاں راصلائے عام دہ　　از علومِ اُمیئے پیغام دہ

تابدست آورد نبض کائنات
وا نمود اسرارِ تقویمِ حیات[۳۴]

مسلمانوں کے سامنے یہ اعلیٰ ترین آئیڈیل اس لیے بھی رکھا گیا ہے کہ فکرِ انسانی ہمیشہ وسوسوں کی پرورش اور نت نئے بتوں کی تخلیق کرتی ہے۔ جس کے باعث انسانیت کو پیہم صدمے پہنچتے رہتے ہیں۔ اس کا انسداد تیغ لاالٰہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور تمام خرابیوں کا ازالہ عقیدۂ توحید ہی کی شمشیر سے ممکن ہے:

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے　　ہرزماں در جستجوئے پیکرے

باز طرحِ آزاری انداخت است　　تازہ تر پروردگارے ساخت است

برسرِ ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الّا ہو بزن[۳۵]

تسخیر فطرت

شخصیت کے ارتقاء کے لیے فطرت کی قوتوں پر تصرف حاصل کرنا ضروری ہے۔اس غرض کی تکمیل سائنس کے ذریعے ہوسکتی ہے جو انسان کو بصیرت اور عقل کو پختگی فراہم کرتی ہے۔تسخیرِ فطرت جہاں فرد کے لیے ضروری ہے وہاں قوم کے لیے موت و حیات کا مسئلہ بن جاتی ہے۔یہی وجہ کہ قرآن نے رموزِ فطرت پر غور وفکر کی انسان کو بار بار دعوت دی ہے۔فرمایا ہے کہ وعلم آدم الاسماء کلھااور سکھا دے آدم کو نام (خواص) سب چیزوں کے۔یعنی

علم اسماء اعتبار آدم است
حکمتِ اشیاء حصار آدم است[۳۶]

گویا حقیقی زندگی تسخیرِ فطرت کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔انسان اپنے علم کے ذریعے کائنات کی چھپی ہوئی دولت کو برآمد کرسکتا ہے۔وہ حرارت، نور اور قوت کے سرچشموں پر تصرف حاصل کر کے مادہ کے تمام ممکنات پر قابو پاسکتا ہے۔اور اس طرح وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں تمام آفاق اُس کے زیرِ فرماں آجاتا ہے:

تاز تسخیرِ قوائے ایں نظام　　　ذوفنو نیہائے تو گرد و تمام
نائبِ حق درجہاں آدم شود　　　برعناصر حکمِ او محکم شود[۳۷]

قرآنی تعلیم کے زیرِاثر اسلامی حکماء نے مظاہرِ فطرت کے متعلق غور وفکر پر زور دیا اور استقرائی طریقِ تحقیق کو ترقی دے کر حقیقت اشیاء کی دریافت شروع کی۔اس طرح انہوں نے افلاطونی نظامِ تصورات کو چھوڑ کر جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔یونانی فلسفہ نے دنیا کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔لیکن ان حکماء نے اس فلسفہ کے زہریلے اثرات کو حیات اجتماعی سے خارج کر کے اسلامی تعلیم کے مطابق عناصر فطرت کی تسخیر کا ذوق پیدا کیا انہی کی بصیرت سے یورپ نے فیض حاصل کیا اور قرطبہ و اندلس کی جامعات سے مستفید ہوئے ان کی خوابیدہ صلاحتیں بیدار ہوئیں۔ان کے ذہن میں انقلاب برپا ہوگیا۔اور اس طرح جدید یورپی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھدی گئی۔مؤرخین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔برفالٹ کہتا ہے''عصرِ جدید کے لیے سائنس عربوں کا بیش بہا تحفہ ہے۔''

اسی ذوق کی بدولت مسلمانوں میں بڑے بڑے حکیم اور سائنسدان پیدا ہوتے جارہے تھے کہ تصوف کا ایک غلط تصور عربوں کے دماغ پر مسلط ہونے لگا اور وہ اس کی رو میں ایسے بہے کہ سائنس کی دنیا میں ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔

اقبال کہتے ہیں کہ کائنات کی قوتوں پر اثبات خودی سے تصرف حاصل ہوتا ہے اور اسی کی بدولت ایک ذرہ سے عالم نو کی تعمیر ممکن ہوجاتی ہے۔تمام مظاہر فطرت اہل نظر کے سامنے اپنے دامن کو پھیلا دیتے ہیں

اوران کے تجسس کے لیے تختۂ مشق بن جاتے ہیں:

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرہ تعمیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحرو بر تختۂ تعلیم ارباب نظر [۳۸]

کائنات کا ہر مظہر انسان کی فکر کو مہمیز لگاتا ہے اور تحقیق و تجسس کی اُسے دعوت دیتا رہتا ہے۔ لیکن انسان عام طور پر اپنی قوت سے لاعلم اور اپنی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی حقیقت کو محسوس کرے تو وہ پہاڑوں کو تحلیل کرسکتا ہے۔ دریاؤں سے گوہر کی جوئے آب نکال سکتا ہے۔ فضائے بسیط میں سینکڑوں دنیاؤں کی دریافت اور ذروں کے اندر بے شمار آفتابوں کا انکشاف کرسکتا ہے:

دست رنگیں کن زخون کوہسار جوئے آبِ گوہر از دریا برآر
صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند مہرہا درذرہ ہا پوشیدہ اند [۳۹]

ضرورت تجسس، تدبر اور بلند حوصلگی کی ہے۔ آفاق کو مسخر کرنے کے لیے عزم کی ضرورت ہے۔ نگاہِ تیز اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکتی ہے اور حرارت و بجلی پر تصرف حاصل کرکے انھیں اپنی کنیز اور خادمہ بناسکتی ہے:

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا در اشیا نگر نشہ زیر پردہ صہبا نگر

آنکہ براشیا کمند انداخت است
مرکب از برق و حرارت ساخت است [۴۰]

ضبط روایات

کوئی فرد اثبات خودی کے بغیر معرکہ حیات میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کوئی قوم اجتماعی خودی کے احساس کی تخلیق کے بغیر معراج کمالِ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس اجتماعی خودی کا ارتقاء ضبط روایات کے بغیر ناممکن ہے۔ خوشحالی اور کامرانی کے دور میں ہر قوم اعلیٰ اور صحتمند روایات کو جنم دیتی ہے۔ جن کا وجود مصیبت اور تباہی کے ایام میں اس کے لیے زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ روایات کی اہمیت کا اندازہ یہودیوں کی تاریخ سے ہوسکتا ہے۔ اس چھوٹی سی قوم کو ہر جگہ پریشان کیا گیا اور ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ اُس زندہ رہنے کے امکانات بھی نظر سے اوجھل ہونے لگے۔ لیکن ان تمام آزمائشوں میں اس لیے کامیاب رہی کہ اس نے اپنی قدیم روایات کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹے نہیں دیا:

چیست تاریخ اے زخود بیگانہ داستانے قصۂ افسانۂ

این ترا از خویشتن آگہ کند　　آشنائے کار و مرد رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است این　　جسم ملت راچو اعصاب است این [۴۱]

حقیقت کے اندر ماضی اور مستقبل ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ تاریخ ان کے وجود پر روشنی ڈالتی ہے۔ اور اس طرح حقیقت شناس قوموں کی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ وہ گذشتہ اقدار حیات کی تجدید کرتی ہے۔ اور واقعات کے چہرے سے ماضی کے نقاب کو اُٹھا کر ایک روشن شکل میں انھیں ہمارے سامنے لے آتی ہے:

شمع او بختِ امم را کوکب است　　روشن از وے امشب وہم دیشب است
چشم پرُکارے کہ بیندرفتہ را　　پیش تو باز آفریند رفتہ را [۴۲]

جس طرح فرد روح اور جسم کے ربط سے زندہ رہتا ہے اور قوم اپنی قدیم عظمت کے تحفظ کی بدالت قائم رہتی ہے:

زندۂ فرد از ارتباط جان و تن　　زندہ قوم از حفظ ناموس کہن [۴۳]

اسی طرح اپنی تاریخ کے تحفظ سے ہم دنیا میں سرخرو رہتے ہیں اور روایات کی یاد ہماری خودی کو زندہ اور برقرار رکھتی ہے۔ لیکن جو قوم اپنی روایات کو فراموش کر دیتی ہے وہ اپنے اجتماعی وجود کی تباہی و بربادی کے اسباب خود فراہم کر لیتی ہے:

قوم روشن از سوادِ سرگزشت　　خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
سرگزشت او گر از یادش رود　　باز اندر نیستی گم می شود [۴۴]

امومت

مسئلہ اموت دنیا کے ہر ادب میں اہمیت حاصل کر رہے۔ اقبال کے نزدیک کسی قوم کی اصل دولت ہیرے جواہرات، سونا اور چاندی نہیں ہوتی بلکہ صحتمند، محنتی اور ذہین افراد ہی اُس کا سرمایۂ حیات ہوتے ہیں:

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر　　نیست از نقد و قماش وسیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست　　تر دماغ وسخت کوش و چاق و چست [۴۵]

اس سے ظاہر ہے کہ امومت کی عزت اور حفاظت ہر ذی شعور ملت پر لازم ہے۔ مغربی مما لک جو کل تک ضبطِ تولید کے قائل تھے آج اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں اور ان عورتوں کو تعظیم و تکریم، بخشش وانعام کی مستحق قرار دے رہے ہیں جن کے بچے نہ صرف قوی اور صحتمند ہوں بلکہ تعداد میں بھی زیادہ ہوں۔ اقبال کے خیال میں بھی امومت نوع انسانی کے لیے باعثِ رحمت ہے کیونکہ اُس کی نبوت سے نسبت ہے۔ اچھی

امومت سے قوم کی عمارت پائیدار اور مستقبل روشن ہوتا ہے۔ اُسی سے رفتارِ حیات میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے دھارے میں وہی متوّج (توجہ) کا سبب بنتی ہے اور اُسی سے اسرارِ حیات کا انکشاف ہوتا ہے:

نیک اگر بینی امومت رحمت است　　زانکہ او را بانبوت نسبت است

از امومت پختہ تر تعمیر ما　　درخط سیمائے او تقدیر ما

از امومت گرم رفتارِ حیات　　از امومت کشف اسرارِ حیات

از امومت پیچ و تاب جوئے ما

موج و گرداب و حباب جوئے ما [۴۶]

اس طرح امومت کی اہمیت کا اندازہ کر کے اقبال اس کے استحکام کی ضرورت کو واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجود افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض ان پر قربان کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ رفتہ رفتہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ملتوں کے لیے سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی وجود کا تمدنی، اقتصادی یا سیاسی سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ فنا اور معدوم ہو جائے کے خیال سے ملتیں بھی اُسی طرح خوفزدہ ہو جاتی ہیں جس طرح کہ افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی صلاحیتوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی مقصد سے کیا جانا چاہیے۔ [۴۷]

اقبال کا فلسفۂ بےخودی ایسی صالح جماعتی زندگی کا تصور پیش کرتا ہے جس میں فرد رضا کارانہ طور پر جماعتی مفادات کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیتا ہے۔ ایسے معاشرہ کا ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ جماعت کی مادی اور اخلاقی تکمیل کے بغیر اس کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا کوئی موقع مل سکتا ہے۔۔۔ اس طرح انفرادی حریت اور جماعتی آئین کا ظاہری تضاد رفع ہوتا ہے۔ افراد کے لیے مشترک اساس قائم ہوتی ہے۔ اُن میں روحانی تعلق اور جذباتی ربط پیدا ہوتا ہے۔ یہی جماعتی انا ماضی کی محافظ، مستقبل کی آئینہ دار اور ملت کی بقا کی بہترین ضمانت ہو جاتی ہے:

مایہ دار سیرت دیرینہ او　　رفتہ و آئندہ را آئینہ او

وصل استقبال و ماضی ذات او　　چوں ابدلا انتہا اوقاتِ او [۴۸]

تیسری دنیا کے موجودہ معاشرتی حالات نے پاکستان کے لیے ایک لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا ہے کیونکہ پاکستان بڑے مہیب معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل سے دوچار ہے۔

جہاں بیک وقت تین سماجی نظام یعنی قبائلی نظام، دیو قامت جاگیرداری نظام اور سرمایہ داری نظام

موجود ہیں جن کا مسلح تحفظ جدید نوآبادیاتی نظام کر رہا ہے۔ پاکستان کی مسلم مذہبی پیشوائیت، دانشور، ماہرین تعلیم اور بیوروکریسی سب نہ صرف معاشی استحصال سے اغماض کرتے ہیں، بل کہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ کئی جارحیت پسند تنظیمیں اُبھر آئی ہیں۔ امیر مال مست ہیں اور غریب حال مست ہیں۔ کسان گمبھیر معاشی اور معاشرتی مسائل میں گھرے ہیں۔ مزدور طبقہ کو جدید نوآبادیاتی نظام میں سمجھوتہ باز بنا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کی اکثریت سرُمہ درگلو ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک ملک محض سیاست گردی کا شکار ہے اور اس کے معاشی اور معاشرتی مسائل لاینحل معلوم ہوتے ہیں۔

پاکستان علامہ اقبال کی فکر کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک پاکستان میں تعمیرِ خودی کی معاشرتی بنیادوں کا سوال ہے موجودہ زہرناک معاشرتی ماحول میں ان کے فلسفۂ خودی اور ان کی تعلیمات کو کسی طرح بھی عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ اقبال نے تعمیرِ خودی کا پیغام دیا۔ لیکن ملک میں نفیٔ خودی کے معروضی حالات پیدا کر دیے۔ اقبال نے لا الہ الاّ اللّٰہ پر عمل پیرا ہوئے کی تلقین کی لیکن ملک کی مذہبی پیشوائیت اور دوسری قیادت نے جدید نوآبادیاتی نظام کے آستانے پر جبیں سائی کی۔ اقبال نے فقرِ غیور کا درس دیا۔ لیکن حکمران طبقوں نے اپنی معاشی استحصال کی پالیسی سے لوگوں میں جاہ و مال کی ہوس اور مہلک معاشرتی قباحتوں کو پھیلا دیا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرتی حالات میں اقبال کی نصب العینی تعلیمات لوگوں کی زندگی میں عملی صورت اختیار نہیں کرسکتیں۔ علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لابدی ہے کہ سب سے پہلے ملک کو جدید نوآبادیاتی نظام کے چنگل سے نکالا جائے۔

یہ ایک المیہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرتی ماحول میں علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایک طرف استقرائی اور جدلیاتی طریقِ فکر نے معاشرے کو بہتر خطوط پر بدلنے کا راز عام کر دیا ہے اور روحِ عصر نے پرانے کو فنا کے راستے پر اور نئے کو بالیدگی اور ارتقاء کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ زمانے کی نوآفرینی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس فضا اور اس ماحول سے اقبال کے فلسفہ خودی کے عملی اطلاق اور سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی ظہور کے امکانات پیدا ہوں گے۔

❁.....❁.....❁

حوالہ جات وحواشی

۱۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: سید نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۶۱ء۔
۲۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (اُردو)، ص ۲۶۵۔
۳۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۵۔
۴۔ ایضاً، ص ۲۷۲۔
۵۔ سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، (مکتوب بنام نکلسن) اردو اکادمی، دلّی، ۱۹۹۰ء۔
۶۔ علامہ اقبال، دیباچہ پیام مشرق، ص ۵۔
۷۔ علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ خطبہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء، ص ۱۰۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۹۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۸۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۱۵۔ علامہ اقبال، سالِ نو کا پیغام، یکم جنوری ۱۹۳۸ء، آل انڈیا ریڈیو۔
۱۶۔ سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، (مکتوب بنام خواجہ عبدالرحیم)، اردو اکادمی، دلّی، ۱۹۹۰ء۔
۱۷۔ علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ خطبہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۔
۱۸۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۱۰۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۲۰۔ سید سلیمان ندوی، اقبال کا علم الکلام مشمولہ اقبالیات کے سو سال۔ (مرتّبین) سہیل عمر، وحید عشرت، رفیع الدین ہاشمی؛ اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۲۱۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۱۴۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۲۴۔ ایضاً،ص۲۰۔
۲۵۔ ایضاً،ص۲۳۔
۲۶۔ ایضاً،ص۲۵۔
۲۷۔ ایضاً،ص۲۷۔
۲۸۔ علامہ اقبال،دیباچہ رموز بیخودی،ص۲۔
۲۹۔ علامہ اقبال،رموز بیخودی،ص۳۵۔
۳۰۔ ایضاً،ص۴۰۔
۳۱۔ ایضاً،ص۴۲۔
۳۲۔ ایضاً،ص۴۶۔
۳۳۔ ایضاً،ص۵۸۔
۳۴۔ ایضاً،ص۶۱۔
۳۵۔ علامہ اقبال،پیامِ مشرق ،ص۸۰۔
۳۶۔ علامہ اقبال،رموز بیخودی ، ص۶۲۔
۳۷۔ ایضاً،ص۶۳۔
۳۸۔ ایضاً،ص۶۶۔
۳۹۔ ایضاً،ص۶۷۔
۴۰۔ ایضاً،ص۶۹۔
۴۱۔ ایضاً،ص۷۲۔
۴۲۔ ایضاً،ص۷۳۔
۴۳۔ ایضاً،ص۷۳۔
۴۴۔ ایضاً،ص۷۴۔
۴۵۔ ایضاً،ص۷۴۔
۴۶۔ ایضاً،ص۷۴۔
۴۷۔ علامہ اقبال،قومی زندگی،مشمولہ مخزن،۱۹۰۵۔
۴۸۔ علامہ اقبال،رموز بیخودی ،ص۶۵۔

❁...❁...❁

رموز بیخودی کی تصنیف

مکاتیب اقبال کی روشنی میں ایک مطالعہ

حسنین عباس

رموز بیخودی کی تصنیف صرف شعر برائے شعر کا نتیجہ نہیں بلکہ علامہ اقبال کے فکری عمل کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔ اسرار خودی کی اشاعت کے بعد اس کے بارے میں بہت سی آراء اور مضامین شائع ہوئے جس پر علامہ اقبال نے ناگزیر سمجھا کہ وہ اسرار خودی کے مضامین کی تکمیل کے طور پر رموز بیخودی کو تصنیف کریں۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی قوم کو موضوع کلام بناتی ہے۔ مختلف مراحل پر علامہ نے رموز بیخودی کے لیے جو نام سوچے وہ بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں۔ مورخہ ۶ فروری ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی کے نام خط میں رموز بیخودی کے لیے اسرار حیات، پیام سروش، پیام نو اور آئین نو جیسے ناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ اس خط میں لکھتے ہیں:

> ڈیئر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے جو ہے۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام ''اسرارِ حیات''، ''پیامِ سروش''، ''پیامِ نو''، ''آئینِ نو'' تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلق کیجیے تاکہ مَیں انتخاب کر سکوں۔[۱]

رموز بیخودی کے مضامین اور انداز بیان بتاتا ہے کہ پوری کتاب میں علامہ نسبت رسالتؐ کے وقار میں ہیں اور جذبہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار۔ یہ جذبہ اور نسبت انہیں اپنے والد شیخ نور محمد سے عطا ہوئی ہے۔ رموز بیخودی میں ایک ایسا قطعہ علامہ نے نظم کیا ہے، جو ان دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے والد کا یہ معمول تھا کہ جب بھی انہیں کسی بات سے ٹوکتے یا ان کو کچھ کرنے سے منع کرتے تو ہمیشہ قرآن مجید یا اسوۂ رسول کی سند سے پند و نصیحت فرماتے۔ اقبال ان کے منہ سے جب قرآن مجید کی کوئی آیت یا حدیث آنحضور سنتے تو چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر خاموش ہو جاتے۔ اقبال خود بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح اٹھ کر تلاوت قرآن کیا کرتے، مگر ان کے والد اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور انہیں دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح

سویرے ان کے قریب سے گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تمھیں ایک بات بتاؤں گا۔ بالآخر انھوں نے کچھ مدت بعد اقبال کے اصرار پر وہ بات بتا دی۔ ایک دن صبح جب اقبال حسب دستور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے تو وہ ان کے پاس آئے اور شفقت سے فرمایا: بیٹا! مجھے کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے، یعنی اللہ خود تم سے ہمکلام ہے۔[۲]

علامہ اقبال کی تربیت کے حوالے سے ڈاکٹر جاوید اقبال ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

ایک دفعہ کوئی سائل بھیک مانگتا ہوا ان کے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور باوجود یکہ اسے کئی بار جانے کے لیے کہا گیا، وہ اڑیل فقیر ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اقبال ابھی عنفوان شباب میں تھے۔ اس کے بار بار صدا لگانے پر انھیں طیش آ گیا اور اسے دو تین تھپڑ دے مارے۔ جس کی وجہ سے جو کچھ اس کی جھولی میں تھا، زمین پر گر کر منتشر ہو گیا۔ والد ان کی اس حرکت پر بے حد آزردہ ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمایا: قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد غازیانِ اسلام، حکماء، شہدا، زہاد، صوفیہ، علماء اور عاصیانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد آنحضور کی نگاہِ مبارک کو اپنی طرف مرتکز کر لے گی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے سپرد ایک مسلم نوجوان کیا گیا تھا تاکہ تو اس کی تربیت ہمارے وضع کردہ اصولوں کے مطابق کرے، لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہو سکا کہ اس خاک کے تودے کو انسان بنا دیتا، تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی دیکھ اور دیکھ، میں خوف اور امید سے کس طرح کانپ رہا ہوں، باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور خدا را میرے مولاؐ کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔ تو تو چمن محمدیؐ کی ایک کلی ہے، اس لیے اسی چمن کی نسیم سے پھول بن کر کھل، اور اسی چمن کی بہار سے رنگ و بو پکڑ، تاکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کی خوشبو تجھ سے آ سکے۔[۳]

علامہ پر اپنے والد کی روحانی شخصیت کا کتنا گہرا اثر تھا اس کا اندازہ حیات اقبال کے ایک موقع سے ہوتا ہے۔ ذکرِ اقبال میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں، انھیں اقبال نے خود بتایا:

جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔ میں نے کیا دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ میں فوراً اپنے بستر سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو آدھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ والدہ اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تاکہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انھیں اپنا ایک رؤیا سنا رہے تھے، جو رات انھوں

نے بہ حالتِ بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلہ پر مقیم ہوا ہے۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے۔ لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگا منگایا۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیے۔ چند گھنٹوں میں تانگا اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں کارواں کا ڈیرا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت منداور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے، جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے تانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے، لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے، اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی۔ وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہوگی۔ اس وقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی، لیکن چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔[۴]

عطیہ فیضی نے اپنی انگریزی تصنیف بعنوان اقبال میں اس واقعے کو بعینہٖ اسی انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ اقبال کے والد نے کسی ولی کی رہنمائی میں کئی ماہ تنہائی میں گزارے تھے اور انہیں جو کچھ حاصل ہوا، بیٹے کو دیا۔[۵]

رموز بیخودی کا اختتام بھی اقبال کی شخصیت کے اس پہلو اور رموز بیخودی کی مجموعی فضا کی تائید کرتا ہے۔ رموز بیخودی کے آخر میں ''حضور رحمۃ للعلمین ﷺ میں عرض حال کرتے ہوئے انہوں نے تحریر کیے:

مدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ عافیت داماں زدم

برقہا رقصید گردِ حاصلم
رہزناں بروند کالائے دلم
ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت
ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت[۶]

ایک مدت تک میں نے حسینوں سے راہ و رسم رکھی اور گھنگریالے بالوں والے محبوبوں سے عشق کرتا رہا۔ ماہ رخوں کے ساتھ میں نے شراب کے جام لنڈھائے اور اطمینان وسکون کا چراغ بجھاتا رہا۔ میرے خرمن کے گرد بجلیاں رقص کرتی رہیں اور ان رہزنوں نے میرے دل کی دولت لوٹ لی۔ مگر اس تمنا کی شراب میری جان کے جام سے نہ نکل سکی۔ یہ زرخالص میرے دامن میں محفوظ رہا۔

رموز بیخودی اقبال کے ملی افکار کے تسلسل کی وہ کڑی ہے جو ان کی فکری کائنات میں فرد اور قوم کو جمع کرتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول:

وہ اپنی ادبیات میں روح پیدا کرنے کی غرض سے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہتے تھے اور بالآخر ۱۹۱۰ء میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں اور انہی خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے مثنوی اسرار خودی لکھنا شروع کی۔ اقبال کی تحریروں سے یہ بھی واضح ہے کہ اپنے والد کی فرمائش پر بوعلی قلندر کی مثنوی کی طرز پر ایک مثنوی لکھنا چاہتے تھے۔ بوعلی قلندر سے تین مثنویاں منسوب ہیں۔ پہلی مخزن معنوی ہے، دوسری کلام قلندری کہلاتی ہے اور تیسری کا کوئی نام نہیں، اور اسے صرف مثنوی بوعلی قلندر قرار دیا گیا ہے۔ غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اقبال اور ان کے والد کے پیش نظر یہی آخری مثنوی ہو، اور طرز سے مقصود صرف بحر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابتداء میں مختصر مثنوی لکھنے کا خیال ہو، لیکن جب موضوع پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا تو مزید مطالب سامنے آئے اور مثنوی کو پھیلانا پڑا، یہاں تک کہ وہ اس کے تین حصے لکھنا چاہتے تھے مگر صرف دو لکھ سکے۔ اس وقت رومی ان کے سامنے آئے اور ان کی مثنوی سے انتساب مناسب سمجھا گیا۔ نیز رومی مختلف مرحلوں میں ان کی فکری اور روحانی رہبری کرتے رہے۔ پس غلام رسول مہر کی رائے میں حقیقی اسلامیت کی بیداری کے لیے نظام فکر کی ترتیب نے ان کے ذہن میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ شروع میں اس کی حیثیت کچھ تھی۔ پھر نئے نئے پہلو سامنے آتے رہے، حتیٰ کہ دو مثنویوں کا خاکہ ان کے ذہن میں مکمل ہو گیا۔ ایک کا تعلق حیات فرد سے تھا اور اس کا نام اسرارِ خودی رکھا، دوسری کا تعلق حیات ملت سے تھا، لہٰذا اسے رموز بیخودی سے موسوم کیا گیا، لیکن تیسری کو، جس کا موضوع حیات مستقبلۂ اسلامیہ تھا، ضبطِ تحریر میں نہ آسکی۔[۷]

ڈاکٹر جاوید اقبال اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقبال کے تصور انفرادی اور اجتماعی خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہی ان کے فکر کا محور ہے، لیکن اس

مسئلے پر اقبال کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں، اسرار خودی اور رموز بیخودی میں ملتی ہے۔ اقبال کے ہاں طاقتور انسانی شخصیت کی بہت اہمیت ہے، بلکہ وہ انسان ہی کے متعلق سوچتے ہوئے خدا تک پہنچے تھے۔ فرماتے ہیں: ''کمزور اپنے آپ کو خدا میں گم کرتے ہیں۔ طاقتور اسے اپنے اندر ڈھونڈ نکالتے ہیں''۔[۸]

مکاتیب اقبال کا مطالعہ اسرار خودی کی اشاعت کے بعد رموز بیخودی کی تصنیف کے اس محرک کی وضاحت کرتا ہے کہ فرد کی تعمیر خودی کے بعد علامہ قوم کی اجتماعی خودی کی تعمیر کے لیے کتنے فکر مند تھے۔ سراج الدین پال کے نام خط میں مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، تو اُسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملی نے اُن کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے، جس سے انحطاط کا مسحور، اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے، یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے، مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ اس حصہ میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی۔[۹]

سراج الدین پال کے نام خط میں مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:

اس نقطۂ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اگر آپ حافظ پر لکھیں تو اس نقطۂ خیال کو ملحوظ رکھیں۔ جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب وغریب باتیں معلوم ہوگی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس واسطے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعے میں آپ کا دماغ ایک خاص رستے پر پڑ جائے۔ ان شاء اللہ اسرارِ خودی کے دوسرے حصے میں بتاؤں گا کہ شعر کا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟[۱۰]

۷ امئی ۱۹۱۹ء کو حافظ محمد اسلم جیراج پوری کے نام خط میں لکھتے ہیں:

آپ کا تبصرہ اسرارِ خودی پر الناظر میں دیکھا ہے جس کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں۔ ''دیدمت مردے دریں قحط الرجال''۔[۱۱]

۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو مسیگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ ان شاء اللہ معارف کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی، اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔ مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموزِ بیخودی (اسرارِ حیاتِ ملیۂ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے۔ شایع ہونے پر ارسالِ خدمت کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۱۲]

۲۸/اپریل ۱۹۱۸ء کوسید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ رموزِ بیخودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے۔ انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔ مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔ اسرارِ خودی کی دوسری ایڈیشن تیار کر رہا ہوں، عنقریب آپ کی خدمت میں مرسل ہوگی۔[۱۳]

علامہ ۹ جنوری ۱۹۱۷ء کو مولوی الف دین کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

مثنوی اسرارِ خودی کے دوسرے حصہ کا قریب پانچ سو شعر لکھا گیا ہے مگر ہاتف کبھی کبھی دو چار ہوتے ہیں، اور مجھے فرصت کم ہے۔ امید کہ رفتہ رفتہ ہو جائیں گے۔ ہجرت کے مفہوم کے متعلق جو چند اشعار لکھے ہیں، عرض کرتا ہوں تا کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ یہ کیا چیز ہوگی۔[۱۴]

یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو سرکشن پرشاد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

اسی تنہائی میں مثنوی اسرارِ خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا ''اقلیمِ خاموشاں''۔ یہ نظم اُردو میں ہوگی اور اس کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ مُردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں۔ ان کے عام حالات و جذبات و خیالات کیا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ دو باتیں میری تنہائی کی کائنات ہیں۔[۱۵]

۱۹ مئی ۱۹۱۷ء کو سرکشن پرشاد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

میں فارسی مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل میں مصروف ہوں، اس کا نام رموزِ بیخودی ہوگا۔[۱۶]

سرکشن پرشاد ہی کو مورخہ یکم فروری ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

انگلستان کے پروفیسر نکلسن جنہوں نے دیوان شمس تبریز کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، (کشف المحجوب حضرت علی ہجویری کا بھی انہی بزرگ نے انگریزی ترجمہ کیا ہے) مجھ سے اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں مگر کوئی نسخہ مثنوی اُن کے پاس نہیں، جو ہے انھوں نے کہیں سے عاریتاً لیا ہے۔ آج اُن کا خط آیا تھا جس میں وہ مثنوی کا نسخہ مانگتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی نسخہ نہیں سوائے ایک نسخے کے جس پر میں نے بہت سی ترمیم کر رکھی ہے جو دوسرے اڈیشن کے لیے ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سرکار کی خدمت میں چند نسخے ارسال کیے تھے۔ غالباً آپ نے احباب میں تقسیم کر دیے ہوں گے۔ اگر کوئی کاپی باقی رہ گئی ہو اور سرکار کو اس کو ضرورت نہ ہو تو مرحمت فرمایئے، میں نہایت شکر گذار ہوں گا اور پروفیسر صاحب کو لکھ دوں گا کہ نسخہ سرکار سے دستیاب ہوا ہے۔

اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی زیر طبع ہے، فروری یا مارچ میں شائع ہو جائے گا۔ تو آپ کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہوگا۔ تیسرے حصے کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی منطق الطیر ہوگی۔[۱۷]

مکاتیب اقبال سے رموز بیخودی کی تصنیف کی فنی و ادبی حیثیت کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ جب رموز بیخودی چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچی تو ان کی طرف سے اس پر آراء کا اظہار کیا گیا، تبصرے لکھے گئے اور کئی اعتراضات بھی کیے گئے۔ اب علامہ نے ان اعتراضات کے جوابات دیئے، مختلف حوالوں سے اہل علم سے مشورے لیے اور رموز کے کئی الفاظ، تراکیب اور صنائع کے بارے میں اہل فن اور اساتذہ کے نظائر پیش کیے۔ یہ سب تفصیلات مکاتیب میں موجود ہیں جو رموز بیخودی کے اس مرحلے کی دلچسپ روداد اور تحقیق کا ایک نادر موضوع ہے۔

مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

معارف میں ابھی آپ کا ریویو (مثنوی رموزِ بیخودی پر) نظر سے گذرا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

صحتِ الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے کہ دوسری ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے۔

غالباً آپ نے رموزِ بیخودی کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے۔ اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجیے، میں دوسری کاپی اس کے عوض میں آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔ [۱۸]

۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

رموزِ بیخودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا، اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہو گیا، امید کہ توجہ فرمائی جائے گی، تا کہ میں دوسری ایڈیشن میں آپ کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں۔ [۱۹]

سید سلیمان ندوی کے نام مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چونکہ شاعری اِس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا، اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں اور ظہوری کے ساقی نامہ کے چند اشعار بھی زیرِ نظر تھے، غالباً اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی۔ [۲۰]

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۲۱ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

ستمبر کا معارف ابھی نظر سے گذرا ہے۔ اس میں مسٹر ڈکنسن کے ریویو (اسرارِ خودی) کا ترجمہ آپ نے شایع کیا ہے۔ ترجمۂ مذکور کا ایک فقرہ یہ ہے "اقبال ان تمام فلسفوں کے دشمن ہیں جو شے واجب الوجود کو تسلیم کرتے ہیں۔"

اگر آپ کے پاس رسالہ نیشن (Nation) موجود ہو جس میں انگریزی ریویو شایع ہوا تھا، تو میں اُسے

دیکھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کر کے ایک آدھ روز کے لیے بھیج دیجیے۔ مجھے ایسا خیال ہے کہ غالباً مذکورہ بالا فقرہ اس ریویو میں نہیں ہے یا اس کی جگہ کچھ اور ہے۔ مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ کہیں ترجمے میں سہو تو نہیں ہو گیا۔[۲۱]

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں تحریر کرتے ہیں:

اسناد حسبِ وعدہ حاضر ہیں:

۱- از گلِ غربت زماں گم کردۂ (رموز)

آپ کا ارشاد اس مصرع پر یہ تھا کہ ''ازگل'' بمعنی بدولت اچھے معنوں میں آتا ہے، بُرے معنوں میں نہیں آتا۔ بہارِ عجم میں زیرِ لفظ ''گل'' یہ محاورہ بھی دیا ہے اور اشعار بھی دیے ہیں:

زیرِ دست چرخ بودن از گل بے فطرتی ست الخ

۲- محفلِ رنگیں بیک ساغر کند (رموز)

بہ ہفتاد و دو ملت گردشِ چشمِ تو می سازد
بیک پیمانہ رنگیں کردۂ یک شہرِ محفلہا
(ناصر علی)

۳- ''سرمۂ او دیدۂ مردم شکست'' (رموز)

چشم و گوش شکستن، یعنی نابینا وکرشدن (بہارِ عجم)
ترسم ز گریہ چشمِ گہربار بشکند الخ (صائب)

۴- عشق را داغے مثال لالہ بس
در گریبانش گل یک نالہ بس (رموز)
ترسم ز گریہ چشمِ گہربار بشکند الخ (صائب)

گل نالہ پر آپ کا ارشاد تھا

چنگے بتار نغمۂ قانونِ شیرزن
گلبرگ نالۂ بگریبانِ دل فشاں
(زلالی)

۵- ز آسمان آبگوں یم می چکد
من ز جو باریک تر می سازمش (رموز)

لفظ ''باریک'' پر آپ کا ارشاد تھا کہ صحیح نہیں، باریک بمعنی کم درعرض و عمق بھی آیا ہے:

نازک تراست از رگِ جاں گفتگوئے من
باریک شد محیط چو آمد بجوئے من
(صائب)

از تواضع می تواں مغلوب کردن خصم را
می شود باریک چو سیلاب از پل بگذرد
(زلالی)

۶- کور ذوقاں داستانہا ساختند الخ (رموز)

''کور ذوق'' کی نسبت آپ کا ارشاد تھا کہ بے مزہ ترکیب ہے

چہ غم زیں عروسِ سخن را بتر
کہ بر کور ذوقاں شود جلوہ گر
(ظہوری)

کور ذوقاں ز فیضِ تربیت
چوں مسیحا مزاجدانِ سخن
(ملاطغرا)

۷- نوا بالیدن، تانوائے یک اذاں بالیدہ است (رموز)

تاچند بالد نفس اندودنوایم (بیدل)

۸- بحر تلخ رو، بود بحرِ تلخ رویک سادہ دشت (رموز)

تلخ رو بحر کی صفات میں آتا ہے (بہارِعجم)

۹- نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت (رموز) منجملہ اور ارشادات کے ایک یہ ارشاد تھا کہ لفظ نعرہ شیر کے لیے ٹھیک نہیں، بہارِ عجم میں ایک شعر دیا ہے جس میں نعرۂ اسپ لکھا ہے۔

بابر ماند چو پے برنہاد و نعرہ کشاد (معز فطرت)

۱۰- سازِ برق آہنگ او نو ناختہ (رموز) آپ کا ارشاد تھا کہ سازِ برق صحیح نہیں، لیکن مصرع میں ساز کی صفت برق آہنگ ہے اور برق آہنگ ساز کی صفت آتی ہے۔ (بہارِ عجم زیرِ لفظ ساز)

۱۱- ہم چو صبح آفتاب اندر قفس (رموز) آپ کا ارشاد تھا کہ صبح کے لیے آفتاب کی کیا ضرورت ہے، یہ ترکیب مرزا بیدل کی ہے، میں نے اس کے لیے محل استعمال نیا پیدا کیا ہے یعنی کعبۃ اللہ کے گرداگرد جب ملت بیضا نماز پڑھتی ہے یا طواف کرتی ہے تو یہ نظارہ صبح آفتاب در قفس سے مشابہ ہے:

ملت بیضا بہ طوفش ہم نفس
ہم چو صبحِ آفتاب اندر قفس

۱۲- اے بصیری را ردا بخشندۂ (رموز)

بصیری کے متعلق بھی یہی واقعہ مشہور ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ حضورﷺ نے بصیری کو جو جذام میں مبتلا تھا، اپنی چادرِ مطہر خواب میں عطا فرمائی تھی جس کے اثر سے اُس نے جذام سے نجات پائی۔ بعض لوگوں میں قصیدۂ بصیری قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔

۱۳- من شبے صدیقؓ را دیدم بخواب
گل زِ خاک راہ او چیدم بخواب

دوسرے مصرع پر آپ کا ارشاد تھا کہ مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے اور گل زخاکِ راہ او چیدم کیا مطلب؟ یہ واقعہ خواب کا ہے، جو خواب میں دیکھا گیا بعینہٖ اسی طرح نظم کر دیا گیا۔

۱۴- بازبانت کلمۂ توحید خواند، لفظ کلمہ کے متعلق بھی لکھوں گا۔ افسوس ہے کہ ابطالِ ضرورت دستیاب نہیں ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس رسالہ میں اس لفظ پر بحث ہے، بہت سے الفاظ جن کو اساتذہ نے بہ تحریک و بہ سکون دونوں طرح استعمال کیا ہے، انھوں نے یکجا کر دیے ہیں۔ مثلاً رب ارنی، رمضان، حرکت، متواری وقران وغیرہ، اس کا بہ سکون استعمال ہونا یقینی ہے۔ اسناد ان شاء اللہ عرض کروں گا، جواہر التراکیب میں چار دفعہ بہ سکونِ لام آیا ہے۔

۱۵- فرد و قوم آئینۂ یک دیگراند
ہم خیال و ہم نشین و ہمسراند (رموز)

لفظ ہم خیال کی نسبت آپ کو شبہ تھا

یادِ ایامیکہ باہم آشنا بودیم ما
ہم خیال و ہم صفیر و ہم نوا بودیم ما

لیکن میں نے یہ لفظ شعر سے نکال دیا ہے۔

۱۶- بائے بسم اللہ (حضرت علیؓ کے لیے) قاآنی نے لکھا ہے، اور میم مروت مولانا جامی نے تحفۃ الاحرار میں لکھا ہے۔ میں نے ''میم مرگ'' لکھا تھا۔

۱۷- قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے، قاعدہ یہی ہے جو آپ تحریر فرماتے ہیں۔ مولانا رُوم ان باتوں کی پروانہیں کرتے، ظہوری کے دو شعر جو زیرِ نظر تھے، عرض کرتا ہوں:

گل شوقم از آب و گل بردمد
برقّاصی از سینۂ دل جہد
چو از چشمِ جادو بجادُو رود
باعجاز پہلو بہ پہلو زند

دوسرا شعر کسی قدر مشتبہ ہے، کوئی اور ایڈیشن ساقی نامہ کی دستیاب نہیں ہوئی ورنہ مقابلہ کرتا، بہرحال قاعدہ کی خلاف ورزی کیے بغیر اگر شعر لکھا جا سکتا ہو تو قاعدہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے، ان شاء اللہ ان قوافی پر نظر ثانی کروں گا۔

۱۸- ورثہ، دورہ، خیال وغیرہ کے متعلق آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے لیکن ان الفاظ کے متعلق پھر بھی کچھ عرض کروں گا۔

۱۹- شاہ رمز آگاہ شد محوِ نماز
خیمہ برزد از حقیقت در مجاز
نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت
دشت و در از ہیبتش لرزندہ گشت

ان اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے، اس سے مولوی اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے، لیکن فی الحال ان پیش کردہ اسناد سے مجھے تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار روز تک اپنی تحقیق کا نتیجہ عرض کروں گا۔ ان اسناد کو ملاحظہ فرمائیے اور بتائیے کہ کون سی صحیح اور کون سی غلط ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۲۲]

۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کو اکبر الہ آبادی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ (انگریزی) کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے ایک ریویو دونوں مثنویوں پر لکھا ہے۔ نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کی کوئی کاپی مل گئی تو ارسالِ خدمت کروں گا۔ آج زمانہ میں ایک ریویو نظر سے گذرا۔[۲۳]

۲۲ ستمبر ۱۹۲۹ء کو شاطر مدراسی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

میری فارسی مثنویوں کے متعلق جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، آپ کی بندہ نوازی ہے۔ افسوس کہ دیگر مصروفیتوں کی وجہ جو کچھ مَیں چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ بہرحال، جو کچھ ہو گیا غنیمت ہے۔[۲۴]

مکاتیب اقبال میں ایسے حوالے بھی ملتے ہیں جہاں علامہ نے اسرار و رموز کے بعض نکات کی توضیح کی، رموز کے مضامین کا تعارف کروایا اور اپنے اس منشا کو بیان کیا جو رموز کی تصنیف کا باعث

تھا۔

قاضی نذیر احمد کے نام خط میں مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھتے ہیں:

میری تحریروں میں خودی کا لفظ دو معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اخلاقی اور مابعد الطبعی ہر دو معنوں میں لفظ مذکور کی تشریح واضح طور پر کر دی گئی ہے جس میں فارسی جاننے والے کو کسی قسم کی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجیے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں مضمون ان کے مطالب کی تشریح میں لکھے گئے ہیں۔ باوجود ان کے اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ممکن نہیں کہ سچائی کی دو قسمیں قرار دی جائیں ایک عوام کے لیے، ایک خواص کے لیے اور جو صداقت خواص کے لیے ہو، اُسے عوام پر ظاہر نہ کیا جائے۔ لیکن میرے حالات کے لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میں نے مسئلہ خودی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کا جاننا اس زمانے کے ہندی مسلمانوں کے لیے میرے خیال میں ضروری ہے اور جس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ خودی کے متعلق تصوف کے جو دقیق مسائل ہیں، اُن سے میں نے اعراض کیا ہے۔[۲۵]

سر عبدالقادر رموزِ بیخودی کی وجہِ تصنیف اقبال ہی کی زبانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، میں عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بڑا معترف ہوں بلکہ ایک اعتبار سے ممنون بھی ہوں۔ وہ یوں کہ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیش نظر ملت کا وجود نہیں۔ حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے۔ بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموزِ بیخودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموزِ بیخودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموزِ بیخودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔[۲۶]

اسی طرح نیاز الدین خان کے نام ایک خط محررہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء میں رموزِ بیخودی کے موضوع پر علامہ اقبال نے تحریر کیا:

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیّت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیّت کے اصول حقّہ صرف اسلام نے ہی بتائے

ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہوسکتی۔[۲۷]

الغرض اقبالیاتی ادب کا مذکورہ بالا جائزہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہمارے علمی و ادبی سرمائے میں رموزِ بیخودی کی اہمیت اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتی جب تک ہم رموز کی وجہ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے اس وقت کے حالات، علامہ کے ذہنی و فکری میلانات، معاصر اہلِ علم کی آراء اور خود علامہ کے منشا تصنیف کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

❁...❁...❁

حواشی و حوالہ جات

۱- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ - مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۶۱۴-۶۱۵۔
۲- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، سنگ میل پبلی کیشنز و اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۸۷-۸۸۔
۳- ایضاً۔
۴- عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲-۱۴۔
۵- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۸۷۔
۶- علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (فارسی)، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶۹۔
۷- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص262۔
۸- ایضاً، ص ۱۶۷۔
۹- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ - مجموعہ مکاتیب اقبال، ص ۸۸-۸۹۔
۱۰- ایضاً، ص ۹۰۔
۱۱- ایضاً، ص ۹۹۔
۱۲- ایضاً، ص ۱۱۲-۱۱۳۔
۱۳- ایضاً، ص ۱۱۳۔
۱۴- ایضاً، ص ۱۹۸۔
۱۵- ایضاً، ص ۴۶۲۔
۱۶- ایضاً، ص ۴۷۲۔
۱۷- ایضاً، ص ۵۰۶-۵۰۷۔
۱۸- ایضاً، ص ۱۱۴۔
۱۹- ایضاً، ص ۱۱۶۔

۲۰- ایضاً،ص ۱۱۷۔
۲۱- ایضاً،ص ۱۳۷۔
۲۲- ایضاً،ص ۱۲۱-۱۲۵۔
۲۳- ایضاً،ص ۳۹۶۔
۲۴- ایضاً،ص ۵۷۵۔
۲۵- ایضاً،ص ۵۳۷-۵۳۸۔
۲۶- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۲۵۸۔
۲۷- ایضاً،ص ۲۵۸۔